

دل ایک گشت

خجین الہ

۱۰ دل بہت حساس ہے اے موج نسیم
تجھ سے ممکن ہو تو کچھ اور بھی آہستہ گزر



آج پھر گھٹا جھوم کے آئی ہے، بادل گر جائیں گے، بجلی چمکے گی اور چھا جوں مینہ
برے گا۔ یا پھر ہو سکتا ہے کہ دم جھم پھو دار برس کر ہی رہ جائے۔ اس شہر کراچی میں
پھوار ہی برس جائے تو بڑی بات ہے۔ لیکن چاہے چھا جوں مینہ برے یا صاف ننھی
ننھی ہوندیاں گر کر مطلع صاف ہو جائے بنفشہ باجی اپنے کمرے کے در پیچے کی چوکھٹ
پر دونوں کہنیاں ٹیکے گھنٹوں کھڑی رہیں گی۔ چپ چپ، ادا اس اور تنہا تنہا سی -
ماضی کے جھروکوں میں جھانک کر جانے کن بھولی بھری یادوں سے اپنے دل کا نگر آباد
کریں گی۔ کون جانے وہ کیا سوچتی ہیں، کسے یاد کرتی ہیں اور کیسے بھول جانے کی کوشش
کرتی ہیں۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ ایسے لمحوں میں ان کے دل کا سارا درد سمٹ کر
آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ سرسبز گلیاں ستارے چمکتے ہیں اور ٹوٹ کر بکھر جاتے ہیں لیکن

میرے دل کو برابر یہ بات کیوں سناتی ہے کہ وہ کیا سوچتی ہیں، اشکوں کے موتی کیوں
لٹاتی ہیں؟ کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ شاید وہ بیٹے دنوں کی گرم دوپہروں کو یاد
کرتی ہوں گی، یا پھر کہہ کر کے دھندلوں میں ڈوبی ہوئی رخصت ہوتی ہوئی ادا اس
شاموں کو یاد کرتی ہوں گی۔ ممکن ہے ان گرم دوپہروں اور ادا اس شاموں سے کسی
کا تصور وابستہ ہو، لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکتا، اتنی ذرا سی عمر میں نودہ ہمارے
یہاں رہنے کے لئے آگئی تھیں، اس کے بعد سارے برس اور ساری دوپہریں
اور شاہیں تو میرے سامنے ہی گزری ہیں۔ پھر — پھر؟ اور اس کے آگے
شجورانی کا ذہن اُکھ جاتا، دماغ ساتھ دینے سے انکار کر دیتا اور دل گھبرا جاتا۔
بنفشہ باجی کے متعلق اتنی ڈھیر ساری باتیں شجورانی نے براہِ مے کے ٹائلوں

دائے چکنے شفاف فرش پر بیٹھے بیٹھے سوچی تھیں۔ اس وقت ان کے ہاتھ میں
ایک انتہائی فضول سی کتاب تھی، جسے وہ اس سے پہلے بھی دو دفعہ چاٹ چکی تھیں،
لیکن بقول اماں بیگم کے ان کتابوں میں تو شجورانی کا کلیجہ گھسا ہوا تھا۔ اپنے کپڑوں
سے، اپنے بالوں سے، ارد گرد کے ہر فرد سے اور ہر چیز سے بے نیاز ہو کر کتابوں میں
سردیئے رہنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ نہ دادی اماں کی صلواتیں انہیں ان کے مشغلے
سے باز رکھ سکتی تھیں اور نہ اماں بیگم کی پھٹکار۔ پر جانے بنفشہ باجی میں کیا بات
تھی کہ شجورانی کی نگاہیں گھوم پھر کر انہی کا طواف کرتی تھیں۔ حد تو یہ تھی کہ اپنی
جان سے زیادہ عزیز کتابوں میں مگن رہتے ہوئے بھی بنفشہ باجی کا خیال ضرور آتا تھا۔
اور شام ڈھلتے ڈھلتے شجورانی کا خیال درست ہی ثابت ہوا۔ بادل گہرے ہی
ہوتے چلے گئے۔ گرجے تو گرجتے ہی چلے گئے۔ اور پھر تو جیسے آسمان میں سوراخ ہو گئے

ٹپ ٹپ موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ چھٹ باجی (چھوٹی باجی) اور آپا جان کو توبارش
میں بھیگنے کا اور پانی میں چھپ چھپ پاؤں مارنے کا خاص شوق تھا۔ مگر اب جائیں کیسے
پانی میں۔ اماں بیگم، دادی اماں اور بڑی اماں کا یہ جملہ کون برداشت کرتا۔

اے دیوانی ہوئی ہو کچھ، لوتھاکا لوتھا ہو گئیں مگر یہ اچھل کود اب تک باقی ہے
لفظ 'لوتھا' سے چھٹ باجی کو خاص چڑھتی۔
جیسے ہی بوندیں پڑیں، چھٹ باجی نے دیدے گھا کر ادھر ادھر دیکھا اور کرے
سے باہر نکلتے ہوئے بولیں۔

اے بے چچی جان کی ساڑھیاں اور پیٹی کوٹ تار پر سے کسی نے نہیں اتارے
سب بھیک جائیں گے۔
دوسری طرف سے آپا جان بولیں۔

لان چنیر بھیک کر بالکل خراب ہو جائیں گی، کسی کو توفیق ہی نہیں ہے
اٹھانے کی۔

اور دونوں جلدی جلدی چلیں گھسیٹی پانی میں بھیگنے پہنچ گئیں۔ مافوضیہ ان
کے سپنے بنا نہ تو کپڑے اتارے جائیں گے اور نہ لان چنیر بٹانی جائیں گی۔ حلالاکہ
دوسری طرف سے فتو اور شہزادان دوڑے چلے آ رہے تھے۔

ارے بٹیا، تم کا بے بھیکت ہو، ہم کا اتار لینے دیو کپڑا۔ شہزادان نے کہا۔
چھوڑ دیجیئے بی بی جی آپ، میں تو آگیا ہوں کرسیاں اٹھانے۔ فتو نے کہا۔
بس رہنے دو تم لوگ، پہلے سے خیال نہیں تھا تم لوگوں کو؟
چھٹ باجی نے اپنی ستواں ناک سیکڑی۔

اں بڑے کبیرے بنے میں دونوں۔ جاؤ اندر۔

آپا جان نے تیوریاں چڑھائیں۔ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائیں۔
اب شہزادین اور فتولاکھ ضد کر رہے ہیں مگر نہ چھٹ باجی سنتی ہیں اور نہ آپا جان
کے کان پر سونے دیتی ہے۔ باتا عہد چہن چھٹ شروع ہو گئی۔ اتنے میں دیکھتے ہی
دیکھتے بادش تیز ہو گئی اور دونوں کے وارے نیارے ہو گئے۔ اماں بیگم اپنے کمرے کی
کھڑکی میں کھڑی سارا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ وہیں سے حلق بھاڑ کر چلا ہیں۔

شمسہ۔ عمرانہ، چلا اپنے کمرے میں تم دونوں۔

مگر شمسہ اور عمرانہ ایک ہی ڈھیٹ تھیں۔ ایسی آسانی سے تھوڑی سن لیتی
تھیں کسی کی بات۔ اور پھر کراچی میں بادش ہی کو نسی ہر سال ہوتی تھی۔ جو یوں بیگنے
کو ملتا۔ اس موقع کو وہ آسانی سے تو گنوا نہ چاہتی تھیں۔ اماں بیگم کی آواز ایک کان سے ٹکر
دوسرے کان سے اڑا دی۔ اس نافرمانی پر اماں بیگم کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ
گئی۔ دوبارہ دھاڑیں۔

ثامت آئی ہے تم دونوں کی۔ اور کچھ نہیں تو اپنی عمروں اور قدوں کا ہی
کچھ خیال کرو۔

اس چیخ و پکار سے دادی اماں کے کان بھی خرگوش کے کانوں کی طرح
کھڑے ہو گئے۔ جلدی سے برن چھاپ کا تمباکو چھانک کر کتھا چونا چائا اور پاندان
بندر کے اپنے تخت طاؤس سے نیچے اتر آئیں۔ کھسکھسرتی اماں بیگم کے پاس
پہنچ گئیں۔

اے زلیخا! کس کو ڈانٹو ہو؟

شمسہ اور عمرانہ ہیں، بادش میں کھڑی بھیگ رہی ہیں۔

اماں بیگم نے کہا۔

دادی اماں کی عقاب کی سی نگاہوں نے فوراً ہی دونوں کو ناک لیا۔

بالکل ہی دونوں کی چھلنی بنی ہوئی ہیں۔

اماں بیگم بڑبڑائیں۔

ان دونوں لڑکیوں کی تو یہ پرانی عادت ہے۔

دادی اماں بولیں۔

اماں بیگم خاموش رہیں۔

بچپنا نہیں جاتا طبیعت کا۔ کہنے کو ایک اس سال بی۔ اے کر لے گی اور
دوسری الیت۔ اے۔

دادی اماں کے غصے میں پیار کا عنصر بھی تھا۔

چھٹ باجی اور آپا جان پانی میں چھپ چھپ پاؤں مارتی اور بڑبڑ کرتی
اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

ان کو اندر گئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ شنوٹیا جانے کے صر سے عہد ر ہجہ دھاکتی
ہوئی آئیں اور حلیں پانی میں چھپ چھپ کرنے۔ مگر ایک سے دوسرا قدم اٹھانے
کی نوبت ہی نہیں آئی۔ پاؤں جو پھسلا تو برآمدے کے پکنے فرش پر یوں چت پڑی
نظر آئیں جیسے آپریشن تھیر میں مریض لیٹا ہے۔ بن میاں نے اس سین کو دیکھ کر
تایاں بجان شروع کر دیں۔ شنوٹیا کے بھونپو کی آواز سن کر چچی جان تیر کی طرح
اپنے کمرے سے نکلیں اور تیز تیز قدموں سے شنوٹیا کے قریب پہنچ کر بجائے ان کا

دلار کرنے کے دو ہاتھ جڑ دیئے۔
 ابھی فزک بدلی تھی استیانس کر لی۔
 اور امی، برن بھی خراب کر لیا۔
 بن نے لقمہ دیا۔

چچی جان بن میاں کی باپڑ جیان جیسے لئیر شفو کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر لے
 گئیں اور بن میاں پانی میں ناڈ تیرانے کے ارادے سے جلدی سے ابامیاں کے کمرے
 کی طرف بھاگے کہ شاید کوئی پرانا اخبار یا رسالہ ہاتھ آجائے۔
 رصنائی نے کھانا میز پر لگا کر سب کو اطلاع کر دانے کے لئے فتو کو اطلاع دی
 تو اسی لمحے بجلی بڑے زور سے چلی۔ دادا جان اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سہم گئے۔ فتو ان
 کا کھانا لے کر اندر پہنچا تو وہ اپنا ڈر اور خوف بھول کر اس پر برس پڑے۔
 کیوں بے فتو، تو آگیا مجھے تنگ کرنے۔
 فتو نے جواب میں اپنے پیلے پیلے دانت نکوس دیئے۔
 لے جا یہ کھانا یہاں سے، مجھے بھوک نہیں۔
 جی۔۔۔ وہ بڑے صاحب۔

بڑے صاحب کا بچہ، اس سے کہیں بہتر کھانا تو گھر کے کتے بیٹوں کو کھلاتا
 ہے تو۔

مجبوری ہے صاحب۔

کیا مجبوری ہے؟

آپ کا مرض دُور ہو جائے گا تو آپ کو بھی خوب چٹپٹے کھانے کھلاؤں گا۔

تو پکا بے ایمان اور جھوٹا ہے، ایک سال سے یہی کہہ کر مجھے تسلیاں دے رہا ہے۔
 فتو اپنے خطابات کو سن کر ایک دم ہنس پڑا۔
 ہنستا ہے، بے وقوف۔
 دادا جان کا پارہ مانی ہو گیا۔

فتو جلدی سے منہ جھینچ کر اپنی ہنسی روکنے لگا۔
 اچھا تو یہ بتا کہ تو ہے کون، حکیم پاڈاکٹر؟
 جی۔

فتو نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔
 تجھے کیسے معلوم ہوا کہ مجھے بیماری ہے؟
 سب کہتے ہیں۔

سب تو کہتے ہیں، تو اپنے آپ کو ان بکواسیوں میں کیوں شامل کرتا ہے۔
 اب نہیں کروں گا صاحب۔

اچھا تو اسی بات پر چپکے سے باورچی خانے میں جا اور باقی لوگوں کے لئے جو کچھ پکا
 ہے اسی میں سے میرے لئے بھی لے آ۔

اگر بڑی بیگم صاحبہ کو معلوم ہو گیا تو....

ڈرتا کیوں ہے۔ بڑی بیگم تجھے جان سے تو نہیں مار ڈالیں گی۔ دادا جان
 نے کہا۔

اچھا آج یہی کھانا کھا لیجئے، کل سے....

فتو کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی دادا جان نے گھوڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

تم لوگ کیوں میرے ساتھ کتوں کا ماسک کرتے ہو،
دیکھنا تو سہی کیسا عذاب پڑے گا تم لوگوں کے اوپر۔
فتو جلدی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔
یہ کھانا بھی لیتا جا، ورنہ میں اٹھا کر پھینک دوں گا۔

دادا جان دباڑے۔

مگر فتو کان دبا کے آگے بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ دادا جان کھانا پھینکیں گے
برگزنہ نہیں۔ بک جھک کر آخر کھا ہی لیں گے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا اور فتو اب اس
بات کا عادی ہو چکا تھا۔

شجورانی نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے میز کے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو
انہیں بنفشہ باجی نظر نہیں آئیں۔

رمضان، بنفشہ باجی سے کہہ کھانا کھا لیں۔

شجورانی نے کہا۔

بنفشہ بی بی کھانا نہیں کھائیں گی۔

کیوں؟

کہنتی میں بھوک نہیں۔

ارے واہ، بھوک کیسے نہیں۔

شجورانی اپنا سبز آنچل لہراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ بنفشہ باجی کمرے

میں نظر نہیں آئیں تو وہ حیرت زدہ سی ہو کر ہر آمدے میں نکل آئیں۔ رینگ کا
سہارا لئے وہ چپ چاپ کھڑی پانی میں تیرتی ہوئی کاغذی ناؤ کو تکیے جا رہی تھیں۔

جو بن میاں ذرا دیر پہلے تیرا کر گئے تھے۔

کھانا نہیں کھائیں گی باجی!

شجورانی نے کہا تو بنفشہ چونک پڑی۔

ایں! نہیں!

کیوں؟

بھوک نہیں۔

آپ کو میری جان کی قسم تھوڑا سا کھا لیجئے۔

شجورانی نے بنفشہ باجی کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر کچھ اتارے پیار سے کہ وہ بھوک

نہ ہونے کے باوجود انکار نہ کر سکیں۔

کھانے کے کمرے میں پلیٹوں اور چمچوں کی آواز کے ساتھ باتوں کی آواز بھی شامل

تھی۔ شفو بٹیا ہنک ہنک کر کے روٹی جا رہی تھیں اور چاول کھانے کے لئے مندر

رہی تھیں۔

کیوں ضد کر رہو بیٹا۔ اتنی تو تمہیں کھانسی ہو رہی ہے۔

بس اب یہ جوتے کھائے گی میرے ہاتھ سے۔

چچی جان نے شفو کو گھورا۔

کون سے جوتے اتی۔ وہی نا جو پچھلے ہفتے ابو میرے لئے لائے تھے۔

بن میاں جلدی سے بولے۔

بہت بولنے لگے ہو تم۔

چھٹ باجی نے بن کو گھر کی دی۔

ہاں یہ بھی مار کھائے بغیر ڈیلے ہو رہے ہیں۔

چچی جان نے بن میاں کی طرف دیکھا۔

بن میاں جلدی سے اپنی پلیٹ پر جھک گئے۔

ابامیاں نے سب سے پہلے کھانے سے ہاتھ کھینچا تو اماں بیگم نے فکر مند

کی طرف دیکھا۔ ان کا فکر مند ہونا کچھ بے جا بھی نہیں تھا۔ ان کے جیسے خوش

شوہر نامدار اتنی جلدی کھانے سے ہاتھ روک لیں؟ بات تعجب کی ہی تو تھی۔

خیریت تو ہے، آپ نے اتنا تھوڑا سا کھانا کھایا؟

ہاں، بس۔

ابامیاں نے اپنے منکے پر ہاتھ پھیرا۔

کھانا پسند نہیں آیا۔

اماں بیگم نے پوچھا۔

کھانا تو بہت اچھا ہے بیگم، مگر....

مگر

شام کو ناروقی کے ساتھ ہوٹل چلا گیا تھا، بس وہیں ذرا....

ابامیاں نے لکھنویوں سے اماں بیگم کے انار چڑھاؤ کا جائزہ لیا۔

ہاں تو یوں کہیں، میں نے ناحق پالک گوشت پکانے میں آپ کے لئے

محنت کی۔

اماں بیگم نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔ لیکن پیار تھا کہ چہرے سے جھلکا

تھا۔ اور کسی نے اپنی باتوں میں مگن ہو کر چاہے اس طرف دھیان دیا ہو یا نہ

مگر شجورانی جو زمانے بھر کی دادی تھیں، ان کی نگاہوں نے سب کچھ ناٹ لیا اور

دماغ نے سب کچھ محسوس کر لیا۔ عمر کی چھوٹائی بڑائی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اور پھر وہ تو

تھیں ہی گھاگ۔ اچھی طرح جانتی تھیں کہ اماں بیگم کو ابامیاں کی خوش خودا کی بہت

بھاتی تھی۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ سارا دن باورچی خانے میں گھسی ابامیاں کے

لئے کھانے پکاتی رہیں۔

ابامیاں کے بعد بنفشہ باجی بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ دادی اماں نے فوراً انہیں

اتنا کم کھانے پر ٹوکا۔

میں کہوں تو اتنا کم کیوں کھاوے ہے۔ سوکھتی چلی جا رہی ہے لکڑی کی طرح

(طرح)

بس اتنی ہی مہموک تھی دادی اماں۔

جب کچھ کہو، یہی جواب دیوے ہے۔

بنفشہ کرسی کی پشت پچھلے ان کی تقریر سنتی رہی۔

تھوڑا سا کسڑھی کھا لو بنفشہ۔

بڑی اماں بولیں۔

صبح ناشتے میں کھا لوں گی۔

صبح تک کہاں دھرا رہے گا۔ یہ لڑکے بھلا چھوڑیں گے؟

اماں بیگم نے کہا۔

ہاں بنفشہ بیگم ابھی کھا لو، ورنہ بیکار میں صبح پچھتاؤ گی۔

شکیل جھائی بولے۔

اور اگر موڈ نہیں ہے تو اپنا حصہ مجھے دے دو۔
سماد بھائی مسکرائے۔

لے لیجئے۔

بنفشہ نے کہا اور باہر چلی گئی۔

لوکی کا جی آج کچھ ماندہ ہے۔

دادی اماں نے کہا۔

ہاں دوپہر سے بڑی چپ چپ ہے۔

چچی جان بولیں اور بن میاں کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ جن کا ہاتھ لگنے سے گلاس
میز پر الٹ گیا تھا اور کچھ پانی ان کی سالن کی پلیٹ میں گر گیا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں تو ہر وقت کھلی ہوتی رہتی ہے۔

چچی جان اپنی خوب صورت سی پیشانی پر تیریاں ڈال کر بولیں۔

بن میاں نے مسکین صورت بنا کر ان کی طرف دیکھا۔

چلو اٹھو، بس کھا چکے بہت، کسی طرح پیٹ ہی نہیں بھرتا۔

چچی جان نے حکم صادر کیا۔

بن میاں روئی صورت بنا کر اٹھنے لگے تو بڑی اماں کو ترس آگیا۔

”اے بے کیوں اٹھا رہی ہو اسے عائشہ ابھی اس غریب لٹے کسٹرو تو

کھایا ہی نہیں۔“

”دے دو اسے ذرا سا کسٹرو شمشہ!“

چچی جان نے کہا۔

شجورانی نے غور کیا کہ بڑی اماں آج سب کو کسٹرو بہت کھلا رہی ہیں۔ آخر
اس کی کیا وجہ ہے۔ قریب مجھی چھٹ باجی سے کسٹرو بھیس کرنے پر معلوم ہوا کہ کسٹرو
بڑی اماں نے پکایا ہے۔

”ہوں تو یہ بات ہے۔“

شجورانی نے فلسفیوں کی طرح گردن ہلائی اور تھوڑا سا کسٹرو اپنے سامنے
رکھ ہوئے پیالے میں نکال لیا۔ ایک چمچہ منہ میں ڈالتے ہوئے بولیں۔

”انچھا نہیں ہے کسٹرو۔“

”اس لوکی کو تو کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی۔“

بڑی اماں چڑا کر بولیں۔

”شیراتن نے ٹھیک طرح سے پکایا ہی نہیں تو....“

”شیراتن کا بے کو پکانی۔ میں نے سر مارا ہے اپنا۔“

”ارے آپ نے پکایا ہے؟“

شجورانی نے انتہائی مسکین صورت بنا کر کہا اور جلدی جلدی کسٹرو کھانے لگیں۔
بنفشہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں جا رہی تھی کہ صوفیہ سے مڈ بھڑ ہو گئی۔

”کہاں کے ارادے ہیں بنفشہ بیگ؟“

”کہیں کے نہیں، بس ذرا...“

”کھانا کھا چکیں؟“

”جی۔ آپ نے ابھی تک نہیں کھایا؟“

”ابھی نہیں۔ ڈیڑھی کا انتظار کر رہی تھی۔“

”چھوٹے چچا اب تک نہیں آئے؟“
 ”ان کی کوئی میٹنگ ہے۔ دیر سے آئیں گے۔“
 ”آج آپ بھی کلب نہیں گئیں؟“

”نہیں، آج میرا موڈ نہیں تھا کلب جانے کا۔“

اتنے میں بنفشہ نے دیکھا کہ دادا جان مہری پر تکبوں کے سہارے بیٹھے
 شعلہ بارنگا ہوں سے صوفیہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ صوفیہ کی شامت ہی آئی تھی
 جو وہ ان کے کمرہ کے سامنے رک گئی تھی۔ بنفشہ نے سوچا کہ دادا جان یقیناً صوفیہ
 کی مریاں باہروں کو دیکھ کر بیچ و تاب کھا رہے ہوں گے۔

چھوٹے چچا کا مزدورت سے زیادہ موڈ دن بوتا اور بیوی اور بیٹی کو بے جا آزادی
 دینا دادا جان کو سخت ناپسند تھا۔ ان کا خیال تھا کہ چھوٹی بہو اور ان کی بیٹی انتہائی
 فیشن ابل لباسوں میں کلب جا کر خاندان کی شرافت کے پرچے اڑا رہی تھیں۔ ناچ، گانا
 ان کے نزدیک خاندان کے اصولوں کی خلاف ورزی تھی۔ وہ یہ سونچ سونچ کر پھٹانے
 تھے کہ ان کے مرحوم بھائی افتخار حسین خاں نے اپنے بیٹے کو ولایت بھیج کر سخت غلطی کی
 تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ چھوٹی چچی اور صوفیہ کو باقی سب لوگوں کے ساتھ رہنا پسند بھی
 نہیں تھا۔ بس ذرا دادی اماں کا لحاظ تھا ورنہ وہ تو کلب کی اپنے میاں کو لے کر اس
 گھر سے اڑ بچھو ہو گئی ہوتیں۔ حالانکہ دادی اماں نے اپنے بیٹے کو قریب رکھنے کے لئے
 ان تینوں کو اس حد تک سہولت دے رکھی تھی کہ کوٹھی کا بالکل علیحدہ حصہ ان کے
 لئے وقت کر دیا گیا تھا۔ ان کا خانہ ماں بھی الگ تھا۔ چوتھوں خود اسی کے فرانسیسی
 پیمینی، جاپانی، انگریزی، ایرانی اور ترکی اور نہ جانے کون کون سی اقسام کے کھانے تیار

کریکا اسپیشلسٹ (اسپیشلسٹ) تھا۔ ہندوستانی کھانے تو ان ماں بیٹی کے من کو بھاتے
 ہی نہ تھے۔ دادی اماں کو پکا یقین تھا کہ کسی موٹی فرنگن کی روح ان دونوں ماں بیٹیوں
 میں حلول کر گئی ہے۔ شہزادہ بھی اس سلسلے میں ان سے سو فیصد اتفاق کرتی تھی۔
 اتنے میں دادا جان کی بارعب آواز سنائی دی۔

”ہزار مرتبہ کہہ چکا ہوں کہ یہ دابھیاں لباس پہن کر میری نظروں کے سامنے نہ
 آئیں۔ مگر یہ ماں بیٹیاں تو سنتی ہی نہیں۔ صاحبزادے نے کھلی چھٹی دے رکھی ہے موی
 اور بیٹی کو۔“

صوفیہ نے ایک نظر دادا جان کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی دوسری طرف
 چلی گئی۔

”ہونہہ، بالشت بھر کی چھو کر ہی اور ہمارے اوپر بڑبڑاتی ہے۔ بس اپنی سن مانی
 کارروائیاں کرنے دو ان ماں بیٹیوں کو تو خوش رہیں گی۔ عجیب زمانہ آگیا ہے۔ بزرگوں
 کی کوئی عزت ہی نہیں رہ گئی۔ یہ سب قرب قیامت کے آثار ہیں۔“
 دادا جان اپنے آپ بڑبڑائے چلے جا رہے تھے۔

پھر، ایک دم ہی انہوں نے بنفشہ کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور بولے۔
 ”تم وہاں کھڑی کون سا کارنامہ انجام دے رہی ہو، ادھر آؤ۔“
 بنفشہ نے سچے ہوئے انداز سے ان کی طرف دیکھا اور حکم کی تعمیل میں
 کمرے میں داخل ہو گئی۔

”جی دادا جان۔“

”جی اور جناب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

دادا جان کچھ جھنجھلا کر بولے۔

”جی پھر؟“

”کھانا کھایا تم نے۔“

”جی۔ کھایا۔“

کیا کھایا؟

”آلو گوشت، روٹی اور میٹھی چٹنی۔“

”بس یہی پکا مٹھا؟“

”نہیں اور بھی کئی چیزیں تھیں۔“

”ارے یہی تو پوچھ رہا ہوں۔ باقی لوگوں نے کیا کچھ کھایا؟“

بنفشہ نے انتہائی مصومیت سے ساری چیزوں کے نام گنوا دیئے۔

”ہوں، مال آڑانے کے لئے تم لوگ ہو اور پرہیزی کھانا کھانے کے لئے

میں ہوں۔“

دادا جان تھلا کر بولے۔

بنفشہ ان کی بات کا کیا جواب دیتی۔ سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔

”اور آج تم تھیں کہاں صبح سے؟“

دادا جان کو ایک دم اس کی غیر حاضری کا خیال آگیا۔

”جی۔ وہ۔ میں صبح نوکانج گئی تھی اور دوپہر سے گھر میں ہی ہوں۔“

”آج تم نے مجھے اخبار پڑھ کے بھی نہیں منایا۔“

”میں دوپہر میں آئی تھی اخبار منانے کے لئے تو آپ سو رہے تھے۔“

بنفشہ نے سہم کر کہا۔

”ارے بھی کسی وقت اٹھا بھی تو ہوں گا کہ مستقل سوتا ہی رہا۔“

”اب سنا دیتی ہوں۔“

بنفشہ نے کہا۔

”اب کیا سنا دو گی۔ میں نے خود پڑھ لیا ہے۔“

”جی اچھا۔“

”اچھا کیا مطلب، اور کسی کو تو توفیق ہی نہیں ہے۔ تم نے بھی جان چرانا

شروع کر دیا۔“

بنفشہ ٹکڑا ٹکڑا ان کا منہ تیکنے لگی۔

”اب میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ میں تم لوگوں کا محتاج تو ہوں نہیں۔ مجھے

پڑھ کر سناؤ گی تو تمہاری ہی انگریزی اچھی ہو گی۔“

بنفشہ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ دادا جان اس سے اخبار یا

میگزین صرف اس لئے پڑھوا کر سنتے ہیں کہ انگریزی کچھ امپروو (improve)

ہو، لیکن سوائے شجرہ رانی کے سبھی انگریزی پڑھنے سے گھبراتے تھے۔ اور خاص

طور سے چھٹ باجی کا تو دل بیٹھنے لگتا تھا انگریزی پڑھتے وقت، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے

پڑ جاتے تھے۔ اور صورت سے اکیدم ہونٹ معلوم ہونے لگتیں۔ اپنے باسے میں

یہ ساری تفصیلات خود انہوں نے ہی بنفشہ کے گوش گزار کی تھیں۔

انگریزی پڑھنے سے تو بنفشہ بیگم کو بھی دلچسپی نہ تھی۔ اب یوں ماسے بانٹے

سے تو سبھی کام کر لیا کرتے ہیں۔ اب رہ گئیں شجرہ رانی تو ان کے بارے میں قصہ

یہ تھا کہ ان کی انگریزی تو بہت اچھی تھی اس لئے دادا جان کی منگور نظر نوپنوں میں سے تھیں۔ لیکن دوسری طرف وہ مسخری بھی تھیں اور دادی اماں کا خیال تھا کہ ان کی زبان بھی ایک نہ دوپوسے پاچ ماتھ کی ہے۔

اب کس سوخ میں کھڑی ہو؟ دادا جان نے کہا۔ ”یہ میز پر رکھا ہوا میگزین مجھے پڑھ کر سناؤ۔“

بنفشہ کا موڈ تو اس وقت صرف چپ چاپ بیٹھ کر سوچنے کا تھا۔ مگر بزرگوں کے حکم سے سرتابی کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ کرسی دادا جان کی مسہری کے قریب کھینچ بیٹھ گئی۔

بنفشہ دادا جان کے کمرے سے نکلی تو دس بیچ چکے تھے۔ وہ برآمدے کی رینگ پر دونوں ہاتھ ٹیک کر کھڑی ہو گئی۔ اور باہر تاراجی میں جانے کی تلاش کرنے لگی۔ اوپر آسمان پر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب چلتے ہوئے لمبوں کی روشنی کا عکس پانی میں جھللا رہا تھا رات کی رانی کی مسکور کن خوشبو چنبیلی کی گندھ سے گھلے ل رہی تھی۔ ڈرائنگ روم سے اماں، چچا جان، اماں بیگم اور بڑی اماں کی آواز آرہی تھی۔ بحث کا موضوع سلیمان بھائی تھے، جو عنقریب ہی جرمی سے آنے والے تھے۔ سلیمان بھائی چھوٹے چچا کے بیٹے اور صوفیہ بیگم کے چچیتے دلائے تھے۔

”اے بیٹا، تم دیکھ لینا وہ لڑکا یہاں نہیں ملے گا۔“

اماں بیگم نے چچا میاں سے کہا۔

”نہیں بھابی، سلمان اپنی ماں بہن سے بالکل مختلف ہے۔“

چچا میاں نے غالباً پائپ کا دھواں نکالتے ہوئے کہا۔

”اے میاں، برسوں ہو گئے اسے باہر گئے ہوئے، اب تک ویسا ہی تھوڑا ہو گیا۔“

”بھئی میں تو کہتا ہوں کہ وہ کیسا بھی ہو، کہیں رہے، کچھ بھی کرے، تم لوگوں کو

بحث میں پھنسنے کی کیا ضرورت ہے۔“

اماں میاں نے لاکھ روپے کی بات بتائی،

اس کے بعد ان لوگوں میں جانے کیا کھسکھس رہتی رہی۔

بنفشہ نے بھی اپنا دھیان دوسری طرف سے ڈال دیا۔ شاید چھٹ باجی کے کمرے میں بڑے زوروں میں تاش کی بازی جی ہوئی تھی۔ آپا جان، چھٹ باجی، شکیل بھائی، اور سجاد بھائی نے ایک چیمہ دھاڑ چار کھی تھی۔ بنفشہ کی نگاہ دادا جان کے سامنے والے

کمرے کی طرف اٹھ گئی۔ یہ بڑ بیٹا کا کمرہ تھا، جس میں گھپ اندھیرا تھا اور بڑ بیٹا بقول

دادی اماں کے جانے کہاں ٹکریں مارتے پھر رہے تھے۔ صبح سے بارش کے آثار دیکھ کر سبھی کوشش کر کے جلدی سے جلدی گھر آ گئے تھے۔ مگر انہیں تو گھر جیسے کاٹنے کو دوڑنا تھا۔

بڑی اماں کا کہنا تھا کہ بڑ بیٹا نے گھر کو سرائے سمجھ رکھا تھا۔ اور ان کا کہنا کچھ

غلط بھی نہ تھا۔ کہیں ہنٹوں میں چلتے پھرتے ان سے علیک سلیک اور دوچارہ سہی

باتیں ہو جاتی تھیں۔ ورنہ گھر والے ان کی صورت دیکھنے کے لئے ترسا کرتے تھے۔

”اللہ جنے کون سے مشکے (مشغلے) اس لڑکے کو باہر دوڑاتے ہیں؟“

دادی اماں سوخ سوخ کر پریشان ہو جاتیں۔

فتو کا کہنا تھا کہ بڑ بھیا کسی بہت بڑے جنس (بزنس) میں معروف رہتے ہیں۔ اور بڑی اماں تو بے چارہ اپنے بیٹے کے فکرمیں دن بدن گھلتی جا رہی تھیں۔ بچوں کو چھوڑ کر گھر کے ایک ایک فرم سے پوچھا کرتیں۔

”اے بھیا، تمہیں پتہ ہے کچھ، یہ شعیب دن بھر کہاں رہتا ہے؟ اور کیا کرتا ہے؟“
 ”اے بیٹا، تم سے اس نے کبھی کوئی ذکر کیا، آخر چکر کیا ہے؟“
 ”بھابی، شعیب بالکل بھائی صاحب پر گیا ہے۔ دن بھر لائبریریوں کی خاک چھانا کرتا ہوگا۔“

ابا میاں دلا سے دیتے۔

”چکر دکر کیا ہوگا بڑی اماں، آخر ہر مہینے اتنے ڈھیر سارے روپے لاکر آپ کے ہاتھ پر رکھتے ہیں تو دفتر کے علاوہ اور کہاں جاسکتے ہیں۔“
 ”اے بے نوکیا سارا دن اور ساری رات دفتر میں رہتا ہے؟ مجھے چلاتا ہے لڑکے۔“

بڑی اماں تشکیل بھیا کو ڈانٹ دیتیں۔

”آپ فکر کیوں کرتی ہیں رات کو تو گھر آکر سوتے ہیں۔“
 سجاد بھائی ہنستے۔

”ہاں اور کیا، سرائے ہے، رات بسر کرنے آجاتے ہیں۔“

بڑی اماں ساری فکر پریشانی اور پیار بھول کر غصہ میں آجاتیں۔

”بڑی اماں یہ بھی ممکن ہے انہوں نے کہیں چپکے سے شادی کر لی ہو؟“
 تشکیل بھائی کی رگ شرارت پھڑک اٹھی۔

”اے لڑکے تیرے منہ میں خاک، چپکے سے کیوں کرے گا شادی، ابھی تو مجھے اس کے سہرے کے پھول دیکھنے ہیں۔“
 بڑی اماں دوسروں میں گھر کر کہنیں۔

بڑ بھیا کے متعلق سوچتے ہوئے ہنشتہ کا ذہن بھٹک گیا۔ سینے میں درد کی اک لہری اٹھی اور پورے جسم میں سرایت کر گئی۔ پلکوں کی جھلکائی ہوئی پلمن کے اس پار دیکھا تو ماضی کے ویران اور سونے آنگن میں پھول بکھرے پڑے نیرے دل میں ٹیسیں اٹھتی تھیں تو خاموش آپہنیں دل کو اندر ہی اندر سلگانے لگتی تھیں کچھ بھولے بسرے چہرے یاد آکر آنکھوں کے ساحل کو سمندر بنا دیتے اور پھر آنکھوں کے سامنے بس صرف وہند کے چہا کر رہ جاتے، ایسے میں اگر شجورانی کہیں دیکھ لیتیں تو ان کی میچگی پلکیں اپنی گلابی گلابی انگلیوں سے چھڑ کر کہتیں:

کیوں روتی ہیں ہنشتہ باجی؟

”روتی تو نہیں شجیعہ! وہ تو — بس ذرا....“

اور اس کے آگے ان سے کوئی جواب نہ بن پڑتا۔ اپنی پلکیں جھپکاتے ہوئے وہ زبردستی مسکرانے لگتیں۔

اور اس وقت بھی ایسا ہی ہوا۔ یادوں کی گھا جھوم کے آئی، دل کے خاموش افق پر لہرائی اور مینوں سے دم جھم دم جھم بھوار برسنے لگی۔ مگر اس وقت کسی کی نرم اور گلابی انگلیوں نے میچگی پلکوں کی پلمن کو آہستگی سے چھوتے ہوئے یہ نہ پوچھا:

”کیوں روتی ہیں ہنشتہ باجی!“

پوچھنے والی تو اس وقت کتابوں کا کٹرا بنی ہوئی تھی۔

اور بنفشہ کو جی بھر کے رونے کا موقع مل گیا۔ اس کا دل تو صبح ہی سے دھوا
کو چاہ رہا تھا۔ اگر اس وقت شخ آجاتی تو بنفشہ کو جلدی سے اپنی آنکھوں کو بند کر
سے رگڑا، پلکیں چپکے کر کہنا پڑتا۔

”روتی تو نہیں شجیعہ، وہ تو بس ذرا....“

اور پھر دل پر منوں بوجھ رہ جاتا، دماغ اُلجھ کر رہ جاتا۔

ادھر گہرے کالے بادل ادھر ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ بارش قائم گئی تھی
بھلی کے تاروں پر پچکتے ہوئے بارش کے قطرے ٹپ، ٹپ کی آوازوں کے ساتھ نیچے
گر رہے تھے اور پانی میں گول دائرے بن بن کر مٹ رہے تھے۔ بنفشہ کے سینے
میں سوئے ہوئے طوفان کو دھیں بدل بدل کر جاگ اٹھے تھے۔ دماغ جھنجھٹا اٹھا۔
اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام کر دینگ سے کمر لگائی۔ بے شمار لمحے بنا آہٹ
کے گزر گئے۔ اور پھر باہر سڑک پر بیتے ہوئے پانی میں ٹڑاپ ٹڑاپ کی آوازیں
بلند ہوئیں۔ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ بجری کی روش پر کسی کے مضبوط قدموں کی آواز
گوئی۔ میڈیٹھنوں پر جوتے رگڑ رگڑ کر مٹی صاف کی گئی۔ لیکن اس تمام کارروائی کے
دوران بنفشہ اسی طرح کھڑی رہی۔ ہاں، اتنا ضرور ہوا کہ اس نے چپکے سے اپنی
پلکیں پر جلتے ہوئے خاموش چراغوں کو آنچل میں چھپا لیا۔ جب آنے والا اس کے
قرب آکر رگ گیا تو اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اور اپنی آواز پر قابو پا کر کہا۔

”السلام علیکم! شعیب بھائی۔“

وہ بڑھیا کو ہمیشہ شعیب بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔

”جیتی رہو۔“

وہ مسکرائے اور ایک لمحے کے لئے ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جم کر
رہ گئیں۔

”کیا بات ہے بنفشہ؟“

”جی! کچھ بھی نہیں۔“

”پھر تم کیوں روتی تھیں؟“

”اوہ میں کب روتی تھی؟ وہ تو مجھے نزلہ ہو رہا ہے نا اسی لئے آنکھیں....“

”تم مجھے یہ قوت نہیں بنا سکتیں بنفشہ بیگم۔ میری آنکھیں صرف ایک لمحے میں
دل کی گہرائیوں میں جھانک لیتی ہیں۔“

بنفشہ نے سوچا کہ شعیب بھائی کچھ غلط بھی نہیں کہتے۔ لیکن اس نے
ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے کھڑی رہی۔

”اچھا آؤ، میرے کمرے میں آجاؤ۔“

بڑھیا نے کہا۔

بنفشہ نے کسی کی حکم عدولی کرنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ گردن جھکا
ان کے پیچھے چل دی۔ بڑھیا نے اپنے کمرے میں پہنچ کر لائٹ آن کی اور بنفشہ کو
کو کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ روم میں گھس گئے۔ بنفشہ ان کے
نفاست سے سبے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ تھوڑی دیر بعد بڑھیا انسان
کی جوئے میں ہاتھ روم سے برآمد ہوئے تو بنفشہ نے تحسین آمیز نگاہوں سے ان
کے سراپے کو دیکھا لیکن ان کے سانولے سلونے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کے
دل کو تکلیف ہوئی۔ کیسا کم لایا ہوا لگ رہا تھا ان کا چہرہ۔ صاف معلوم ہو رہا تھا

کہ انہوں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ اسے یوں اپنی جانب تحریک سے تکتے دیکھا تو بڑھیا کے مونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”کیا جائزہ لیا جا رہا ہے؟“

وہ اس کے قریب رگ کر بولے۔

”آپ کا مڑھایا ہوا چہرہ دیکھ رہی ہوں۔“

”مڑھایا ہوا چہرہ۔ بہت خوب۔“

بڑے بھیا اس کے جملے سے محفوظ ہوتے ہوئے بولے۔

”آپ نے کھانا نہیں کھایا نا۔“

”ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔“

بڑھیا نے کہا۔

”میں آپ کے لئے کھانا لاؤں؟“

”ہاں ضرور، لیکن بہت جلدی۔“

”بہت جلدی تو نہیں لاسکتی۔“

”پھر بھی کتنے منٹ لگیں گے؟“

”دس منٹ تو ضرور لگیں گے۔“

”اچھا جاؤ، تمہیں دس منٹ کی اجازت دیتے ہیں مابعدولت۔“

بنفشہ کمرے سے باہر نکلتی ہی تھی کہ فتوا اپنی اسفنج کی چلیں گھسیٹتا ہوا آگیا

اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ وہ اٹے قدموں کمرے میں واپس آگیا

فتو نے کھانا میز پر رکھ دیا۔

”ایک بوتل پانی بھی لے آؤ فتو۔“

بنفشہ نے کہا۔

”ابھی لایا بی بی۔“

بڑھیا کھانے پر نظریں جمائے جانے کن سوچوں میں ڈوب گئے۔

”کیا سوچ رہے ہیں شعیب بھائی؟“

”ہوں۔“

بڑھیا چونک گئے۔

”کھانا کھائیے۔“

”اکیلے۔“

”ہاں، ظاہر ہے باقی لوگ تو کھا چکے ہیں۔“

”اکیلے تو مجھ سے دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا۔“

بڑھیا کا لہجہ بہت عجیب تھا

”تم میرا ساتھ نہیں دے سکتیں۔“

”نہیں۔“

”کسی بھی معاملے میں میرا ساتھ نہیں دے سکتیں؟“

”کم از کم اس وقت کھانا کھانے میں تو آپ کا ساتھ بالکل نہیں دے سکتی“

”بہت افسوس ہوا مجھے یہ سن کر۔“

”اور کس معاملے میں آپ کو میری مدد کی ضرورت ہے؟“

”وقت آنے پر بنا دوں گا۔ سچ شیخ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے بنفشہ“

بڑھیا کی آواز بہت دھیمی تھی، اور ان کا سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ ان کے چہرے پر اس لمحے جو کیفیت تھی، اسے دیکھ کر ہنستا سوخت میں پڑ گئی۔

”آج تو صبح ہی سے بادل گھرے ہوئے تھے۔“
 بڑی اماں نے تنہید باندھی۔

”جی ہاں!“
 ”صبح سے ہی بارش کے آثار تھے۔“
 بڑی اماں نے کہا۔
 ”جی!“
 ”سبھی لوگ بارش کا خیال کر کے جلدی گھر آ گئے تھے۔“
 بڑی اماں نے لفظ ”جلدی“ پر خاصا زور صرف کیا۔
 ”اچھا!“
 بڑھیا نے ایک ذرا سی حیرت کا اظہار کیا۔
 ”مگر بیٹا! تمہیں تو یقین نہ ہوئی کہ اپنا وہ بہت ضروری کام جلدی سے نہ لے گھر آ جاتے۔“
 ”وہ کام جلدی نہیں ہو سکتا تھا امی!“
 بڑھیا مسکرائے۔
 ”آخر وہ کون سا منحوس کام ہے تمہارا جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتا؟“
 بڑی اماں کے تیور ایک دم کڑے ہو گئے۔
 ”امی خدا سے لئے لفظ منحوس تو نہ استعمال کیجئے۔“

بڑھیا نے اپنے بھاری بھر کم جسم کو کرسی میں فرٹ کر لیا۔ ایک نگاہ قریب بیٹھی ہوئی ہنستا ہر ڈالی اور گلاصاف کر کے بولیں۔
 ”کہاں رہ جاتے ہو بیٹا!“
 ہمیشہ کی طرح انہوں نے اپنا فضول سا سوال دہرایا۔ ظاہر ہے حسیس سوال کا کوئی جواب نہ ہو فضول ہی کہلائے گا۔
 ”کام تھا بہت ضروری۔“

بڑھیا نے بھی ہمیشہ کی طرح پنا تلّا جواب دیا۔
 ”اللہ جتنے کون سے ضروری کام ہیں جو آج تک ختم نہیں ہوئے۔“
 بڑی اماں نے اس انداز سے کہا جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہی ہوں۔
 بڑھیا کی تو عادت تھی کہ اس قسم کی باتوں کے جواب میں وہ منہ میں گھٹکھٹایا

لی کر بیٹھ جاتے تھے۔ بڑی اماں بیچاری بک بک کر اپنے آپ ہی چپ ہو جاتی ہیں۔

بڑھتی سنجیدہ ہو گئے۔

بڑی اماں خاموش بیٹھی ان کی صورت تکتی رہیں۔ کچھ دیر کمرے میں بالکل خلوا رہی لیکن آخر کب تک؟ بڑی اماں کی زبان میں پھر کھلی ہوئی۔

”بیٹا! اب تم شادی کرلو۔“

”کب ابھی؟“

بڑھتی بے ساختہ بولے تو بنفشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ بڑی اماں نے کہا ہی اس طرح تھا جیسے بڑھتی کو ابھی پکڑ کے سہرا باندھ دیں گی۔ اور قاضی بٹا کے نکاح پڑھوا دیں گی۔

”دیکھو مہیاں یہ مذاق میں ٹالنے والی بات نہیں ہے۔“

”میں نے کب کہا کہ یہ مذاق میں ٹالنے والی بات ہے لیکن....“

”لیکن؟“

بڑی اماں نے پوچھا۔

”یہ کہ ایسی کیا جلدی ہے؟“

”جلدی کیسے نہیں ہے۔ اب نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں کرو گے؟“

”ابھی میری عمر ہی کیا ہے اتنی؟“

بڑھتی نے منتقل غیر سنجیدگی اختیار کر رکھی تھی۔

”نہاری عمر کے لڑکے تو پچیس کے باپ بن جایا کرتے ہیں۔“

”لیکن مجھے باپ بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔“

بڑھتی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”تمہیں باپ بننے کا شوق ہو یا نہ ہو مجھے دادی بننے کا بہت شوق ہے۔“

بڑی اماں نے کچھ اس انداز سے کہا کہ بنفشہ ہنس پڑی۔

”نانی تو بن چکی ہیں آپ، دادی بننا بھی ضروری ہے۔“

بڑھتی بولے۔

بڑی اماں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے انہیں گھورا۔

”ماشاء اللہ آپ کی دونوں بیٹیاں اب بال بچوں والی ہیں۔“

بڑی اماں نے پھر بھی ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

”اچھا چلیے غصہ خنوک دیجئے، یہ بتائیے آپ نے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے

سے لئے؟“

”لڑکیوں کا کوئی کال پڑا ہے۔ تم آج صبحی بھرو، میں دس لڑکیاں پسند کروں

تمہا سے لئے۔“

”لیکن میں دس لڑکیوں سے تو شادی نہیں کر سکتا۔“

”ارے تم ایک سے کرو تو بڑا احسان ہو گا مجھ بڑھیا پر تمہارا۔“

”اب مشکل یہ ہے اتنی کہ اگر کہیں میری اور آپ کی پسند جدا ہوئی تو کیا ہوگا“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تو نے اپنے لئے کوئی لڑکی پسند کر لی ہے؟“

”ابھی اس سلسلے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔“

دیکھا اور بستر پر اوندھی پڑی شبیچہ کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ وہ معمول کے مطابق کسی کتاب پر چھکی ہوئی تھی لیکن اپنی بنفشہ باجی کو دیکھتے ہی شجورانی کا چہرہ ایک دم مکمل اٹھا کتاب بند کر کے تکیے پر رکھتے ہوئے مسکرائیں اور بولیں:

کہاں غائب تھیں آپ؟

باہر تھی پھر شیبہ بھائی اپنے کمرے میں لے گئے۔

اچھا اب کیا ارادہ ہے؟

سوؤں گی۔

میں لاسٹ بند کر دوں؟

نہیں تم بڑھو، میں چادر منہ پر لے لوں گی۔

بنفشہ نے کہا اور کپڑے بدلنے غسل خانے میں چلی گئی۔

اور کسی کو چاہے یا نہ ہو یا نہ ہو لیکن شجورانی کو بہت اچھی طرح یاد تھا کہ جب بنفشہ باجی اس گھر میں رہنے کے لئے آئی تھیں تو ہمارے آخری شام ڈوب چکی تھی اس وقت ان کی عمر اتنی سنیں تھیں کہ ہمارے اور خزانہ کی پہلی اور آخری شاموں کے متعلق ان کی معلومات ہوتیں۔ بانٹ بھر کی چھوڑی تو تھیں ہی۔ عمر یہی کوئی سات آٹھ سال ہوگی۔ آنکھوں میں چیڑا اور نمقنوں میں ناک مہرے سٹر سٹر کرتی کہ کڑے لگاتی پھرتی تھیں۔ ناک صاف کرنا ان کو اس وقت تک سہیلا تھا۔ دونوں نمقنوں کو کلمے والی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان دبا کر ناک کو بجائے نیچے سٹر کرنے کے اوپر سٹرک مایا کرتی تھیں۔ حالانکہ اماں نے کئی بار انہیں اپنے ساتھ بٹھا کر باقاعدہ پریکٹس کر کے ناک صاف کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔ شجورانی بڑے انہماک سے اس پریکٹس کو دیکھتیں۔ لیکن جب

بڑھیا نے ایک نگاہ بنفشہ پر ڈالی جو نامعلوم سوچوں میں ڈوبی سر جھکائے

بیٹھی تھی۔

کچھ دنوں کی مہلت تمہیں اور دی جا رہی ہے۔ اس کے بعد کوئی عذر نہیں جائے گا۔

بڑی اماں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کسی تھانیدار کی طرح بڑھیا کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بنفشہ بھی کھانے کے برتن اٹھا کر چلی گئی بڑھیا درپے کے چوکھٹ سے کمر لٹائے اسے جانا دیکھتے رہے۔

بنفشہ باورچی خانے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچی تو بادل بڑی زور سے بجلی جھکی اور بارش دوبارہ شروع ہو گئی۔ اس نے اداس نظروں سے درپے سے با

غلام ماسٹری کی طرح ایسی پٹائی کی تھی کہ شجورانی کے نیل پڑ گئے تھے۔

آبائیاں کے سیڑھیوں تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ سوسن کے سر میں سے جوئیں پڑ کر اٹھ گئے تھے ناخن سے مار بھی چکی تھیں۔ سوسن تو آبائیاں کے پہنچتے ہی چلا گیا مار کر سیڑھیوں سے اتر گئی اور اپنی کوشٹری کی طرف جھاگ گئی شجورانی جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے کپڑوں کی دھول مٹی جھاڑنے لگیں جن کے اصل رنگ روپ کا کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ بالوں میں گھاس کے تکیے بھینسے ہوئے تھے اور خاک اتنی بھری تھی کہ بال سیاہی مائل مہرے ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے صبح سے شام تک خاک ایچنے کا ہی کام کرتی ہیں۔ انہوں نے آبائیاں کو سلام جھاڑنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ بس ہولن بنی رہ گئیں منہ کھلا کا کھلا اور آنکھیں پٹی رہ گئیں۔ نگاہیں بنفشہ پر تکی ہوئی تھیں جو آبائیاں کے پیچھے دیکھتی ہوئی کھڑی تھی، انداز کسی سہمی ہوئی کبوتری کا سا تھا۔ شجورانی نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ کیسی صاف ستھری تھی اور ایک وہ تھیں کھلا جھدارنی کی لوندیا سے بھی بدتر۔ یہ کون لڑکی ہے آبائیاں کے ساتھ؟

انہوں نے دل ہی دل میں سوچا اور پوچھنے کے لئے منہ بلایا ہی تھا کہ آبائیاں نے خود تعارف کرا دیا،

دیکھو بیٹی تمہارے لئے ہم نے ایک سہیلی ڈھونڈی ہے۔

سہیلی کے نام پر تو شجورانی غبارے کی طرح پھول گئیں۔

مگر یہ سوچ کر ان کا منہ ایک دم ٹک گیا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد اس کے آبائیاں اگر اسے لے جائیں گے۔

ان کے آبائیاں ان کو کب لینے آئیں گے؟

خود پریکٹیکل کرتے کا وقت آتا تو سرٹکی آواز کے ساتھ ناک کو اوپر کر جاتیں جوڑا کے راستے ہوتی ہوئی پیٹ میں پہنچ جایا کرتی تھی۔

ہاں تو اس روز قصہ یہ ہوا تھا کہ بنفشہ باجی کے آنے سے گھنٹہ آدھ گھنٹہ پہلے سجاد صبا نے بڑی آپا سے کہا تھا۔

آج ہمارا آخری شام ہے اور یہ ہمارا آخری گلاب ہے۔

شجورانی اس وقت مالی کی لونڈیا سوسن کے ساتھ رسی کو دتی ہوئی وہیں آکر کھڑی ہو گئی تھیں اور سجاد صبا کا جملہ سن کر انہوں نے ذہن نشین کر لیا تھا تا کہ گھر کے دوسرے افراد کو سنا کر اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا سکیں۔ یہ ان کی خاص عادت تھی کہ جہاں کسی سے کوئی بات سنی چھپکی کی طرح دیدے ساکت کر کے اسے سنا اور دوسرے لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اس جملے کو لفظ بہ لفظ دہرا دیا۔ سب کہتے،

ماشاء اللہ بڑی ذہین بچی ہے۔

اور بچی کو اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا۔

جس وقت آبائیاں بنفشہ باجی کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے تو شجورانی برآمدہ

کی سیڑھیوں پر بیٹھی سوسن کے سر میں سے دو موٹی موٹی پہلوان جیسی جوئیں پکڑنے میں مصروف

تھیں جو تھیں تو اوپر ہی لیکن بڑی تیزی سے پھسلتی ہوئی شجورانی کو جمل دینے کی کوشش

کر رہی تھیں مگر شجورانی جوئیں پکڑنے میں بڑی ماسر تھیں۔ ایک دفعہ تو اماں نے انہا

جھدارنی کی لونڈیا کے سر میں سے جوئیں پکڑتے دیکھا تھا۔ اماں کے تن بدن میں آگ

ہی تو لگ گئی اس گندگی پر۔ بالوں سے پکڑ کر گھسیٹی ہوئی اندر لے گئیں اور پھٹ باجی کے

ہاتھ سے بڑا دالا کیل کھینچ کر جس سے وہ کاپی پر لائنیں کھینچ رہی تھی، کسی بد مزاج اور

شجورانی نے پوچھ لیا۔

یہ اب اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہیں گی بیٹی۔

آبا میاں نے کہا۔

کیوں؟ شجورانی نے پوچھا۔

جھوٹی باجی اور آپا جان کی طرح یہ بھی تمہاری بہن ہیں۔

آبا میاں نے کہا۔

میری بہن ہیں تو اب تک یہ کہاں رہتی تھیں؟

شجورانی کی حیرت نے ایک دفعہ بھراہنیں کارٹوں بنا دیا۔

ہوں۔ یہ دوسرے شہر میں رہتی تھیں۔

آبا میاں نے کہا۔

شجورانی کے جھوٹے سے ذہن میں کھد بد ہونے لگی وہ ابھی طرح سمجھ رہی

تھیں کہ آبا میاں صاف صاف گھٹے بازی کر رہے تھے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ بہن میری

بہن اور رہتی کسی دوسرے شہر میں تھیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ میری سہیلی ہیں لیکن انہوں نے

اپنی عادت کے خلاف اس وقت زیادہ سواں جواب سنیں گے اور اپنی بھوری بھوری

آنکھوں سے اس سوٹ کیس کا جائزہ لینے لگیں جو آبا میاں نے سیڑھیوں پر رکھ دیا تھا

آبا میاں نے قریب سے گزرتے ہوئے فتو کو آواز دے کر سوٹ کیس اسے تھماتے

ہوئے کہا،

یہ سوٹ کیس میرے کمرے میں لے جا کر رکھ دو، میں ابھی آتا ہوں۔

فتو کے جانے کے بعد آبا میاں ان دونوں کو لے کر اپنے کمرے کی طرف چل دیے

جب آبا میاں نے اماں بگیم سے کہا،

لو بگیم، بنفشہ آگئی۔

تب باکر کیں شجورانی کو معلوم ہوا کہ اس لڑکی کا نام بنفشہ ہے۔

اماں بگیم نے جب بنفشہ کو سینے سے لگایا تو وہ ایک دم ہی سسکیاں لے کر رونے

لگی۔ شجورانی نے حیرت سے پوچھا۔

لو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟

تھوڑی دیر بعد جب اماں بگیم نے بنفشہ کو کھانے پینے کی چیزیں دے کر اور پیار

دلا کر کے چپ کرایا تو اتنے میں دیکھا کہ وادی اماں کھسکھس کر قہقہے ماری ہیں۔ ان

کے بعد تو جیسے لان ہی ٹگ گئی۔ ایک کے بعد دوسرا منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ ہر شخص

اپنا پیار بنفشہ پر بچھا کر کئے دے رہا تھا۔

شجورانی گھور گھور کر سب کو دیکھے جا رہی تھیں اور دل ہی دل میں کہہ رہی تھیں۔

لو! بہن، سہیلی میری اور مجھے ہی بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا۔

آخر تنگ آکر وہ تقریباً چیختے ہوئے بولیں،

آبا میاں نے کہا ہے یہ میری سہیلی ہے اور میری بہن بھی ہے۔

تو ہم کب اپنی سہیلی بنائے لے رہے ہیں اسے۔

آبا جان مہن کر بولیں۔

جاؤ بھائی تم اپنی سہیلی کے پاس جاؤ۔

چھٹ باجی نے بنفشہ سے کہا۔

شجورانی بنفشہ کے گلے میں ہاتھ ڈال باہر چلی گئیں۔

اس کے بعد کبھی کسی نے شجورانی کو بنفشہ باجی کہنے پر نہیں ٹوکا۔

اور یہ بات تو شجورانی کو بہت بعد میں معلوم ہوئی کہ بنفشہ باجی کی اماں تو معلوم نہیں کہاں رہتی ہیں اور آبا کا انتقال ہو گیا ہے۔ ان کے آبا نے اپنی وفات سے پہلے آبا میاں کو تار دلوا یا تھا۔ بس اللہ کی مرضی تھی جو آبا میاں ان کی وفات سے کچھ دیر پہلے پہنچ گئے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کا ہاتھ آبا میاں کے ہاتھ میں دے کر وعدہ لیا کہ اپنے جیسے جی بنفشہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دیں گے۔ آبا میاں نے اپنے جان سے زیادہ عزیز دوست کی آنکھیں بند ہونے سے پہلے بنفشہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ اسے اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھیں گے۔

شجورانی جب بھی بہار کی اس آخری شام کو یاد کرتی جب بنفشہ باجی اس گھر میں ہمیشہ کے لئے آئی تھیں تو نگاہوں میں ان کی سہمی ہوئی صورت گھوم جاتی اور وہ سوچتی کہ جی تو بنفشہ باجی اتنی خوفزدہ تھیں اور اداس بھی اور چھپی وہ دادی اماں کے گلے لگتے ہی سسک پڑی تھیں۔

بس وہ پہلے دن کی اداسی شجورانی کے دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اپنی اداسی اور سگوار کی ہی وجہ سے انہیں بنفشہ باجی سے محبت بھی ہو گئی تھی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بتدریج بڑھتی رہی۔

ورنہ شجورانی اور کسی کو پسند کرتی؟

اس روز رات بھر بارش ہوتی رہی۔ اگلے دن بنفشہ کی آنکھ بہت دیر سے کھلی۔ اس نے شجورانی کے لبت کی طرف دیکھا جو خالی پڑا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور کسمندی سے پاؤں نیچے لٹکا کر ہلاتی رہی۔ دو تین منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کالج جانے

اپنی ڈھیر ساری سہیلیں، کپڑوں، جوتوں اور رہنوں کی باتیں کرتے ہوئے انہوں نے بنفشہ پر اپنی ذہانت کا رعب جمانا بھی ضروری سمجھا اور ہٹلتی ہوئی گلاب کے پودوں کے قریب پہنچ گئیں۔

تمہیں پتہ ہے بنفشہ! استبداد بھائی کہہ رہے تھے کہ آج بہار کی آخری شام ہے اور یہ بہار کا آخری گلاب ہے۔

بنفشہ نے چپ چاپ شجورانی کی یہ بات سن لی کوئی جواب نہیں دیا اور جواب دہتی بھی کیا؟

شجورانی کی مرضی تو یہ تھی کہ وہ بنفشہ کو صرف بنفشہ کہیں۔ لیکن بنفشہ کو اپنے آپ کو باجی کہلوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے خاص طور سے تاکید کی تھی۔

دیکھو، میں تم سے ایک سال بڑی ہوں مجھے بنفشہ باجی کہنا کر دو۔

شجورانی نے تھوڑی سی رد و کد کے بعد یہ بات مان لی، مگر جب ایک دن دادی اماں کے سامنے ان کی زبان سے بنفشہ باجی نکلا تو دادی اماں نے فوراً ٹوکا:

اسے باجی کیوں کہے ہے تجھ سے زیادہ بڑی تھوڑی ہے وہ!

ان کو باجی کہلوانا اچھا لگتا ہے دادی اماں۔

شجورانی نے جھٹ سے کہا۔

کیوں بیٹی، تجھ میں اور اس میں ایک ہی سال کا تو فرق ہے؟

دادی اماں نے بنفشہ کے سر پر ہاتھ پیرتے ہوئے کہا۔

میری کوئی بہن نہیں ہے نا۔ اس لئے میرا دل چاہتا ہے کہ....

اچھا بیٹی جیسے تو خوش رہے۔

کا بالکل موڈ نہیں تھا مگر دو تین دن پہلے بھی وہ اپنی سستی کی وجہ سے چپٹی کر چکی تھی۔ روز روز گھر بیٹھنا مناسب نہیں تھا۔ اسٹے کا ارادہ کر ہی رہی تھی کہ شجرہ بیگم منہ چلائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ تو اپنا کالج یونیفارم پہننے بالکل تیار تھیں ناشتہ کر کے اپنی کتابیں اٹھانے آئی تھیں۔ شجرہ ان کی بالکل تیار دیکھ کر بنفشہ نے کالج نہ جانے کا قطعی فیصلہ کر لیا۔

ارے آپ اٹھ گئیں؟

ہوں!

میں تو سمجھ رہی تھی کہ آج لمبا پروگرام ہے سونے کا؟
رات مجھے بڑی دیر سے نیند آئی تھی۔ اس لئے جلدی آنکھ ہی نہ کھل سکی۔

اچھا تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟

پروگرام —؟

ہاں! کالج جائیں گی؟

نہیں۔ بالکل موڈ نہیں۔

خیریت تو ہے، ابھی چار روز پہلے بھی آپ نے چپٹی کی تھی؟

سچی بات تو یہ ہے کہ پڑھنے کو میرا بالکل دل نہیں چاہتا۔

دادا جان کے سامنے بھولے سے بھی یہ بات نہ کہنے لگا۔ ایسی خبریں گئے کہ

یاد ہی کریں گی۔

شجرہ رانی نے ہنس کر کہا۔

ہاں، اس میں تو کوئی شک نہیں شجرہ بیگم۔

بنفشہ نے کہا۔

اچھی بات ہے پھر خدا حافظ، ہم تو چلتے ہیں۔

شجرہ رانی نے میز پر سے اپنا پرس اور ناکل اٹھاتے ہوئے کہا۔

اچھا خدا حافظ!

بنفشہ نے کہا اور اٹھ کر در پہچے میں کھڑی ہو گئی۔

مطلع اگرچہ صاف ہو چکا تھا لیکن آسمان پر اب بھی کہیں کہیں گہرے کالے

بادلوں کے ٹکڑے آوارہ گردی کرتے پھر رہے تھے۔

بنفشہ منہ دھو کر ناشتہ کرنے کے لئے آئی تو رمضان میز پر سے ناشتے کے برتن

سمیٹ رہا تھا اور اماں بیگم کمر پر ہاتھ رکھے کسی دلدغہ کی طرح کھڑی احکام صادر کر

رہی تھیں۔

بنفشہ کو دیکھتے ہی ان کے ماتھے کی سلوٹیں آپ ہی آپ دوڑ کر ہو گئیں۔

کیسی طبیعت ہے بیٹی تمہاری؟

ان کے لہجے میں ڈھیروں شہد گھل گیا۔

ٹھیک ہے اماں بیگم۔

اتنی دیر سے کیوں اٹھیں؟

انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی پشانی کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔

رات کو مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔

ہوں، اول اول۔

اماں بیگم کی لمبی سی ہوں اول اول کچھ عجیب ہی انداز کی تھی۔ بنفشہ اسے کوئی

منی نہ پہنا سکی۔

کالج دیر سے جاؤ گی ؟

جی نہیں۔ میں آن کالج نہیں جاؤں گی۔ بنفشہ کا لہجہ سہا ہوا تھا۔

دو تین روز پہلے بھی تم نے جھٹی کی تھی۔

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے کھڑی رہی۔

کیا بات ہے بیٹی، کوئی پریشانی ہو تو ہمیں بتاؤ۔ تم تو کم سہ ہو کر بیٹھ جاتی ہو
کوئی بات نہیں۔

بنفشہ کا جھکا ہوا سر اوپر نہ اٹھ سکا۔ سر اوپر اٹھاتی بھی کیسے۔ اماں بیگم اس کا
آنکھوں میں تیرے ہوئے آنسو نہ دیکھ لیتیں جو ان کے پیار بھرے دو بول سنتے ہی
کی آنکھوں میں جھپک پڑے تھے۔

مجھ سے نہ چپاؤ بیٹی۔ میں دو تین دن سے تمہیں اداس دیکھ رہی ہوں۔

اماں بیگم نے اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تو بنفشہ کا صبر و ضبط
دے گیا۔ پہلے صرف آنسو بے اور مہر سسکیاں بلند ہونے لگیں۔ اماں بیگم کے تو ہاتھ
کے ٹوٹے اڑ گئے مگر انہوں نے اس وقت کچھ پوچھا نہ سب نہ سمجھا۔ انہوں نے سو
اچھا ہے بچی رو لے، جسے کو نسا بوجھ دل پر لئے مہر رہی ہے۔

رمضانِ بمرتن باور چا غلے میں رکھ کر میز صاف کرنے آیا تو اماں بیگم نے اس
سے پانی نکلا کر بنفشہ کو پلایا۔ جس کے عطر میں مہکتے ہوئے اپنے آنچل سے اس کے
آنسو پونچھے۔ بنفشہ کی سسکیاں ذرا رکیں تو اماں بیگم نے پوچھا :

کیوں نہ دیا کرتی ہو بیٹی۔ اپنی صحت کا ستیاناس کر رکھا ہے تم نے۔

بچلی باتیں یاد آجاتی ہیں تو دل بھرتا ہے۔

بنفشہ نے کہا۔

خانک ڈالو بچیلی باتوں پر جو وقت گزر گیا اسے یاد کرنے سے فائدہ ؟

اماں بیگم کا دل ایک دم دکھ کر رہ گیا۔

تم ضرورت سے زیادہ ہی حساس اور ذہین ہو، جیسی تمہیں سب کچھ اتنی تفصیل
سے یاد ہے، ورنہ جس عمر میں تم پر یہ بتا پڑی ہے۔ اتنی عمر کے بچوں کو تو کچھ بھی
یاد نہیں رہتا۔

بنفشہ کا رونا دھونا ختم ہوا تو اماں بیگم نے رمضان کی کو اس کا ناشتہ میز پر
رکھنے کا حکم دیا۔ اپنے سامنے جٹا کر ایک ایک چیز اسے اصرار سے کھلاتی رہیں۔

ناشتے سے ناراض ہو کر بنفشہ اوپر چلی گئی۔ بچی جان اور بڑی اماں اوپر کی منزل

پر رہتی تھیں۔ باکوئی میں ”بڑبا“ ایزی چیر پر نیم دراز اخبار پڑھ رہے تھے۔ ان کے

موٹے موٹے شیشوں والی عینک پھسل کر ناک کی جھنگی پر آگئی تھی مگر وہ اس سے بے نیاز

تھوڑا سا منہ کھولے اپنی دھن میں مگن تھے۔ ”بڑبا“ کا اصلی نام فضل الرحمن تھا جسے

وادای اماں کے لاڈ پیار نے بگاڑ کر فوجو کر دیا تھا۔ بچپن سے لے کر اس عمر تک

بہن بھائی اور رشتے دار فوجو بھائی، فوجو میاں اور فوجو کتے تھے۔ اماں بیگم کے بچوں نے

اپنے آبا اماں کے منہ سے سن کر فوجو بھائی کنا شروع ہی کیا تھا کہ اماں اور وادای اماں

نے کھڑکی دی۔

خبردار فوجو بھائی کہا، بڑے آبا ہیں تمہارے۔

کافی کوشش کے بعد بچوں نے بڑے آبا کنا شروع کیا۔ مگر مہر ہوا یوں کہ جلدی

میں سے "کا حرف غائب ہو گیا اور وہ صرف "بڑا" رہ گئے۔ کوئی بڑا کتنا اور کوئی "بڑبا" کتنا۔ اماں بیگم کے بچوں کے علاوہ چھوٹے چچا اور چچا سیاں کی اولادیں بھی انہیں "بڑبا" ہی کہتی تھیں۔

"بڑبا" کو دیکھتے ہی بنفشہ کا ہاتھ سلام کے لئے اٹھ گیا۔
سلام علیکم بڑے ابا۔

پیشانی پر رکھا ہوا ہاتھ تو بڑبا کیا دیکھتے، ہاں بنفشہ کی آواز انہوں نے مزدور سن لی۔ ایک دم گڑبڑا سے گئے۔ اخبار ہاتھوں سے چھوٹتے چھوٹتے بچا۔

ہیں بھئی، اچھا، وعلیکم السلام۔

انہوں نے چہرے کے اوپر سے بنفشہ کا جائزہ لیا۔

ایں، یہ تم آج کا کچ خوشی میں نہیں گئی؟

انہوں نے پوچھا۔

بنفشہ بڑی سہجائی، اسے معلوم تھا کہ کالج سے چٹی کرنے والے اور پڑھائی سے حیا چرانے والے بڑے بڑکیوں پر وہ بہت بُری طرح ناراض ہوتے تھے۔ وہ خود کتابوں کے بڑے زبردست عاشق تھے۔ پڑھنے کا اسہن جنوں تھا۔ ان کی معلومات حیرت انگیز حد تک وسیع تھیں کسی بھی موضوع پر ان سے بحث کی جاتی، اپنی پیش ہوا اور بے انتہا معلومات کی بنا پر وہ سانسے والے شخص کو ایسی زبردست چٹنی دیتے تھے کہ بس مزا آجاتا تھا۔ بہت زیادہ پڑھ لینے کی وجہ سے وہ کافی حد تک سخی ہو گئے تھے۔ اکثر بچوں کے نام بھول جاتے تھے تشکیل کو سجاد اور شجیعہ کو بنفشہ بنا دیتے میں بڑے ماہر تھے۔ کبھی کھانا کھا کر بھول جاتے کہ کھا چکے ہیں اور کبھی بغیر کھائے یہ سوجھ

کر اطمینان سے بیٹھے رہتے کہ کھانا کھا چکے ہیں۔

بڑی اماں ان کے ہاتھوں سخت پریشان تھیں۔ بڑبھیا سے بہت خوش تھے یہ نیکو کتابوں کے معاملے میں وہ انہی کی پروردی کرتے تھے۔ ان کے دوسرے بیٹے دارم کیہ میں تھے، وہ بھی بڑے لائق نالائق تھے۔ دونوں بیٹیاں اپنے زمانہ طالب علمی ماہر سال پچھلا ریکارڈ توڑ کر نیا ریکارڈ قائم کرتی تھیں۔

شجورانی بھی پڑھتو لکھتو ہونے کے سبب ان کی سب سے چہیتی جیتتی تھیں۔
کیوں بھئی، آج تم کالج نہیں گئیں۔

جی۔ جی نہیں۔

بنفشہ نے سہمی ہوئی آواز سے کہا۔

کیوں؟

بڑے ابا کی آواز رعب دار ہو گئی۔

بنفشہ چپ رہی۔

طبیعت خراب ہے؟

جی نہیں۔

پھر کیوں نہیں گئیں۔

میری آنکھ بہت دیر سے کھلی۔

اگر رات دیر تک پڑھتے رہنے کی وجہ سے آنکھ دیر سے کھلی تو کوئی حرج نہیں

ہیں.....

بنفشہ نے ان کی اس بات کی تردید یا تصدیق نہ کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

دو تین روز پہلے شجیعہ نے بھی یہی حرکت کی تھی۔
بڑباہر پڑا۔

بنفشہ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ بڑبا اپنی سکی طبیعت کے سبب یہ بات کہہ رہی ہیں۔ وہ چاہتی تو خاموش رہ کر ان کو اس غلط فہمی میں مبتلا رہنے دیتی کہ خود اس منہیں بلکہ شجیعہ نے ہی جھٹی کی تھی لیکن وہ اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور تھی۔ آہستہ سے بولی:

بڑے آبا، اس روز بھی میں نے ہی جھٹی کی تھی۔

ایں۔ یعنی اس روز بھی تم ہی منہیں گئی تھیں!

بڑے آبا نے کافی اونچی آواز سے کہا۔

جی!

یہ کوئی بڑے فخر کی بات ہے؟

نہیں تو۔

پھر تم نے مجھے کیوں بتایا کہ اس روز کالج سے غیر حاضر ہونے والی بھی تم ہی تھیں؟

جی!!

ارے جی اور کیا اگر مجھے اسی غلط فہمی میں رہنے دیتیں تو تمہارے بٹونے میں

سے کیا خرچ ہوتا؟

بنفشہ نے ان کی اس بے سرو پا بات پر حیرانی سے منہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ بڑبا پر اس قسم کے دورے دن میں کئی بار پڑتے ہیں۔

وہ تو خاموش کھڑی بڑبا کی گود میں پڑے اخبار کی سرخی پڑھتی رہی۔
اخبار پڑھا آج کا؟

بڑبا نے اسے اخبار پر نظریں جمائے دیکھ کر پوچھا۔
جی منہیں۔

یہ لو، اخبار پڑھنے کی بھی توفیق منہیں ہوتی تم لوگوں کو۔

بڑبا نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔

میں نے اس لئے منہیں پڑھا۔ میں ابھی تھوڑی دیر بعد دادا جان کو اخبار پڑھ
رہاؤں گی نا!

اچھا، اچھا۔ پھر ٹھیک ہے۔

بڑبا نے زور زور سے سر ہلایا۔

بنفشہ نے جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بڑبا نے پھر کنگھار کر گلا
ساٹ کیا۔

کالج منہیں گئیں تو اس کا مطلب یہ منہیں کہ تم گھر میں بیٹھ کے ڈنڈے بجاتی

ہو، اپنی کتابیں لے کر یہیں آجاؤ اور پڑھو، جہاں سمجھ میں نہ آئے پوچھ لو۔

بڑبا نے بنفشہ کو بالکل اسی طرح تنبیہ کی جیسے وہ پرائمری جماعتوں میں پڑھنے
والی کوئی بچی ہو۔

بنفشہ نے ابھی کچھ کہنے کے لئے زبان کھولی ہی تھی کہ اندر سے بڑی آواز نکلی کہ
کیوں بچی کے پیچھے پڑ گئے ہیں آپ؟

بڑی آواز۔ جھٹلا کر بولیں۔

تمہارے بچوں کو عقل کی بات بتانا ہوں تو تم کہتی ہو نیچے چرتے ہیں۔

ساری عقل اپنے پاس ہی رہنے دیجئے۔

بڑی اماں نے کہا اور ہنسنے کو اٹھ کر اشارے سے وہاں سے سٹ جا کے لئے کہا۔

ہنسنے نے بھی وہاں سے سٹ جانے میں ہی عافیت سمجھی اور چپ چاپ وہاں سے کھسک گئی۔

اپنے کمرے میں آکر وہ پھر کابلی سے بستر پر دراز ہو گئی۔ نیند آنے کا تو سوال نہیں تھا۔ پہلے ہی دیر تک سوتی رہی تھی کتاب پڑھنے کا بھی بالکل موڈ نہیں تھا اور کام کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر خالی الذہن رہنے پوری کوشش کی مگر سوچوں اور خیالوں پر کس کا زور چلتا ہے۔ نہ چاہنے کے باوجود اس کے بادل ذہن کے افق پر چھا گئے۔ ہر طرف دھند لگا اور تاریکی چھا گئی۔ دھند لگوانے اس پارت کچھ چہرے جھانکنے لگے۔

مگر جس وقت سے سلیمان بھائی کا تار آیا تھا کہ وہ اگلے روز وطن واپس پہنچ رہے ہیں۔ چھوٹی چچی کی طرف والے حصے میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مارا مار صفائی ہو رہی تھی اور چچی ملازموں کو ہدایتیں دے دے کر بوکھلائے دے رہی تھیں۔ ملازم بدحواس ہو کر کچھ ایک کمرے میں بھاگتے تھے کبھی دوسرے کمرے میں۔ کبھی لان کی طرف چلا آگے تھے تو کبھی برآمدوں میں دوڑ لگاتے تھے۔ صوفیہ بیگم اپنے بھتیجا لاکرہ سببانے کی کوشش میں بالکل جڑیل بنی ہوئی تھیں۔ ان کے جھونٹے کبھر کمرہ پر آ گئے تھے۔ میک اپ ہونے کی وجہ سے وہ اور بھی بدحواس ہوئی جا رہی تھیں۔

داوی اماں بھی اپنے پوتے کی آمد کی خوشی میں ہانپتی کاہنتی کبھی چھوٹی چچی کی طرف جاتی تھیں کبھی اپنے کمرے میں دابیں آتی تھیں اور کمر کپڑے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہتی تھیں:

اے بیٹی! ذرا میری کمر تو دبا دے۔

بیٹی کو کمر دباتے ہوئے ذرا دیر بھی نہ گذرتی تھی کہ پھر لوٹ کھڑی ہوتیں:

جاؤں ذرا دیکھوں۔ خانسا ماں کیا کر رہا ہے؟

اب بیٹی لاکھ منہ کر رہی ہے کہ داوی اماں آپ کے جانے کی ضرورت نہیں ہے اور ہر بہت لوگ ہیں۔ کوئی بھی دیکھ بھال کر لے گا۔ مگر داوی اماں کو پکا یقین تھا کہ ان کے رائنڈ لگائے بغیر تو کوئی شخص تنہا بھی ادھر سے ادھر نہیں بلائے گا۔ اپنا غرارہ سنبھالے باورچی خانے میں پہنچ جاتی تھیں اور کھڑی ہو کر دیکھتی تھیں کہ طرح طرح کے کھانے پکانے والا پیشکش خانسا ماں کیا کارنامے انجام دے رہا ہے۔ اپنی طرف سے ہدایتیں دینا فرض سمجھتی تھی۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ انگریزی کھانوں کے متعلق ان کی معلومات صفر کے برابر تھیں اگر انہیں اس سلسلے میں کچھ شہ بد ہوتی تب بھی اس کا کچھ فائدہ نہ ہوتا کیونکہ چھوٹی چچی کا خانسا ماں اپنے آگے کسی کو کچھ نہیں سمجھتا تھا چھٹ سے کہہ دیتا:

اے بیگم صاحب، آپ کیا جانتی ہیں، میں نے دس برس انگریزی کی نوکری کی ہے جتنا میں جانتا ہوں اتنا آپ سب مل کر بھی نہیں جانتے۔ میں نے گھاس تھوڑی کھادی ہے۔

اور کہنے والا اپنی کچی کچی عزت کو سیٹ کر چپ چاپ وہاں سے کھسک جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا۔

اس وقت بھی داوی اماں کی شامت ہی اُٹی تھی جو وہ کھسک کھسک کر تھی چھوٹی چچی کے

بادرپے خانے میں پہنچ گئیں۔ خانساں اپرین باز سے ہونٹوں کے داہنے گوشے میں سگریٹ دبائے کوئی خاص قسم کی میٹھی ڈش تیار کرنے میں مصروف تھا جو بقل اس کے اور کوئی تیار ہی نہیں کر سکتا تھا۔

کیا کیا تیار کر لیا خانساں؟

وادمی اماں نے بادرچی خانے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

بہت کچھ تیار کر لیا بیگم صاحب۔

خانساں کا انداز فخریہ تھا۔

پھر بھی معلوم تو ہو؟

آپ کو بتانے سے کیا فائدہ۔ آپ نے تو ان چیزوں کے نام ہی نہ سنے ہوں گے۔

خانساں کی گردن برتری کے احساس سے اکڑی ہوئی تھی۔

اے ہے آخر ایسی کون سی چیزیں تیار کی ہیں تو نے جن کا میں نے.....

اگر نام سنا بھی ہوگا تو میری ہی زبان سے سنا ہوگا۔

خانساں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

ہاں، بڑی مہارت حاصل ہے نا تجھے کھانا پکانے میں۔

اور کیا بیگم صاحبہ! جب میں انگریز کے ہاں نوکری کرتا تھا تو ایک دفعہ اس کی

میم نے خوش ہو کر کہا تھا۔

آج تم نے اتنا اچھا ڈش تیار کیا ہے کہ ہمارا دل تمہارے ہاتھ کو کس

(ڈش کا) کرنا بولتا ہے۔

خانساں کی آنکھیں بھولی بسری یادوں کے ذکر پر چمک اٹھیں۔

تو تو نہ معلوم کون سی اوٹ پٹانگ باتیں کر رہے ہیں۔ میرے پتلے تو کچھ بھی نہ پڑے۔

وادمی اماں جھلا کر بولیں۔

اسی لئے تو کہہ رہا ہوں بیگم صاحب، آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجئے۔

آرام کیسے کر دوں لڑکا اتنی دور سے آ رہا ہے اور وہ بھی اتنے برسوں بعد۔ جتنے تو کیا

یہ سیدھی چیزیں بکا کر اسے کھلائے گا۔

ولایت سے آنے والے صاحب لوگ جس قسم کی چیزیں کھانا پسند کرتے ہیں میں

بکا رہا ہوں۔ اب چاہئے پان چیزوں کو اور مذہبی سیدھی کہیں یا.....

تو کیا جانے، تو کب ولایت ہو کر آیا ہے؟

وادمی اماں نے خانساں کو اس طرح گھورا جیسے ابھی کچا ہی چبا جائیں گی۔

مگر خانساں کو کونسا خاموش رہنے والوں میں سے تھا۔ وادمی اماں کی بات کا جواب

کے لئے ابھی اس نے منہ کھولا تھا کہ چھوٹی چچی کھٹ کھٹ کرتی پہنچ گئیں۔

ارے اتنی جان، آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟

وادمی اماں ابھی جواب بھی نہ دینے پائی تھیں کہ خانساں جو چھوٹی چچی کو دیکھ

اور بھی شیر ہو گیا تھا ان کے سر جو چڑھا ہوا تھا ہنس کر بولا:

مجھے ڈرکشن (ڈرائنگ) دینے کے لئے کھڑی ہیں۔

چھوٹی چچی کو اس کی بات سن کر ہنسی آگئی۔ انہوں نے زبان ہونٹوں تلے بھینچ کر

ہنسی کو ضبط کر لیا اور بولیں۔

آپ نمک نہ کیجئے اماں جان! آپ کے پوتے کے لئے سارے انتظامات ٹھیک

رہے ہیں۔

کھل کر کانوں سے جا لگیں۔

بنفشہ کو احساس ہوا کہ سلیمان بجائی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ خوبصورت نظر آ رہے تھے۔ صمت بھی بہت اچھی ہو گئی تھی۔

سلیمان بجائی قریب آئے تو بڑی دیر تک گلے ملنے، بار اور پھول پہنانے کی رسم ہوتی رہی۔ لڑکیوں کو انہوں نے ہیلو کہہ کر مخاطب کیا اور ہاتھ ملا کر بڑی گرجوخی کا اظہار کیا۔ لیکن ہر جگہ انہیں ہاتھ ملانے میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ ان کے ماموں خالہ کی لڑکیوں نے ضرور بڑی بے غیرتی سے ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیئے۔ باقی لڑکیوں نے صرف اسلام کرنے پر اکتفا کی۔ بنفشہ کو دیکھ کر وہ ضرورت سے زیادہ ہی ہنسنے لگے یوں ظاہر کرنے لگے جیسے اسے جانتے ہی نہ ہوں۔

ارے اتھی، یہ کون ہے؟

وہ بنفشہ کے قریب رک کر بولے۔

بنفشہ ہے یہ۔ بنفشہ کو مبہول کئے؟

بڑی چچی نے کہا۔

اودہ، بہت بدل گئی ہے۔

وہ مسکرائے۔

ہنہ۔ اب ایسی بھی نہیں بدل گئی ہے۔ آپ ہی مارا ترائے جا رہے ہیں۔

شجورانی کا دل جل کر رہ گیا۔

سلیمان بجائی کے آنے کے بعد کچھ دنوں تک دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔ دعوتوں

میں سلیمان بجائی کا تو بس نام ہی نام ہوتا تھا۔ ان کے ساتھ جانے والے لوگ البتہ مزے

بیٹی! ان لوگوں کا کوئی مجروسہ نہیں، ذرا آنکھ بچی اور ان لوگوں کو میکار کی سوچ دادی اماں نے خانا سماں کو گھور کر دیکھا۔

آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ ایر پورٹ بھی تو جانا ہے۔

چچی جان نے کہا۔

میں تو گھر پر ہی انتظار کروں گی اس کا، تم لوگ جاؤ۔

اچھا کپڑے تو بدل لیجئے۔

کپڑے میں ابھی بدل لوں گی، بنفشہ استری کر رہی ہے۔

بنفشہ شجیعہ وغیرہ سے کئے جلدی سے تیار ہو جائیں۔ نام بہت مقصورہ لگا

چچی جان نے اپنی رست واضح کی طرف دیکھا۔

صوفیہ سے بھی تو کہو، وہ ابھی تک سر جھاڑ منہ پہاڑ پھیر رہی ہے۔

میں اسے ہاتھ روم میں ہی چھوڑ کر آ رہی ہوں۔

چھوٹی چچی پھر کھٹ کھٹ کرتی اپنے کمرے کی طرف چلی گئیں۔

دادی اماں نے ایک نظر خانا سماں کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کے لئے ہونٹ

مگر پھر جانے کیا سوچ کر چپ رہیں اور کھسکھس کرتی باورچی خانے کے باہر چلی گئی

چھوٹی چچی کے بار بار تنبیہ کرنے پر لڑکیوں کی تیاری کہیں جا کر ختم ہوئی تو اب

خانہ سلیمان بجائی کے استقبال کے لئے ایر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ چھوٹی چچی

بجائی بہن اور ان کی اولادیں پہلے ہی موجود تھیں۔ خدا خدا کر کے جہاز نظر آیا

نے اس کی طرف توجہ شروع کر دیا۔ جہاز بمشکل تمام رکا، سیڑھی لگائی گئی، مسافروں

اترنا شروع کیا۔ جب سلیمان بجائی کی صورت نظر آئی تو چھوٹے چچا، چچی اور صوفیہ کی با

گئے۔ اپنی داوی اماں سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ بہت مہذب سنہ ان کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے، وہاں سے اٹھے تو گھر کے دو مہربان بزرگوں کو سلام کرتے ہوئے دادا جان کی طرف چلے گئے۔ دادا جان کی طبیعت پچھلے دنوں کے متاثرہ میں کافی بہتر تھی۔ آرام کی پروم دراز ریڈرز ڈائجسٹ کا تازہ شمارہ پڑھ رہے اور مطالعہ میں کچھ اس درجہ مہمک تھے کہ انہیں سلیمان بھائی کی آمد کا پتہ ہی نہ چل سکا۔ سلیمان بھائی نے سلام کیا تو وہ ایک دم چونک گئے۔

وعلیکم السلام۔ میاں! چوروں کی طرف کیوں آتے ہو؟
بہت جھلائے ہوئے لہجے میں دادا جان نے کہا۔
چوروں کی طرح؟
سلیمان بھائی مسکراتے ہوئے بولے۔

ہاں اور کیا۔ کم از کم کھانسی کھنکھار تو دیا کہ کسی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے۔

نہ بچہ کھانسی بہت اور نہ ہی میرا گلا خراب ہے۔
سلیمان بھائی ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔
ولایت سے تو لوگ مہذب ہو کر آتے ہیں مگر تم ہو کہ.....

مجھ سے کیا بد تہذیبی ہو گئی دادا جان؟
چھوڑ، میاں! کوئی اور بات کرو۔

دادا جان نے مزید جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔
آپ کی طبیعت کیسی ہے اب؟

اڑاتے تھے۔ سلیمان بھائی ایسے انگریز کے بچے بن کر آئے تھے کہ برائے نام ننگ مرزا کا کھانا بھی زبان پر نہیں رکھ سکتے تھے اور تو اور ہندوستانی کھانوں کے نام بھی بھلا گئے تھے یا پھر مارے اتراہٹ کے اپنے آپ میں نہیں رہتے تھے۔

دعوتوں کے سلسلے سے فرصت ملی تو انہیں گھر کے لوگوں کی طرف توجہ دینے کا بھی خیال آیا لیکن زیادہ ان کی ماموں زاد اور خالہ زاد بہنیں ہی کمبلیوں کی طرح ان کی جان سے چبٹی رہتی تھیں۔ جب دیکھو ان کے گھر پر ڈیرا جارہا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کلب جا رہی ہیں، کبھی کچر دیکھنے جا رہی ہیں اور سرٹکی اپنے آپ کو کیل کانٹوں سے لیس کرنے میں گفتگو صرف کر دیتی تھی۔ ہر ایک کو یہی ڈرتا تھا کہ کہیں دوسری کا داؤ نہ چل جائے۔

اس روز سلیمان بھائی کا پروگرام تو کلب جانے کا تھا۔ لیکن عین وقت پران کی اتنی کے چند در در پار کے امیر و کبیر رشتے داروں کی آمد کی خبر نے کھنڈٹ ڈال دی۔ سلیمان بھائی اپنا پروگرام کسی صورت بھی کینسل کرنے پر راضی نہ تھے، مگر جتنی بڑے راز دارانہ انداز میں انہیں تنبیہ کرتے ہوئے کہا:

آج کلب مت جاؤ، تمہارا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔

اور کچھ دیر بعد جب سلیمان بھائی نے ان امیر و کبیر رشتے داروں کی انتہائی نفیضانہ لڑکیوں کو دیکھا تو وہ اپنی جتنی کے دل کا حال جان گئے۔ جتنی کے وہ رشتے دار آئے تو آکے چپک ہی گئے جیسے صوفوں میں گوند لگا ہو رکھا۔ اپنی لیا، باتیں بھی ہو گئیں پھر بھی جے بیٹھے ہیں۔ سلیمان بھائی کچھ دیر بیٹھے صوفیہ سے گپیں ہانکتے رہے۔ ماموں اور خالہ کی لڑکیاں شام کو ہی جا چکی تھیں پھر جانے کیا سوچ کر شہزادانی والے حصے کی طرف چلے

تمہیں کیسی نظر آتی ہے ؟

دادا جان نے اٹا اٹنی سے سوال کر دیا۔

مجھے تو اچھی خاصی نظر آتی ہے۔

ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے لیکن.....

لیکن۔؟ سلیمان بھائی نے پوچھا۔

سارے گھروالوں کی تو ایک ہی صلاح ہے۔

میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

سلیمان بھائی نے کہا۔

سب تو یہی سمجھتے ہیں کہ میں بہت زیادہ بیمار ہوں۔ یوں نہ اٹھو۔ یوں نہ بیٹھو۔

باہر نہ نکلو ہوا لگ جائے گی۔ یہ نہ کھاؤ، وہ نہ پیو۔! ارے میں کہتا ہوں لالچ لاؤ۔

یہ سب بے کار باتیں ہیں دادا جان۔ اس طرح تو آدمی اپنے آپکو اور بھی زیادہ۔

محسوس کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ خوب گھوما پھرا کر بیٹے اور جودل چاہے کھایا کیجے

سلیمان بھائی نے اپنا قطعی فیصلہ صادر کر دیا۔

ایک تمہارے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ باقی سب لوگ تو اپنے آپ کو بہت مظلوم

سمجھتے ہیں۔

چیچ، چیچ، واقعی بہت زیادتی کر رہے ہیں یہ سب لوگ آپ کے ساتھ۔

سلیمان بھائی نے انوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اور سب سے بڑی ڈاکٹرنی تو ہماری بھادوح بنی ہوئی ہیں۔

کون دادی جان !

ہاں اور کیا۔ سمجھتی ہیں ان سے بڑا ڈاکٹر تو پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہر وقت بہہ بہہ

نک کے موضوع پر سیکور دیا کرتی ہیں۔

سلیمان بھائی ان کی اس بات پر ایک دم مہنس پڑے تو دادا جان کو غصہ آ گیا۔

بہنہ کیوں ہو میاں، میں کوئی لطیفہ سن رہا ہوں۔

سلیمان بھائی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ منہ بھینچے اپنی مسکراہٹ کو

نے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر تھوڑی دیر بولے:

اگر آپ پسند فرمائیں تو آپ کا کھانا اپنے خالنا ماں سے مجھوا دیا کروں ؟

ارے میاں بس رہنے ہی دو، تمہارے یہاں جو کچھ بکتا ہے، مجھے اچھی طرح

م ہے۔

کوئی قابل اعتراض چیز تو نہیں بکتی ہمارے یہاں۔

سلیمان بھائی پھر مسکرائے۔

تمہاری اماں بہن کے جسموں میں تو فرنگوں کی روح سمائی ہوئی ہے اور تمہارے

ن تو یہ سنا ہے کہ.....

دادا جان ایک سیکنڈ کے لئے دُکے۔

کیا سنا ہے ؟

سلیمان بھائی تجسس کا اظہار کیا۔

تم تو بالکل ہی انگریز کے بچے بن کر آئے ہو ولایت سے۔

دادا جان نے کہا۔

سلیمان بھائی پڑے زور سے ہنسنے۔

اُس بھی کمال کرتے ہیں دادا جان ۔
ادھر سے کمال بھی میں ہی کرتا ہوں ۔

دادا جان نے جھجھلا کر دوبارہ ڈائجسٹ کھول لیا۔ سلیمان بھائی نے بھی باز مومنوع بدل دیا۔

کونسا مضمون پڑھ رہے ہیں ؟

پڑھنا پڑھنا کیا ہے میاں۔ بس وقت گزاری کرتے ہیں۔

دادا جان کے لہجے میں سخت بیزاری تھی۔

وہ سلیمان بھائی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ دادا جان ہمیشہ سے کتابوں کے کیرے ہیں۔ اس عمر میں بھی کتابیں چاٹنے میں مشغور تھے۔

سلیمان بھائی نے جب دیکھا کہ دادا جان اب بات کرنے کے موڈ میں نہیں ؛ وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئے۔

کمرے سے باہر نکلتے ہی ہوا کا ایک جھونکا آیا اور رات کی رانی کی ابیلی سی ؛ ان کے دماغ تک کو متحرک گئی۔ لان میں بالکل سناٹا تھا اور مدھم سی تارکیاں برآمدہ لائٹ کسی نے بجھا دی تھی۔ چمکتے ہوئے چاند کی سی روشنی تھی جو درختوں کے گھنے چھن چھن کر سبز گھاس پر کبھر رہی تھی۔ بڑبھٹا کے کمرے میں حسب معمول اندھیرا کے باہر درپے سے ٹیک لگائے کوئی کھڑا تھا۔ کون تھا اتنی دور سے وہ اندازہ بس ایک سایہ سا نظر آ رہا تھا لیکن اتنا ضرور پتہ چل رہا تھا کہ سایہ مردانہ نہیں ؛ دھیرے دھیرے ٹپٹے ہوئے قریب پہنچ گئے۔ وہ بنفسہ تھی۔ چپ چاپ سر جھکا تھی۔ انجان سی سوچوں میں گم۔ اس نے بڑے اچھے کپڑے پہن رکھے تھے، معلوم

سی قریب میں شرکت کر کے آئی تھی ورنہ اس وقت کرن لگا دوپٹہ اوڑھنے کا کیا تک غامض ہلکا ہلکا زلزلہ بھی تھا۔

وہ حسین نہیں تھی، خوب صورت بھی نہیں تھی۔ نہ اس کا رنگ سرخ و سفید تھا نہ لستوان تھی اور نہ آنکھیں بہت بڑی بڑی۔ لیکن پھر بھی وہ اچھی لگتی تھی۔ ایک بار دیکھنے کے بعد اسے نہ صرف دوبارہ بلکہ بار بار دیکھنے کو دل چاہتا تھا۔ دیکھنے والوں کے دل کے نہال خالوں میں یہ جذبہ بیدار ہوتا کہ چپکے سے من مندر کے دروازوں کو داکر کے سے اونچے سے استھان پر بٹھا دیں۔ اس پر پیار و محبت اور عقیدت کے اتنے پھول راتنی کایاں بچھا کر کریں کہ اس کا وجود ان کلیوں اور پھولوں کے ڈھیر میں چھپ کر رہ جائے۔

سلیمان بھائی قریب پہنچے تو وہ ایک دم چھوٹک گئی مارے گھبراہٹ کے وہ انہیں سلام بھی نہ کر سکی۔

یہاں کیسے کھڑی ہو بنفسہ ؟

سلیمان بھائی نے پوچھا۔

جی۔ بس۔ ایسے ہی۔

کس کا انتظار کر رہی تھیں ؟

سلیمان بھائی نے مسک کر پوچھا۔

انتظار۔ نہیں تو۔ میں کس کا انتظار کروں گی ؟

سلیمان بھائی نے اس جملے نے اسے اور پریشان کر دیا۔

کس کا انتظار۔ یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔

سلیمان بھائی محو حیرت بنے، ایک سرشاری کے عالم میں۔
 ایکٹ خودی کے عالم میں۔
 ہلکیں چھپکائے بنا۔
 اسے دیکھتے رہے۔ اسے ٹکتے رہے۔

بنفشہ سر جھکائے سلیمان بھائی کے جملے پر غور کرنے لگی۔
 رات کے پہلے پہر کی خاموشی۔
 ہواؤں کے دوش پر اڑتے ہوئے بادلوں کے آوارہ ٹکڑے۔
 دھیرے دھیرے جھومتے ہوئے۔
 سرسراتے ہوئے درخت۔
 مات کی رانی اور چنبیلی کی ابیلی سی خوشبویشی۔
 چھپاکی شاخوں کے درمیان سے مسکرا کر جھانکتا ہوا چاند۔

اور

نیم تاریک برآمدے میں بنفشہ کا وجود۔
 فیروز میزنگ کے کرن لگے ڈوہٹے کے باسے میں بچکتا ہوا اس
 سوگوار سا چہرہ۔
 لرزتی ہوئی پلکیں۔

کانپتے ہوئے ہونٹوں کے گوشے۔
 سلیمان بھائی کو ایسا لگا جیسے — جیسے ان کے دل کو کچھ ہو گیا ہو
 بے شمار لڑکیاں، حسین اور پیاری پیاری جواب تک ان کی نظر سے گزرا
 جن کے ساتھ انہوں نے زمانہ طالب علمی میں اور بعد میں یورپ کی سہرا
 ہوئے اپنے وقت کے بہت سے لمحات گزارے تھے۔ ان کے ذہن
 محو ہو گئیں سب کا حسن بنفشہ کے سوگوار حسن کے سلسلے سے نظر آیا۔ انہوں
 یا۔ وہ اب تک دوسری لڑکیوں کے ساتھ وقت نہانے کرتے رہے ہیں۔

ہنفسہ نے ان کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔

سلیمان بھائی نے دوبارہ پکارا۔

”ہنفسہ!“

”جی۔ سلیمان بھائی! آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟“

ہنفسہ نے انتہائی سادگی سے پوچھا۔

”ہاں!“

”کہئیے!“

”تم تم بہت اچھی لگ رہی ہو۔“

سلیمان بھائی کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

”جی؟“

ہنفسہ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

”تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟“

سلیمان بھائی کو اس کے سہمے ہوئے اور متعجب انداز پر ہنسی آگئی۔

”وہ دراصل بات یہ ہے سلیمان بھائی کہ اس وقت میں نے بڑے اچھے کپڑے

پن رکھے ہیں نا، اور پھر شعیبہ نے میرا میک اپ بھی کیا تھا۔“

ہنفسہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

سلیمان بھائی نے سوچا۔

کتنی حیرت کی بات ہے کہ اس لڑکی کو اپنی تعریف سن کر ذرا بھی خوشی نہیں

دئی بلکہ اس نے تو اٹھا اپنے کپڑوں اور زیور کا محتاج بنا دیا ہے اپنے حسن کو اور نہ

سلیمان بھائی معجرت بنے ایک سرشاری کے عالم میں، ایک بے

عالم میں پکیں بھپکائے بنا اسے دیکھتے رہے، اسے نکتے رہے۔ اور ہنفسہ ان

گاہ شوق کی گرمی سے کچھ سہمی ہوئی،

کچھ گہرائی ہوئی،

سر جھکانے کھڑی رہی،

چپ چاپ

خاموش

اور لمبے بڑی آہستگی سے سرک کر پیچھے دھندکوں میں گم ہوتے رہے۔

پھر سلیمان بھائی نے بہت آہستگی سے کہا۔

”ہنفسہ۔“

لوکیوں کا تو یہ عالم ہوتا ہے کہ اپنی تعریف سن کر اور زیادہ لہانے، شرمانے اور دکھانے لگتی ہیں۔

سلیمان بھائی کچھ اور کہنے ہی والے تھے کہ انہیں اپنے پیچھے قدموں کی سائی موی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا تو شجورانی چلی آ رہی تھیں۔ انہوں نے بھی زوردار کیڑے پہن رکھے تھے۔

”آخر آج تم لوگ کہاں گئی تھیں جو زرق برق لباسوں میں ملبوس نظر آ رہے؟“

سلیمان بھائی نے شجورانی سے پوچھا۔

”دادی اماں کی ایک ملنے والی ہیں، ان کی نواسی کی منگنی تھی۔“

”اچھا!“

سلیمان بھائی نے سر ہلایا۔

”جی لیکن آپ یہ فرمائیے کہ اس وقت بنفشہ باجی کے پاس کیسے کھڑا شجورانی کا انداز طنز بہ تھا۔“

”کیوں ان کے پاس کھڑا ہونا منع ہے۔“

”جی بالکل۔ مجھ سے اجازت لینی پڑتی ہے ان کے پاس کھڑے ہونے“

ان سے باتیں کرنے کے لئے۔“

”اچھا۔ وہ کیوں؟“

”اس لئے کہ یہ میری نہیں۔“

”کب سے؟“

”جس دن سے ابامیاں ان کو اس گھر میں لائے ہیں۔“

”آپ نے خود ہی حق بتا لیا؟“

”خود کیوں جتا لیا؟“

شجورانی چپک کر بولیں۔

”پھر؟“ سلیمان بھائی نے پوچھا۔

”پھر یہ کہ ابامیاں نے کہا تھا کہ یہ تمہاری سہیلی اور تمہاری بہن ہیں۔“

شجورانی نے بڑے فخر سے کہا جیسے انہیں ملکہ مندر کی بہن یا سہیلی بننے کا فخر حاصل۔

بنفشہ نے ان دونوں کو بحث میں مصروف دیکھا تو خاموشی سے کھسک جانے میں

نیت سمجھی۔ ابھی اس نے جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ گیٹ پر بڑھتی نظر آئے

بہن کی طرف سے شجورانی نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد بڑھتی

رہ گئی۔ سلیمان بھائی نے ان سے ہاتھ ملانے میں بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ بنفشہ

نے دیکھا کہ بڑھتی اس کی طرف بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

وہ ہلکی سی شجورانی کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا کر اندر چلی گئی۔

تیز چلنے والی دھوپ سے بھری دوپہر میں جب کالج سے گھر جانے کا وقت آیا تو

شجورانی کو جانے کیا سوچھی۔ بنفشہ کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں:

”کیا خیال ہے بنفشہ باجی۔ بڑے ماموں کے گھر چلیں؟“

”بڑے ماموں کے گھر، اور اس وقت؟“

بنفشہ کچھ حیران ہو کر بولی۔

”ہاں تو کیا ہوا؟“

”اُسی تیز دھوپ ہے اور گرمی....“

”دھوپ اور گرمی تو ہوتی ہی رہتی ہے، اس کی وجہ سے کام غھوڑی رگ جاتا

۔“

شجورانی نے بنفشہ کی بات کاٹی۔

”مگر شبنم! اماں بیگم سے تو پوچھا ہی نہیں۔“

بنفشہ نے کہا۔

”اماں بیگم سے جان بوجھ کر نہیں پوچھا، وہ کون سی اجازت دے دیتی۔“

شجورانی کچھ جڑ کر بولیں۔

”لیکن اگر ان کو پتہ چل گیا تو بہت ناراض ہوں گی۔“

بنفشہ نے سہمی ہوئی کبوتری کی طرح شجورانی کی طرف دیکھا۔

”ہم کچی گولیاں تو کھیلے نہیں ہیں، اماں بیگم کو پتہ ہی نہیں چلنے دیں گے

شجورانی مسکرائیں۔

”نہیں بھئی مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”بنفشہ نے صاف صاف کہہ دیا۔

”اگر یوں ڈرتی رہیں تو دنیا میں کبھی کامیاب نہ ہو سکیں گی۔“

شجورانی نے بہت بہادر بن کر کہا۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ انھیں بھی بہد

یر اور نڈر۔

بنفشہ نے بہت ٹال مٹول کی، طرح طرح کے جیلے بہانے تراشے، لیکن شج

وزیر دستوں کی ایک زبردست تھیں۔ ان کے آگے کسی کی دال نہیں لگتی تھی۔

سے کوئی نہیں جیت سکتا تھا۔

بنفشہ بے چاری تو بہت کمزور سی لڑکی تھی اور بزدل بھی۔ چنانچہ کالج کے

گیٹ سے نکلتے ہی شجورانی نے رکتہ پکڑا اور رکتہ والے کو سوسائٹی چلنے کا آرڈر

دے دیا۔

رکتہ جس وقت بڑے ماموں کے گھر کے سامنے رکا تو بڑی ممانی دوپہر کا کھانا کھا

کر ناراض ہوئی تھیں۔ ہاتھ دھو کر توبہ سے پونچھ رہی تھیں۔ شمع اور روحی کھانے کی

میز پر جمی ہوئی تھیں۔ شمع بے چاری تو خیر پانچ منٹ پہلے ہی یونیورسٹی سے واپس

آئی تھی۔ کپڑے بدلے بغیر ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھ گئی تھی۔ بھوک کے مارے

اس کا برا حال تھا۔ بی۔ بی کے دو سلاٹس آخر ہوتے ہی کیا ہیں۔ وہ تو صبح ہی

آنتوں کے جانے کس گوشے میں چپک گئے تھے۔ پراٹھا کھانے کی شمع بیگم کو حادث

ہی نہیں تھی۔ عادات وادات تو خیر کیا؟ بڑی ممانی کا کہنا تھا کہ ڈاٹنگ کے

بیچے اپنی صحت کا ستیاناس کئے لے رہی تھیں۔ مکھن وہ نہیں کھاتی تھیں،

پراٹھے سے وہ دور بھاگتی تھیں۔ چربی والا گوشت انہیں پسند نہیں تھا۔ چاول کو

دیکھ کر ان کا منہ بتاتا تھا۔ بس ہر وہ چیز جس سے موٹے ہونے کا خدشہ تھا، انہیں

تقلی پسند نہیں تھی۔ انہیں اپنے جسم کا بڑا خیال رہتا تھا۔ جس کی شان میں ان کی

سہیلیاں اٹھتے بیٹھتے قصیدے پڑھتی تھیں۔ پھر مانو کو دیکھ کر بھی وہ عبرت پکڑتی تھیں

جس کا جسم کا دن بدن چھوٹا چلا جا رہا تھا۔ شمع کو پکا یقین تھا کہ بس کوئی دن ایسا

آئے ہی والا ہے جب مانو کے لئے اپنے بھاری جسم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ

لے جانا مشکل ہو جائے گا۔ اور پھر مجبوراً مانو کے ابا کو اپنی بیٹی کے لئے کمرین کا

استقام کرنا پڑے گا۔

بانو شمع کے برابر والے گھر میں رہتی تھی۔ بچپن سے دونوں ساتھ کھینتی اور سارا پڑھتی آئی تھیں۔ اب البنہ دونوں کا میدان جدا جدا ہو گیا تھا۔ بانو نے بی۔ ایڈ میں داخلے لیا تھا۔ اسے بچپن ہی سے انسانی بننے کا شوق تھا اور شمع نے یونیورسٹی میں داخلے لیا تھا۔ اس نے سوچا۔

ایم۔ اے تو خیر کرسی لوں گی۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا تو پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر لوں گی۔

اب رہ گئیں روحی بیگم، تو وہ نہ تو بیڑی تھیں اور نہ ندیری۔ لیکن ان میں با بڑی کمزوری یہ تھی کہ اگر ان کی پسند کی کوئی چیز پک جاتی تو انہیں اس بات کا بالکل پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے پیٹ میں جگہ ہے یا نہیں، پس ان کی پورا کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ چیز زیادہ سے زیادہ مقدار میں ان کے پیٹ میں ساجائے اور آج بھی بڑی ممانی سے یہی غلطی ہو گئی تھی کہ انہوں نے پالک گوشت

چاؤل اور مسور پکائے تھے۔ مینوں چیزیں ہی روحی بیگم کی پسند کی تھیں۔ اس لئے باوجود اس کے کہ وہ شمع سے بہت پہلے کھانا کھانے بیٹھی تھیں، بڑی مستقل مزاج سے میز پر ڈٹی ہوئی تھیں۔ ان کو اس بات کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی تھی کہ کھانا کھانے سے جسم پر موٹاپا چھا جائے گا اور وہ بھدی ہو جائیں گی۔ اور سچی بات تو یہ تھی کہ ان کے اوپر زیادہ کھانے یا نہ کھانے سے کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ اپنی خواہش کے مطابق ہی بھر کے، پیٹ بھر کے، بلکہ اس سے بھی زیادہ کھانا کھاتی تھیں اور عیش کرتی تھیں۔ شمع کی طرح وہ مزدورت سے زیادہ حساس بھی نہیں

تھیں کہ بات بات پر سوچنے اور کڑھنے لگ جاتیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے چہرے پر شمع کے مقابلے میں کہیں زیادہ رونق تھی۔ اب رہ گئی خوب صورتی کی بات، تو اس کا قصہ یہ تھا کہ بڑی ممانی کی اولادیں سب ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت تھیں بلکہ ان کے لئے اگر لفظ حسین استعمال کیا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑی ممانی قدرتی طور پر حسین تھیں۔ اور بڑے ماموں کو بھی خوبصورتی کے معاملے میں کچھ کم نمبر نہ ملے تھے۔ اس عمر میں بھی بڑی ممانی کے حسن کا یہ عالم تھا کہ دیکھنے والے نہ دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔ رنگ تھا جیسے مہرہ شہاب۔ آنکھ، ناک، ہونٹ، قد، جسم، بال کسی چیز کو بھی بنانے میں اللہ میلاں نے جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔ بس یوں لگتا تھا کہ ساری محنت، ساری فرصت اور ساری توجہ اللہ میلاں نے انہی پر صرف کر دی تھی۔ اتنی پیاری شکل و صورت کے ساتھ میٹھی آواز نے تو لہں سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا، تبھی بڑے ماموں ان پر دیکھ گئے۔ پھر اخلاق بھی بڑی ممانی نے ایسا پایا کہ

رکشہ جب گھر کے سامنے مڑا تو بڑی ممانی نے تولیہ اسٹینڈ پر ڈالتے ہوئے سوچا۔ دیکھو تو سہی کون ہے؟ وہ دروازے کی طرف بڑھیں تو روحی نے کہا۔

”اُمّی اپنے یہاں کون آتا ہے۔ سامنے والے گھر میں آیا ہوگا کوئی۔“
بڑی ممانی نے روحی کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور کچھ گم سم سی ہو گئیں۔ سمجھی کسی نے دروازہ کٹکھٹایا تو ان کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ یہ جانے لیں، یہ دیکھ لیں کہ کون آیا ہے۔ ان کے لئے یہی بڑی بات تھی کہ

کوئی ان کے گھر آیا ہے۔

انہوں نے دروازہ کھولا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”ارے میری بھانجیاں آئی ہیں اور تم کہتی ہو کہ اپنے یہاں کون آئے گا
بڑی ممانی نے دونوں بازو آگے پھیلائے اور بنفشہ اور شجیرہ کو ایک سا

سینے سے لگا لیا۔

ان دونوں کے سلام کی آواز اندر ہی گھٹ کر رہ گئی۔

”جیتی رہو، اللہ تمہیں خوش رکھے۔“

خوشی کے مارے بڑی ممانی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔

روحی اور شمع بھی کھانا چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

سب اس طرح خوش ہو رہی تھیں جیسے بنفشہ اور شجیرہ رانی نہ آئی ہو بلکہ عید

چاند نکل آیا ہو۔

”بڑے دنوں بعد آہیں بیٹھی۔“

بڑی ممانی نے کہا۔

”جی ہاں۔ موقع ہی نہ مل سکا۔“

شجورانی نے کچھ اس انداز سے کہا۔ جیسے پورے گھر کی ذمہ داری صرف انہا

کے نازک کندھوں پر آہڑی ہو۔

روحی اور شمع بنفشہ کے گلے کا مار بنی جا رہی تھیں۔ بنفشہ کی حالت اس وقت

بہت عجیب و غریب ہو رہی تھی۔

ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

آنکھوں میں گہری سوچیں تھیں۔

دل میں ڈر، خوف اور دوسو سے،

سہمی ہوئی، گھبرائی ہوئی

مسکرا مسکا کر ان لوگوں کی طرف دیکھ رہی تھی، لیکن زبان سے ایک لفظ نہیں

نکل رہا تھا۔

”شمع باجی! آپ پہلے انہیں ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلائیے ورنہ یہ ابھی میہوش

ہو جائیں گی۔“

شجورانی نے بنفشہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں خیریت، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

بڑی ممانی گھبرا گئیں۔

”طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے ممانی جان۔ بس یہ ضرورت سے زیادہ ہی ڈر

رہی ہیں۔“

شجورانی نے کہا۔

”کیوں؟“

بڑی ممانی نے انجان بن کر پوچھا۔ حالانکہ بنفشہ کے ڈر اور خوف کا سبب

وہ اچھی طرح جانتی تھیں۔

”اصل میں بات یہ ہے کہ ہم لوگ اماں کییم سے کہے بغیر ادھر آ گئے ہیں۔“

شجورانی نے انتہائی لاپرواہی سے کہا۔

بڑی ممانی کا کھلا ہوا چہرہ، بھگ سا لیکن وہ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولیں۔

”اجازت لے لینی چاہیے مٹی بیٹی نہیں۔“

”اجازت و اجازت لینے میں تو گھپلے بازی ہو جاتی ہے۔“

شجورانی مسکرائیں۔

”اماں بیگم یہی جواب دیتی کہ فلاں دن میں جاؤں گی۔ میرے ساتھ چلنا“

جب وہ فلاں دن آتا تو کہتیں۔ بیٹی آج تو فرصت نہیں ہے۔ پھر کسی دن چلیں

وہ اسی طرح بہلاتی پھسلاتی رہتی ہیں ہم لوگوں کو۔“

شجورانی نے کہا۔

”اچھا چلو، تم دونوں ہاتھ دھو کر کھانا کھانے بیٹھو۔“

بڑی ممانی نے کہا۔

”علی اور عباس بھائی کے کیا حال ہیں؟“

شجورانی نے ہاتھ دھوتے ہوئے پوچھا۔

”بہت اچھے ہیں۔ علی تم دونوں کو بہت یاد کر رہا تھا۔“

شمع نے کہا۔

”عباس سبھائی ہم سے ناراض ہیں جو انہوں نے ہمیں یاد نہیں کیا۔“

شجورانی کہہ سکی گھیسٹے ہوئے بولیں۔

”یہ تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ ناراض بالکل نہیں ہیں لیکن...“

”لیکن...“

شجورانی نے استغناء میرے نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن یہ کہ زبانی طور پر تو وہ یاد نہیں کرتے، ممکن ہے دل میں یاد کرتے

ہوں۔“

روحی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”کمال کر دیا روحی نے اس وقت۔ بالکل یہی جملہ میرے ذہن میں تھا، اسی لئے

میں نے یہ بات ادھر وہی چھوڑ دی تھی کہ کہیں یہ دونوں بڑا نہ مان جائیں۔“

شمع نے کہا۔

”آپ تو کمال کرنے میں روحی سے بھی چار ہاتھ آگے بڑھ گئیں۔“

شجورانی نے کہا۔

”کیوں۔ میں نے کیا کیا؟“

شمع نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

اب ہم ایسے کہیں کے لاٹ صاحب نہیں ہیں جو اتنی اتنی سی باتوں کا برا مان

جائیں گے۔“

شجورانی نے ابرو چڑھاتے ہوئے کہا۔

نفسہ نبات کر رہی تھی اور نہ مسکرا رہی تھی۔ چپ چاپ سر جھکائے کھانا

کھانے میں مشغول تھیں۔ شجورانی نے گردن گھما کر ایک لمحے کے لیے ہزار بیٹی ہوئی

نفسہ کی طرف دیکھا اور بولیں۔

”آپ ہماری باتیں نہیں سن رہی ہیں؟“

”کون۔ میں۔“

بنفشہ ایک دم چمک پڑی۔

”جی ہاں۔ آپ ہی سے کچھ عرض کر رہی ہوں۔“

”سن رہی ہوں۔ سب کچھ سن رہی ہوں۔“

”ایسے سننے کا کیا فائدہ؟“

شجورانی نے کہا۔

”کیوں۔“

بنفشہ نے پریشان ہو کر دیکھا۔

”نہ کچھ بول رہی ہیں، نہ منہس رہی ہیں، نہ مسکرا رہی ہیں۔“

بنفشہ کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔ مگر مگر شجورانی کی طرف دیکھنے لگیں۔

”لوگنے کا گڑ لکھا کے نہ میٹھا کیجئے۔ بہت کم بولنے والے اور کچھ نہ بولنے والے

بھی زندگی میں ہمیشہ نقصان ہی اٹھاتے ہیں؟“

شجورانی کا انداز بالکل بوڑھی دادیوں کا سا تھا۔

”اچھا تو پھر فائدہ کون کون لوگ اٹھاتے ہیں؟“

روحی نے پوچھا۔

”میرسی طرح بہت زیادہ بولنے والے بھی نامہ میں نہیں رہتے۔“

شجورانی نے بڑی سی بوٹی اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”میری تو پوچھ رہی ہوں کہ پھر فائدے میں کون کون لوگ بہتے ہیں؟“

روحی نے کہا۔

”بس جو اعتدال میں رہیں، وہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سمجھیں؟“

شجورانی نے کہا۔

”ہاں۔ بالکل سمجھ گئی۔“

روحی نے اپنے خوبصورت بالوں والا سر ملا دیا۔

”اور آپ؟“

شجورانی نے بنفشہ کی طرف دیکھا۔

بنفشہ نے بھی اثبات میں سر ہلایا، لیکن اس کا دھیان شجورانی کی باتوں کی طرف

نہ تھا۔ اس کا تو مارے ڈر کے بُرا حال تھا۔ بس یہی سوچے جا رہی تھی کہ اگر اماں

بیگم کو پتہ چل گیا تو کیا ہوگا؟ سالن مرزے دار ہونے کے باوجود اس کا دل کھانا

کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ نوالے حلق میں اٹک رہے تھے۔ بار بار پانی پی رہی

تھی۔ شمع اس کے سامنے بیٹھی بڑے غور سے اس کا جائزہ لے رہے تھی۔

”تم سے تو مارے ڈر کے کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا ہے بنفشہ۔“

”جی نہیں تو۔ میں تو خوب اچھی طرح کھا رہی ہوں۔“

بنفشہ نے جلدی سے کہا۔

”پانی پیئے جا رہی ہو بس۔“

شمع مسکرائی۔

”پیس بہت لگ رہی ہے۔“

بنفشہ نے اپنی گھبراہٹ کو مسکراہٹ کی اوٹ میں چھپانے کی ناکام کوشش کی۔

”تم نے بہت غلطی کی شبیہ۔ تمہیں گھر سے اجازت لئے بغیر یہاں نہیں آنا

چاہئے تھا۔“

شمع کچھ سنجیدہ سی ہو گئی۔

”چھوٹیئے شمع آپا، آپ بھی نصیحت کرنے بیٹھ گئیں۔ اپنے ماموں۔
گھر ہی آئے ہیں۔ کوئی پکنک منانے یا فلم دیکھنے تھوڑی آئے ہیں۔“
شجورانی نے انتہائی بیزاری سے کہا۔

کھانا کھا کر وہ دونوں شمع اور رومی کے کمرے میں آ گئیں۔ یہ دونوں کامنڈا
کمرہ تھا جنہوں نے بڑی خوبصورتی سے سجایا تھا اور جس کے کونے کونے سے
لفافہ لپکتی تھی۔

چاروں مل کر بیٹھیں تو کالنج اور یونیورسٹی کے قصبے چھڑ گئے۔ ناول، افسانہ
اور فلموں پر تبصرے ہونے لگے اور لمبے اس طرح چپکے سے گزر گئے کہ احساس ہی
ہوا۔ وہ توجہ باورچی خانے کی طرف سے بہتوں کے کھڑکھڑانے کی آواز اور
پکوڑوں کی خوشبو آئی تو ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے کہا
ہوں۔ اب شام ہو گئی۔ ہنفتہ اور شجورانی کی نگاہیں اپنی رست و منح کی طرف
اٹھ گئیں۔ شمع اور رومی نے میز پر رکھی ہوئی ٹائم پیس کی طرف دیکھا۔
”رومی، باورچی خانے میں چلنا چاہیئے۔ اتنی بے چارہ سی اکیلی ہوں گی۔
شمع نے کہا۔

”ہوں۔ سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں۔“

رومی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

”صرف سوچتی رہو گی یا۔۔۔۔“

”اٹھنے کا ارادہ بھی کر رہی ہوں۔“

رومی نے جلدی سے کہا۔

”تو پھر اٹھو۔“

شمع نے کہا۔

”کیا کروں۔ سستی سوار ہے۔“

رومی نے کابل کا مظاہرہ کیا۔

”بیکار باتیں نہیں۔ جلدی اٹھو۔“

شمع نے اسے کھینچ کر بستر سے نیچے اتار دیا۔

اتفاق ہو جانے کے خیال سے ہنفتہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔
لیکن شجورانی تھیں کہ کسی طرح جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ آخر ہنفتہ
سے نرم ہو گیا۔ شجورانی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا۔

”گھر چلو شجیو! اتنی دیر ہو گئی ہے۔“

”آپ اپنے ہوش دعو اس میں تو ہیں؟“

شجورانی نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

ہنفتہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”آپ کی ناک میں پکوڑوں کی خوشبو نہیں آرہی؟“

شجورانی نے نکتوں کو سکوڑتے ہوئے پوچھا۔

”آرہی ہے۔“

ہنفتہ نے سادگی سے کہا۔

”ہم آپ کی کچھ مدد کریں۔“

شجورانی نے ڈرتے ڈرتے اپنی خدمات پیش کیں۔

”تم لوگ آرام کرو کرے میں۔ میں ابھی تھوڑی ہی دیر میں سب چیزیں تیار کئے

لیا ہوں۔“

روحی اور شمع نے پوری کوشش کی کہ امی کی بجائے وہ کام سنبھال لیں لیکن انہوں

چاروں کو باورچی خانے سے بیجھ دیا۔

شجورانی کو پھر باتیں مٹھانے کا موقع مل گیا۔ جانے کون کون سے قصے لے کر بیٹھ

بیٹیں۔ ہنسنے تو انہیں اس وقت آیا۔ جب بڑی ممانی نے چائے کے لئے آواز دی۔

چائے کی میز پر نظر پڑتے ہی شجورانی کی باہمیں کھل کر کانوں سے جا لگیں۔ صرف

رٹے ہی نہیں تھے بلکہ اور بھی کئی نمکین چیزیں تھیں جو یقیناً اسٹاک میں سے نکالی

گئی تھیں۔ اور تو اور بڑی ممانی نے آٹے کا حلوہ بھی لگے ہاتھوں تیار کر لیا تھا۔ باقی

اگ ابھی کھڑے ہی تھے کہ شجورانی کرسی پر ڈٹ گئیں اور جلدی سے ہاتھ بڑھا کر ایک

بڑا منہ میں ڈال لیا۔ ہنسنے کو بھی یہ سبھی چیزیں بہت پسند تھیں۔ لیکن اس وقت

سے پسند اور ناپسند سے زیادہ ڈر اور خوف مٹا رہا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا

تھا، اس کا رنگ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اماں بیگم کا چہرہ دنگا ہوں کے سامنے گھوم رہا تھا

بڑی ممانی نے اسے دو تین مرتبہ ٹوکا۔

”تم کچھ لے ہی نہیں رہی ہو بیٹی، ٹھیک سے کھاؤ۔“

ہر دفعہ اس کا یہی جواب ہوتا۔

”جی ٹھیک ہے، بس میں نے بہت کھا لیا۔“

”تو پھر۔ آپ چاہتی ہیں کہ پکوڑے کھائے بغیر چلے جائیں۔“

”لیکن دیر جو سو رہی ہے۔“

ہنسنے والی ہو گئی۔

”اب جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔“

ہنسنے پریشان صورت لئے اس کی طرف تکیٹ رہ گئی۔

”چلے۔ باورچی خانے میں چلیں۔“

شجورانی نے ہنسنے کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

وہ چاروں باورچی خانے میں پہنچیں تو بڑی ممانی بے چاری پسینے میں تر

پکوڑے تلنے میں مصروف تھیں۔ اتنی گرمی کے باوجود ان کے ہاتھ پر ایک بلی

تھا۔ ہونٹوں پر دم سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی جو ہنسنے اور شجورانی کو دیکھتے آ

ہو گئی۔

”آپ تو ناحق تکلیف کر رہی ہیں ممانی جان۔“

شجورانی نے ہنستے ہوئے کہا۔ حالانکہ پکوڑوں کی خوشبو ناک میں آتے ہی

کے منہ میں پانی بھرا رہا تھا۔

”تکلیف کی کیا بات ہے؟“

ممانی جان نے کہا۔

”اتنی گرمی میں آپ اتنا اہتمام کریں گی تو اسے تکلیف ہی کہا جائے گا۔“

”مگر می سردی تو ہوتی ہی رہتی ہے اس سے کام تھوڑی رکتے ہیں۔“

ممانی جان نے پکوڑے کڑا ہی سے نکالتے ہوئے کہا۔

رکشہ جیسے ہی آگے بڑھا۔ بنفشہ نے شجورانی کی طرف کچھ شاکی نظروں سے دیکھا۔
اور آہستہ سے بولی۔

”اماں، بیگم سے کیا کہو گی۔ وہ بہت ناراض ہوں گی۔“
”آپ کیوں اپنا خون سکھا رہی ہیں۔ ڈانٹ تو مجھے ہی پڑے گی۔“

شجورانی کا انداز بہت لاپرواہ تھا۔
”مگر اچھی بات نہیں ہے شجیو، جب اماں بیگم ایک بات پر ناراض ہوتی ہیں تو۔۔۔“
”ارے چھوڑیے جی، ایک ایسی ترکیب ذہن میں آئی ہے کہ اماں بیگم بالکل ناراض
نہیں ہوں گی۔“

”ترکیب۔ کیسی ترکیب؟“

بنفشہ نے پوچھا۔

”اماں بیگم سے کہوں گی کہ کل میرا ٹیسٹ ہے۔ روحی سے ایک ضروری کتاب لینی
تھی۔“

شجورانی نے بات ختم کر کے اس طرح بنفشہ کی طرف دیکھا، جیسے کوئی بہت بڑا
تیر مارا ہو۔

بنفشہ نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ چپ چاپ بیٹھی سڑک پر
آگے پیچھے بھاگتی ہوئی سوار یوں کو دیکھنے لگی۔

رکشہ جب گیٹ کے سامنے رکا تو بنفشہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔
اماں بیگم برآمدے میں ہی ٹھہرتی ہوئی نظر آگئی تھیں۔ ان کے چہرے پر جو کیفیات تھیں
وہ آنے والے طوفان کا پیش خیمہ تھیں۔ شجورانی نے بڑے اطمینان سے رکشہ کا کرایہ

ابھی وہ لوگ چلے پی کر اٹھے ہی تھے کہ بڑے ماموں جان، علی اور ع
آگئے۔ ان کو دیکھتے ہی شجورانی نے منہ میں رکھا ہوا حلوہ جلدی سے نگل کر کہا
”السلام علیکم ماموں جان اور عباس بھائی۔“
”ارے میری بھانجی آئی ہے۔ جیتی رہو۔“

ماموں جان کا تھکا ماندہ چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر
سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تو ان کی نگاہ بنفشہ پر بھی پڑی جو ایک کونے میں
تھی۔

”اپنی دوسری بھانجی کو تو ہم نے دیکھا ہی نہیں۔“

انہوں نے بنفشہ کا سر تھپتھپایا۔

”دوسری بھانجی صاحبہ نے سلام تک تو کیا نہیں۔“

علی نے بنفشہ کو چھیڑا۔

”کیا کیسے نہیں تھا، تم تو اپنے کانوں میں میل بھرے رکھتے ہو۔“

شیع نے کہا

عباس نے ڈری سہی ہوئی بنفشہ کی طرف دیکھا اور شجورانی کے سر پر چپٹ

کمرے کی طرف چلے گئے۔

چائے پی کر اٹھتے ہی بنفشہ نے پھر چلنے کی رٹ لگائی۔ بڑے ماموں نے علی

رکشہ منگوا لیا۔ شجورانی سب سے بڑے زور و دھم میں مل کر علیک سلیک کر کے

آنے کا وعدہ کر کے رکشہ میں سوار ہو گئیں۔ بنفشہ نے تو سوائے سلام کرنے کے

اماں بیگم نے کہا۔

”ہر جگہ تو پوچھے بغیر نہیں جاتی۔“ شجورانی بولیں

”توھر آج کیوں گئیں؟“

”بات یہ ہے اماں بیگم کہ کل میرا ٹیسٹ ہونے والا ہے اور روجی سے مجھے

ایک بہت ضروری کتاب لینی تھی۔

شجورانی نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”کتاب لینی تھی تو مجھے بتائیں، میں ڈرائیور کو بھیج کر کھوا لیتی۔“

اب اس بات کا شجورانی کیا جواب دیتیں۔ مگر مگر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

اماں بیگم کی ڈانٹ پھٹکار کی آواز سن کر تقریباً سبھی لوگ ان کے پاس جمع ہو

گئے تھے۔ بیچ میں اماں بیگم کسی تنہا بندرانی کی طرح گرج رہی تھیں۔ شجورانی کسی دلیر

اور عادی مجرم کی طرح کھڑی تھیں، اور بنفشہ کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کسی بچے نے

پہلا پہلا جرم کیا ہو۔ اماں بیگم تو ابھی اور پھٹکارنے کے موڈ میں تھیں لیکن داوی اماں

اور بڑی اماں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔

”چلو اپنے کمرے میں جاؤ۔ اماں بیگم گرہیں۔ ان دونوں نے جانے کے لئے

قدم اٹھایا ہی تھا کہ اماں بیگم نے کہا۔

”اور کان کھول کر سن لو۔ آئندہ ان کے گھر میرے بغیر جانے کی ضرورت نہیں۔“

”جی اچھا۔“ شجورانی نے جلدی سے کہا اور کھٹ کھٹ کرتی اپنے کمرے کی طرف

چلی گئیں۔

اماں بیگم نے ایک نظر سہی ہوئی بنفشہ کی طرف دیکھا اور اپنی آوازیں نرمی پیدا

اد کیا اور بڑی بہادر بن کر آگے بڑھیں۔ ان کے پیچھے ہی بنفشہ بھی لڑزنی کا پٹی بگڑ

میں داخل ہوئی۔ گیٹ سے برآمدے کی سیڑھیوں تک کا راستہ تو خاموشی سے طے ہوا

لیکن سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی اماں بیگم کی پاٹ دار آواز گونجی۔

”کہاں تھیں تم دونوں صبح سے؟“

بنفشہ تو خیر سر جھکائے خاموش کھڑی رہی۔ لیکن شجورانی نے بڑی دیدہ دلیری

اماں بیگم کی طرف دیکھا۔

”صبح سے دوپہر تک تو کالج میں تھے۔ پھر اس کے بعد بڑے ماموں کے گھر گئے

تھے۔“

شجورانی نے انتہائی لاپرواہی سے دیکھا۔

”بڑے ماموں جان کے گھر۔ کیوں؟“

اماں بیگم کڑک کر بولیں۔

”جی۔ وہ۔“

”شجورانی! میں دیکھتی ہوں تم بہت آزاد ہوتی جا رہی ہو۔“

اماں بیگم نے انہیں اوپر سے نیچے تک گھور کر دیکھا۔

”آزاد، نہیں تو اماں بیگم۔“

شجورانی کی آوازیں ڈر اور خوف کا شائبہ تک نہ تھا۔

”جو بات مجھے ناپسند ہے، تم وہی کرتی ہو۔“

شجورانی نے دل میں سوچا۔ اماں بیگم کہتی تو ٹھیک ہیں، لیکن اب کیا کیا جائے۔

”اور تمہاری یہ مجال کب سے ہو گئی کہ مجھ سے پوچھے بغیر ہر جگہ گھومتی پھرو۔“

کرتے ہوئے بولیں۔

”بیٹی تم اس کی باتوں میں نہ آیا کرو۔ اس کو تو عادت پڑ گئی ہے الٹی یہ حرکتیں کرنے کی۔“

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ان کی طرف دیکھ کر بنفشہ کمرے میں پہنچی تو شجورانی بستر پر اٹھی ترچھی لیٹی بڑی ڈھٹائی سے ما رہی تھیں۔ بنفشہ کو دیکھتے ہی ان کی مسکراہٹ ہنسی میں تبدیل ہو گئی۔

”ہنس کیوں رہی ہو؟“ بنفشہ کچھ رو ہانسی ہو گئی۔

”خوشی کے مارے۔“ شجورانی نے بے تکا سا جواب دیا۔

”خوشی کی کون سی بات ہے؟“ بنفشہ نے حیرت سے کہا۔

”بھئی راشن ملا ہے تو خوش نہ ہوں گے؟“ شجورانی نے ٹیکہ اٹھا کر پلسر کے نیچے رکھ لیا۔ بنفشہ ان کی طرف تنکے جا رہی تھی۔

”کافی دنوں سے میں محسوس کر رہی تھی کہ میری صحت دن بدن گرتی جا رہی ہے اب پتہ چلا کہ ڈانٹ کھائے بغیر دہلی ہو رہی تھی۔“

شجورانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اتنی ڈانٹ پڑی ہے اور پھر بھی تم مسکرا رہی ہو۔“ بنفشہ نے تھکا ہوا سے انداز میں کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”صرف ڈانٹ ہی تو پڑی ہے۔ مار پڑتی تو ذرا مزہ بھی آتا۔“

بنفشہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

”چلیے شکر ہے خدا کا۔ اس بہانے آپ مسکرائیں تو سہی۔“

شجورانی نے اطمینان سے کہا۔

بنفشہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں بند کر کے جانے کی سوچوں میں گم ہو گئی۔

طرف جی جی میں سب گھر والوں کو بڑا بھلا کہتے رہے۔ سب سے زیادہ لعنت ملائی
وہ سب سے بڑی ڈاکٹرنی "یعنی اپنی" بھانجی "محترمہ" کو کر رہے تھے۔
معمول کے مطابق فتوے جب ان کے لئے رات کا کھانا لے کر گیا تو اسے روز کے
مقابلے میں کچھ زیادہ ہی پھونکا رسنی پڑی۔ جواب میں فتوے نے اپنے بڑے بڑے اور
پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کر دی اور منڈیا بھلا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

ہاں تو اس روز رات کے کہیں دس بجے کھانے سے فراغت نصیب ہوئی تو
شجرہ دانی بغیر ادھر ادھر ٹھہل کر کھانا ہضم کرنے کے اندھے منہ لیٹر پر گر گئیں۔ اور نو
اور انہوں نے کتابیں چاٹنے کا پردہ گرام بھی ملتوی کر دیا۔ بنفشہ کچھ دیر کمرے کے درپے
میں کھڑی بالکل بے مقصد انداز سے اندھروں کو ٹھکتی رہی۔ پھر دیے پاؤں باہر نکل
آئی۔ دادا جان کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ محتاط ہو گئی۔ اسے ڈر
تھا کہ اگر کہیں دادا جان نے آہٹ سن لی اور اس کی طرف دیکھ لیا تو آج بس
نامت جی آجائے گی۔ آج نہ تو وہ انہیں سلام کرنے گئی تھی اور نہ ہی اخبار
پڑھ کر سنایا تھا۔ اسے فرصت ہی کہاں ملی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے ان کے
کمرے کے درپے کی طرف دیکھا اور جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ بڑھتی کے کمرے میں
روشنی ہو رہی تھی۔ اس نے فی الحال برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھنے کا ارادہ ترک
کر دیا اور ان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازے کا پردہ ذرا سا سرکا ہوا تھا
اس کی نگاہیں اندر کی طرف اٹھ گئیں۔ بڑھتی اپنے لیٹر پر لیٹے تھے۔ کھلی ہوئی کتاب
ان کے سینے پر لیٹی رکھی ہوئی تھی۔ انگلیوں میں سلگا ہوا سگریٹ تھامے وہ نہ جانے
کن سوچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ پیشانی پر غور و فکر کی سلوٹیں نمایاں تھیں۔

رات کا کھانا کھانے میں خاصی دیر ہو گئی۔ ہوا یوں تھا کہ بنفشہ اور شجرہ دانی
تو بڑے ماموں کے یہاں چائے کے ساتھ لوازمات سے خاطر کر داکے آئی تھیں اور
ادھر گھر میں بھی آپا جان اور چھٹ باجی نے باورچی خانے کو رونق بخشنے کی ٹھان لی
تھی۔ سہ پہر سے ہی باورچی خانے میں گھس گئی تھیں۔ پکوڑے، چنے کی وال بنانے
میں مصروف ہو گئی تھیں۔ شام کو چائے پر سبھی نے اپنا اپنا پیٹ نہیں بلکہ قاضی جی کا
سومن سمجھ کر اسے خوب بھرا ٹھونسنا تھا۔ پھر بھلا بھوک لگنے کا کیا سوال تھا۔ دادا
اماں جو ہمیشہ سے کھانے پینے کے معاملے میں بڑی محتاط تھیں اور چاہے جتنی بھی
مزے دار چیز پکے وہ ہمیشہ اپنا پیٹ سمجھ کر کھاتی تھیں۔ وہ بھی چھٹ باجی اور آپا جان
کے ہاتھوں کے پکوڑے خوب مزے لے لے کر چٹ کر گئیں اور دادا جان بے چارے
پکوڑوں کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ایک طرف تو اپنے دل کو سمجھاتے رہے اور دوسری

بنفشہ نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔ اس نے دیکھا بڑھیا ایک پتوںک پڑے۔ خیالات کا سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا۔

”کون ہے اندر آجاؤ۔“

بڑھیا کی بھاری آواز کرے کی خاموشیوں سے ٹکرائی۔ دوسرے ہی لمحے پردہ سرکا کر اندر داخل ہو گئی۔

”السلام علیکم شعیب بھائی۔“

”علیکم السلام۔“

بڑھیا کی آواز جانے لگیوں بہت مدہم تھی۔ وہ بڑے غور سے بنفشہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بنفشہ ان کی نگاہوں سے کچھ گھبرا سکی گئی۔

”آپ اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”ہوں۔“ بڑھیا صرف ہوں کر کے رہ گئی۔

”میں واپس چلی جاؤں؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”کیوں؟“ بڑھیا نے جواب دینے کے بجائے الٹا اسی سے سوال کر دیا

”شاید آپ کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے۔“

بنفشہ کچھ شرمندہ سی تھی۔

”غلط فہمی ہوئی ہے تمہیں۔“ بڑھیا مسلسل اس کے چہرے کی طرف دیکھ

رہے تھے۔

”آپ نے تو مجھ سے بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا۔“

”تسوخ رہا ہوں تمہیں کہاں بٹھاؤں؟“ بڑھیا قدرے مسکرائے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔“

بنفشہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تمہیں بٹھانے کے لئے جگہ کا انتخاب کر رہا ہوں۔“

بڑھیا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”نہ جانے آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“

”تم اتنی کم عقل کب سے ہو گئیں کہ اتنی چھوٹی سی بات تمہاری سمجھ میں نہ آسکی۔“

”اتنے بڑے کمرے میں مجھے بٹھانے کے لئے آپ کو کوئی جگہ نظر نہیں آئی؟“

”جگہ تو بہت ہے لیکن سوال ہے انتخاب کا۔“

بنفشہ نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور واپس جانے کے لئے دروازے کی طرف

بڑھ گئی۔

”بڑھیا کو احساس ہوا کہ وہ ناراض ہو کر جا رہی ہے۔“

”دیکھو یہ غلط بات ہے۔ تم مذاق کی باتوں کا بھی بُرا مان جاتی ہو۔“

بڑھیا نے اس کا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش کی اور کتاب سرمانے رکھ کر لستر

سے نیچے اتر آئے۔

بنفشہ دروازے سے باہر نکلی تو بڑھیا کی رعب دار آواز گونجی۔

”واپس آؤ بنفشہ۔“

بنفشہ کے بڑھتے قدم رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ بڑھیا دروازے کے

قریب پہنچ چکے تھے۔ وہ بے اختیار کچلے کچلے ہوئے اور کرسی و تپکے کے تشریب

گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے معنی خیز انداز میں اس کی طرف

دیکھ کر مسکرائے۔

”ایک بات کہوں؟“

”کہئے۔“

”مگر پھر سوچتا ہوں نہ کہوں۔“

”کیوں۔“

”کہیں تم ناراض نہ ہو جاؤ؟“

”تا راض کرنے والی بات ہی نہ کہئے۔“

بڑھتیانے ایک لمحے کی طرف اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہتے کہتے ڈگ گئے۔

بنفشہ جسم سوال بنی ان کی طرف تکیے جا رہی تھی۔ مگر جب کئی لمحے گزر گئے اور بڑھتی

ناموش ہی رہے تو وہ پوچھ بیٹھی۔

”آپ کیا کہنے والے تھے؟“

”کچھ نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“

”ابھی وہ بات کہنے کا وقت نہیں آیا۔“

”آج تو آپ ممتوں میں باتیں کر رہے ہیں۔“

بنفشہ بیگم، اکب دم ہی مجھے احساس ہوا کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس کے لئے

ابھی مناسب وقت نہیں آیا۔

بڑھتیانے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ بنفشہ سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ دیر وہ

چپ چاپ بیٹھی زمین کو گھورتی رہی پھر بغیر کچھ کہے اٹھ کر چلی گئی۔ بڑھتیانے اسے نہیں

روکا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹپک کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور لمحے خاموشی سے گزرنے لگے۔

”مزاج کیسے ہیں؟“ وہ قدرے آگے کوچھک کر بولے۔

”ٹھیک ہیں۔“

”رہتی کہاں ہو آج کل، تمہارے ورشن ہی نہیں ہوتے۔“

”یہیں رہتی ہوں، آپ خود ہی اتنی دیر سے واپس آئے ہیں۔“

”منا ہے آج تمہیں اور شجیعہ کو بڑی زوردار ڈانٹ پڑی ہے؟“ بڑھتیانے

”آپ سے کس نے کہا۔“

”بس۔ اڑتی اڑتی بہت کم بھی پہنچ گئی یہ خبر!“

”مجھے تو نہیں ڈانٹا اماں بیگم نے۔“

”اچھا اسی لئے افسردہ ہو۔“

”بے چاری شجیعہ کو ڈانٹ پڑ گئی نا۔“ بنفشہ نے سچ مچ افسردہ ہو کر کہا۔

”حالانکہ اسے بہکانے والی تم ہی ہوگی۔“

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو خود ہی....“

”کم تم بھی نہیں ہو۔“

”میں بھلا کیا کرتی ہوں۔“

بنفشہ نے حیران ہو کر بڑھتیانے کی طرف دیکھا۔ بڑھتیانے کا موڈ آج واقعی حیران

ان کے اوپر ایسا موڈ بہت کم طاری ہوتا تھا۔ درنہ جب دیکھو سنجیدگی طاری

ہے۔

بڑھتیانے کچھ دیر بیٹھے اس کی حیرانی اور پریشانی سے مغلوط ہوتے رہے

سوچ کر بولے۔

بڑھینا کے کمرے سے نکل کر بنفشہ نے سوچا۔ وہ کیا کرے، کہاں جائے۔ فی الحال اپنے کمرے میں جانے کا اس کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ کیونکہ نہ تو اسے آری ہی تھی اور نہ اس کا موڈ بڑھنے کا تھا۔ اس کی نگاہیں چھٹ باجی اور آچا جان کے کی طرف اٹھ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا کہ وہ ان کے کمرے میں چلی جائے ویران کے ساتھ ہی تین کر کے دل بہلائے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنا ارادہ دیا۔ اس کے دل نے کہا۔

”تہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ تم دوسروں کو بور کر دو۔“

اس نے ہوا میں اٹا ہوا اپنا گلابی آنچل سنبھالا اور برآمدے کی سیڑھیوں بیٹھ گئی۔ اور بڑی سنجیدگی سے بڑے ماموں جان کے گھر کے ساتھ اماں بیگم کے قفا کے بارے میں سوچنے لگی۔

کس قدر سرد مہری کا بڑا ذرا کرتی ہیں اماں بیگم ان لوگوں کے ساتھ۔

پہلے پہل جب وہ اس گھر میں آئی تھی اور اسے اصل حقیقت کا علم نہیں تھا وہ بہت حیرانی سے ان سب باتوں کو دیکھتی تھی۔ وہ تو بعد میں جب شجورانی نے تو اسے معلوم ہوا کہ اماں بیگم اور بڑے ماموں جان کے تعلقات اس وقت سے بنا ہیں جب نانی اماں مرحومہ زندہ تھیں۔ کیونکہ بڑے ماموں جان نے نہ صرف یہ کہ ان کی چہیتی بھانجی کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اپنی پسند کی شادی کا وہ بھی شہید گھرانے میں۔ ظاہر ہے کہ شادی میں کسی نے شرکت نہیں کی۔ بڑے ماموں جان اپنے چند دوستوں کی ہمراہی میں ٹرنگ ٹوں کرتے سسرال جا پہنچے اور الگ گھر رہنے لگے۔ اس واقعے کے کچھ ہی عرصہ بعد نانی اماں بہت بیمار پڑیں۔ بڑے ماموں

ڈرتے ڈرتے ان سے ملنے گئے تو نانی اماں نے انہیں گکے سے تو ضرور لگا لیا مگر ساتھ ہی ایک فرمائش بھی کر دی کہ اپنی بیوی کو طلاق نامہ تھا کہ ان کی چہیتی بھانجی سے شادی کر لیں۔ بڑے ماموں جان نے اس ظلم و ستم کو کسی طرح گوارا نہ کیا اور واپس چلے آئے۔ اس کے دو ہی مہینے بعد نانی اماں کا انتقال ہو گیا۔ اماں بیگم نانی اماں کی بے وقت موت کا زہر دار بڑے ماموں کو ٹھہراتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ماموں جان نے انہیں جو ذہنی اذیت دی اس کی وجہ سے نانی اماں کی صحت روز بروز گرتی گئی۔

مگر شجورانی کے نزدیک اماں بیگم کی یہ بات بالکل فضول تھی۔ نانی اماں اللہ میاں کے گھر سے اپنی اتنی عمر لکھو اگر آئی تھیں۔ تو کوئی کیا کر سکتا تھا۔ بڑے ماموں جان بچارے تو خواہ مخواہ ہی پھنس گئے تھے۔ ورنہ سبھی سی بات تو یہ تھی کہ موت اپنے مقررہ وقت پر آئی ہی تھی۔ یہ بات نہ ہوتی تو کوئی اور ہو جاتی۔

بنفشہ بیگم بھی شجورانی کی ہم خیال تھیں۔ اور تو اور اماں بیگم کے سوچنے کا انداز بھی بالکل ان دونوں کا سا تھا۔ انہی کے کہنے سننے پر تو بعد میں اماں بیگم کے دماغ کی چول ذرا ٹھیک ہوئی۔ عید بقرعید اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر ان لوگوں کو بلایا جانے لگا اور ان کے یہاں تقریبوں میں شرکت کی جانے لگی۔ ورنہ اماں بیگم نے تو ان بچاروں کو دودھ کی کھی کی طرح نکال کر پھینک دیا تھا۔

ادھر اماں بیگم کا حال یہ تھا اور دوسری طرف ”بیٹی صاحبہ“ کی یہ کیفیت کہ دم دینے دیتی تھیں ان لوگوں پر۔ ان کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ منتقل بڑے ماموں جان کے گھر جا کر رہنے لگیں۔ ان لوگوں کی تعریفیں کرتے شجورانی کی زبان بھی نہیں تھکتی تھی۔ چھٹ باجی اور آچا جان کو بھی اماں بیگم کے یہ طور طریقے ایک آنکھ نہیں بھالتے تھے۔ وہ

”رورہی ہو؟“ انہوں نے پوچھا
 ”نہیں تو،“ بنفشہ نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا۔
 ”پھر اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟“
 ”پھر کیا کروں؟“

”کیوں، کوئی کام نہیں ہے؟“
 ”پڑھنے کا مود نہیں، نیند کا دور تک پتہ نہیں اور اس وقت ایسا کوئی نہیں
 بس ہے میں بات کر سکوں۔“

بنفشہ کا لہجہ آتا تھا کھکا سا تھا کہ بڑھچکا اس پر بے پناہ ترس آیا۔ لیکن انہوں نے
 ہوا جاکر گریں نے اس وقت ذرا بھی ہمدردی ظاہر کی تو وہ ٹپ ٹپ آنسو بہانے بیٹھ جائے گی۔
 انہوں نے اپنا لہجہ بدستور قائم رکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں کوئی شخص اس قابل نظر نہیں آتا جو تم سے بات کر سکے؟“
 ”شاید میں ہی کسی کے قابل نہیں۔“ بنفشہ نے کہا۔

”میرے کمرے سے چل کیوں آئیں؟“
 بنفشہ نے شکایت آمیز نظروں سے ان کی طرف دیکھا، کچھ کہنے کے لئے اس
 کے لب ہلے۔ مگر وہ جانے کیا سوچ کر خاموش رہی۔

”کچھ عرض بھی تو کیجئے مگر مہر کہ بس....“

”چلی نہ آتی تو کیا کرتی، آپ نے لفٹ ہی نہیں دی۔“

بنفشہ نے کہا اور بڑھچکا کے ہمدردی ظاہر نہ کرنے کے باوجود
 ہلکی گئیں۔

دونوں دل سے یہ چاہتی تھیں کہ بڑے ماموں جان کے گھر خوب آنا جانا ہو، مگر
 شجورانی کی طرح نہ تو نیند نظر آتھیں، اور نہ ہی ان کی جیسی ہمت تھی ان دونوں پر
 بنفشہ کو کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں بیٹھی ہے اور کتنی دیر سے بیٹھی ہے۔
 بس سوچے جا رہی تھی، بڑے ماموں جان اور عہدہ جانی کے بارے میں اور انا
 کے بارے میں۔ تو جب بڑھچکا کو نیند نے ستایا اور وہ بتی بند کرنے کے
 سے اپنے بستر سے اٹھ کر کتاب میز پر رکھتے ہوئے ان کی نگاہ درتکچے سے اٹھ
 گئی اور انہوں نے بنفشہ کو برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ لیا۔ ان کے ہونٹ
 ایک ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ دو ایک منٹ وہ درتکچے میں کھڑے اس کی طرف
 رہے پھر کمرے سے باہر نکل آئے اور چپ چاپ اس کے پیچھے آکر کھڑے ہوئے
 بنفشہ اتنی بے خبر بیٹھی تھی کہ اسے پتہ ہی نہ چلا۔

”کب تک یہاں بیٹھے رہنے کا ارادہ ہے بنفشہ بیگم؟“
 بڑھچکا نے کہا۔

بنفشہ اکیدم چونک گئی۔ اس نے پلٹ کر ایک لمحے کے لئے دیکھا اور پھر
 سر جھکا لیا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔ میری بات کا کوئی جواب نہیں؟“ بڑھچکا نے رعب؟
 مگر بنفشہ پھر بھی اسی طرح بیٹھی رہی۔

انہیں خیال آیا کہیں یہ بچی رونا نہ رہی ہو۔ وقت بے وقت تنہا بیٹھ کر رو
 میں تو اسے شاید لطف آتا ہے۔ وہ اس سے قدرے فاصلے پر بیٹھ گئے اور جھکا
 کی طرف دیکھا۔

”مجھے بے وقوفی بالکل پسند نہیں۔“ بڑھیا کا اشارہ اس کے آنسوؤں کی طرف تھا۔

ہنشد نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو بڑی بے دردی سے رگڑ ڈالا۔ اور بڑھیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

”اب تو ٹھیک ہے نا۔“

بڑھیا اس کی اس حرکت پر مسکرائے۔

ہنشد اسی انداز سے ان کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

”اؤ اندر چلیں۔“ بڑھیا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہنشد نے بڑی سعادت مندی سے ان کے حکم کی تعمیل کی۔
”تاش کھیلو گی۔“

بڑھیا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں۔“ ہنشد نے کہا۔

”گیم کھیلو گی۔“

”نہیں۔“

”شطرنج کھیلو گی۔“

”جی!“

ہنشد نے ”جی“ کہنے کے ساتھ ساتھ سر جھکی لیا۔

بڑھیا نے ڈبر کھول کر شطرنج کے ممبروں کا جائزہ لیا اور ہنشد کے سامنے والی

پر بیٹھ گئے۔

ہنشد کرسی کی پشت سے سرٹکائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔
”کیا دیکھ رہی ہو؟“ بڑھیا نے مسکرا کر پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“

”تم رویا مت کرو۔“ مجھے تکلیف ہوتی ہے!“

بڑھیا کا انداز نصیحت آمیز تھا۔

”جی!“

ہنشد نے سعادت مندی سے کہا۔

بڑھیا نے اس کی طرف دیکھا اور شطرنج بورڈ میز پر پھیلا دیا۔

کہہ گئے۔ مگر انہوں نے کتاب پر سے نظر میں ہٹائے بغیر ”ہوں“ ”اچھا“ کہا مگر
 ہلکے سے لٹ سے مس نہ ہوئیں۔ پھر بغض نے بھی آکر چائے کے لئے کہا۔
 ”میری چائے کسی کے ہاتھ میں سمجھا دیجئے بغض باجی!“
 شجورانی نے بے حد التجا سے کہا۔

غرض یہ کہ چائے بھی وہیں بستر پر بیٹھے بیٹھے پی لی۔
 لیکن شام کو سب جہانوں کے جانے کے بعد شجورانی کی جو فضا مت آئی
 ہے تو سب نے بلا ملٹ تماشہ دیکھا۔

اماں بیگم اپنے کاسنی رشتی غرارے کے بھاری پانچے سنبھالے اور اپنا کاسنی
 دپڑا برقی ماتھے پر تیریاں ڈالے شجورانی کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ چند لمحے کھڑی
 شجورانی کو گھونٹی رہیں پھر کمرے میں چھا کر ان کے ہاتھ سے کتاب چھین کر میز پر پٹخ دی۔
 پہلے تو شجورانی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے، آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے
 اور غصے سے گھبرا گئیں۔ اماں بیگم کی آنکھیں آگ برسا رہی تھیں۔ ہونٹ مارے غصے
 کے کانپ رہے تھے۔

”اگر ذرا بھی شرم ہے تو جلو بھر پانی میں ڈوب مرو شجورانی۔“
 اماں بیگم غراہیں۔

”میں نے کیا کیا اماں بیگم۔“ شجورانی نے آہستہ سے کہا۔
 ”یہ بھی مجھ ہی سے پوچھتی ہو کہ میں نے کیا کیا؟“ اماں بیگم نے گھور کر کہا۔
 ”آپ کچھ بتائیں بھی تو؟“

”ہاں تم تو ننھی نادان ہو، کچھ نہیں معلوم نہیں۔ سکندرہ خالہ ڈرگ روڑے

۱۲ روز سا راون بادل چھائے رہنے کے بعد شام کو ملکی ملکی ہوا
 ہوئی تھی۔ پھر ایک دم آسمان پر سے بادل غائب ہو گئے۔ اور مطلع صاف ہو
 شجورانی نے کالج سے آنے کے بعد بڑا کمرے سے جانے کون سی کتاب پا
 لی تھی، کھانا کھانے کے بعد سے جو اس سے چپک کر بیٹھیں تو انہیں دین کا
 رہا نہ دنیا کا۔ امرتسر والی دور پار کی نانی جو رشتے میں اماں بیگم کی خالہ لگتی تھیں
 اپنی ننھی نوبلی بہو کے آئیں۔ بڑا بکے ایک پرانے دلارے دوست اغن خاں جو
 سب بڑا بکا لنگوٹیا یا رکیتے تھے آئے اور بڑی دیر تک رہے، چھٹ باجی کی دو
 سہیلیاں آئیں اور انہوں نے بڑی ہلکا ہلکا ہو ہو چپائی مگر شجورانی کے کان پر جو
 نہ رہی۔

شام کو چائے کے وقت فتو، رمضان اور شہر تین باری باری آکے چائے

آئی تھیں ملنے کے لئے، مگر تمہیں اتنی بھی توفیق نہ ہوئی کہ آکر سلام کر جاؤ۔ دران کی بہو بار بار پوچھ رہی تھیں۔ میں نے اس کو چار پانچ دفعہ بلوایا۔ کم سے کم اماں بیگم جھک کر بولیں۔

”بس اتنی سی بات، بھئی اگر میں نہیں گئی تھی تو وہ خود آکر مجھ سے بات بنانے کو کہنا پڑا کہ کالج سے آکر بہت تھک گئی تھی۔ سو رہی ہے۔“ اماں بیگم جی میں انہیں سلام بھی کر لیتی۔“ شجورانی نے دل میں سوچا۔

”افسوس! آئے، انہیں تم سلام کرنے نہیں گئیں۔“

یہ تو کوئی ایسی بات نہیں جس پر اتنی ہوشکار پڑے، اس میں کسی کا کیا ذہن تھا۔

ہے؟ گناہ ثواب جو کچھ ملنا ہو گا مجھے ہی ملے گا۔

شجورانی نے دل ہی دل میں کہا۔

”تم تو مزے میں رہتی ہو، سب مجھے ہی نام دھرتے ہیں۔ اماں بیگم نے کہا

شجورانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”کیوں مجھ کو تھکانے پر کرباندھی ہے تم نے؟“

اماں بیگم کی آواز پھر تیز ہو گئی۔

”مجھے کچھ ہوش نہیں تھا اماں بیگم، کتاب بہت دلچسپ ہے نا۔“

”یہ کتابیں تو تمہیں دو کوڑی کا نہ چھوڑیں گی۔“

اماں بیگم نے جل کر شیف میں رکھی ہوئی کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔

”اے بس ختم بھی کر دینا، اس کو کیا کہو ہو، اس پر تو کچھ اثر نہیں ہو

ہے۔“

داوی اماں کھسکھس کرتی آگے بڑھ آئیں۔

”اماں جان آپ کو کیا بتاؤں، مجھے کتنی شرمندگی ہوئی ہے آج، بیپاری

میں اسی لئے تم سے کہہ رہی تھی کہ صرف پانچ منٹ کے لئے اماں بیگم کے پاس

ہوؤں مگر...

”ارے چھوٹیے ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟“

شجورانی تو چکنا گھر اٹھیں۔

”رکھا کیسے نہیں، خواہ مخواہ ڈانٹ پڑ گئی سب کے سامنے۔“

بنفشہ نے افسوس سے کہا۔

”کوئی حرج نہیں ہے، سب گھر کے ہی لوگ تھے۔“

شجورانی نے کہا۔

”تہیں تو شوق ہے ڈانٹ کھانے کا۔“

بنفشہ نے کہا۔

”آپ کس چکر میں پڑ گئی ہیں، لائیے میری کتاب اٹھا دیجیئے“

شجورانی نے لاپرواہی سے کہا۔

بنفشہ نے کتاب میز پر سے اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دی۔

”اماں بیگم بھی عجیب ہیں بس۔“

شجورانی آپ ہی آپ بڑبڑائیں۔

بنفشہ نے استنہامیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”اتنی دلچسپ کتاب ہے، خواہ مخواہ ہی میرا وقت ضائع کیا۔“

شجورانی نے کتاب کھولتے ہوئے کہا۔

بنفشہ نے سوچا۔ اس کے پاس ٹھہرنا فضول ہے۔“

وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آئی۔ آپا جان اور چھٹ باجی مہند؟

کے قریب جانے کیا کھسک پھیر کر رہی تھیں۔ ٹرانسپیر آن تھا۔ شاید سیلوار

ہوا تھا۔ پرانا بھارتی نمونہ ہوا تھا۔ اس کے پسندیدہ گائیگ جگ موہن کی

اس گول رہی تھی۔

میری آنکھیں بنیں دیوانی

پہلے لائیں آگ، بردے میں

پھر بھر لائیں پانی !

اس نے سوچا۔

وہ ان دونوں کے پاس جا کر بیٹھے یا نہ بیٹھے، ممکن ہے وہ کوئی پرائیوٹ

بان کر رہی ہوں، ایسے میں جانا تو مناسب نہیں ہے۔ وہ ابھی شش و پنج ہی میں

تھی کہ چھٹ باجی کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ انہوں نے اشارے سے اسے بلایا۔

بنفشہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ان کے قریب پہنچ گئی۔

”بیٹو بنفشہ تمہاری پسند کا گانا ہو رہا ہے۔“

چھٹ باجی نے کہا۔

بنفشہ چلیں اتار کر نرم نرم گھاس پر بیٹھ گئی۔

”تمہارے کرتے کا گلا بہت خوب صورت کڑھا ہوا ہے۔“

آپا جان نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

”ہاں واقعی، یہ کب کاڑھا تم نے؟“

چھٹ باجی بھی اس طرف متوجہ ہو گئیں۔

”میں نے نہیں کاڑھا۔“ بنفشہ نے کہا۔

”چھٹ باجی اور آپا جان نے ایک ساتھ کہا۔

”شع آپا اپنے لئے کاڑھ رہی تھیں، مجھے پسند آیا، میں نے تعریف کی تو انہوں نے

زہد دستی مجھے دے دیا۔“

”واہ۔ تم تو خوب مزے میں رہیں۔“

”آپا جان مسکرائیں۔“

”مجھے تو بہت شرمندگی ہوئی۔“

بنفشہ خفیف سی ہو کر بولی۔

”شرمندگی کس بات کی؟“

چھٹ باجی بولیں۔

”وہ بے چاری اتنی محنت سے اپنے لئے کاڑھ رہی تھیں اور قبضہ میرا مگر“

بنفشہ مسکرائی۔

”تم نے خود تھوڑی قبضہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی مرضی سے دیا ہے۔“

چھٹ باجی نے کہا۔

”میں نے ان سے بہت کہا کہ تعریف کرنے کا یہ مقصد تھوڑی ہے۔ مگر انہ“

میری ایک نہ سنی۔ کہنے لگیں۔ اگر تم نے واپس کیا تو میں ناراض ہو جاؤں گی۔“

بنفشہ نے اپنے مخصوص لہجے میں دھیرے دھیرے کہا۔

”وہ اتنے خلوص سے دے رہی تھیں، تمہیں واپس ہی نہیں کہنا چاہیے تھا۔“

آپا جان نے کہا۔

”ہاں بیٹی سچی بات یہ ہے، بہت پر خلوص اور محبت والے لوگ ہیں۔“

نے کہا۔

”اور شمع تو مجھے بہت ہی پسند ہے، دل چاہتا ہے سجاد بھائی کے ما

کی شادی کر دوں۔“

آپا جان نے جھٹ سے رشتہ بھی جوڑ دیا۔

”ہاں۔ مگر ماں بیگم تو ان کے نام سے ہی بدکتی ہیں۔“

چھٹ باجی بولیں۔

”اماں بیگم بھی خواہ مخواہ اتنی پرانی بات کو دل میں لئے بیٹھی ہیں۔“

آپا جان نے کہا۔

”ایمان کی بات تو یہ ہے کہ ماموں جان قطعی قصور دار نہیں ہیں۔“

”ہاں اور کیا، اپنی پسند کی شادی کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔“

”ان سے کوئی بحث بھی نہیں کر سکتا۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ شیعہ سنی کا جھگڑا

درمیان میں شروع ہو جاتا ہے۔“

چھٹ باجی نے کہا۔

”حالانکہ یہ سب فضول باتیں ہیں عمارت، بھئی مسلمان تو ہیں وہ۔“

آپا جان نے کچھ چڑ کر کہا۔

بنفشہ خاموش بیٹھی ان دونوں کی بات سن رہی تھیں اور گھاس کے ننگے نوچ نوچ

کر پھینکتی جا رہی تھی۔

”تم کیوں چپ بیٹھی، تم بھی کچھ رائے دو۔“

آپا جان نے کہا۔

”میں کیا رائے دوں؟“

بنفشہ مسکرائی۔

”قبیل پسند نہیں ہیں وہ لوگ؟“

آپا جان نے پوچھا۔

”مجھے تو بہت اچھے لگتے ہیں وہ لوگ۔“

بنفشر نے سہولین سے کہا۔

اسی وقت مغرب کی آذان شروع ہو گئی۔

”چلو اٹھو عمران بیگم نماز پڑھ لو۔“

آپا جان نے سر پر اپنجل ڈالتے ہوئے کہا۔

آذان تو ہو جانے دیجئے۔

چھٹ باجی مسکرائیں اور ٹرانسٹر بند کر دیا۔

”کمرے میں جاتے جاتے آذان بھی ختم ہو جائے گی۔“ آپا جان بولیں۔

”ہاں اٹھ ہی جانا چاہیئے، ورنہ دادی اماں اپنے قاصد دوڑائیں گی۔“

چھٹ باجی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

تبھی فتوہ دانت نکوسے آگیا۔

”بی بی! بڑی بیگم صاحبہ کئے رٹی ہیں نماز پڑھ لیجئے۔“

”ہاں ہاں، جا رہے ہیں نماز پڑھنے۔“

چھٹ باجی چڑ کر بولیں۔

فتوہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔

”اس کو بھی شاید یہیں چڑانے میں خاص مزا آتا ہے، جب جانتا ہے کہ

میں تو اس کا کہنا ضروری ہے؟“

آپا جان نے جاتے ہوئے فتوہ کو گھورا۔

”تم نماز نہیں پڑھو گی؟“

چھٹ باجی نے بنفشر سے پوچھا۔

”پڑھوں گی۔“

بنفشر نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

بنفشر کمرے میں آئی تو شجرہ رانی اسی طرح کتاب پر جھکی ہوئی تھیں۔ اننا کرم انہوں

نے ضرور کیا تھا کہ اٹھ کر کمرے کی بی جلالی تھی، ورنہ اکثر تو انہیں بی جلالے کا بھی ہوش

نہیں ہوتا تھا۔

بنفشر نے وضو کر کے نماز پڑھی اور باہر لان میں نکل گئی۔ دھیرے دھیرے ٹہلتی

ہوئی وہ پھل پھل ٹٹ نکل گئی۔ جہاں مالی اور دوسرے ملازموں کے کوارٹر تھے۔ مالی اپنے

کوارٹر کے باہر پنگڑی ڈالے بیٹھا تھرتی رہا تھا۔ اس کی بیوی رسی پڑھنے پر پڑے

آدھ رہی تھی۔ اندر جانے جاتے اس نے اپنی بیٹیا چمن کو پکارا۔ مگر چمن بیٹیا ایک اس کی

آواز کیسے ہاتی۔ وہ تو دادا جان کے کمرے کے سامنے والے جاسن کے درخت کے

نیچے بیٹھ جانے کون سا کھیل کھیل رہی تھی۔ مالی نے اپنے منہ سے حقے کی لے الگ کر کے

آواز نکالی۔

”اوجھن بیٹا! تمہری اماں بلاوت ہیں۔“

دو تین آوازوں کے بعد چمن دوڑتی بھاگتی آئی۔ سر میں منوں خاک دھول

بھری پڑی تھی۔ گدے پر اور چمکے کپڑے۔

یہ بات نہیں تھی کہ اس کی ماں اسے صاف ستھرا نہیں رکھتی تھی۔ ماں بیچاری

”دو انہیں پی اس نے؟“

ڈاکٹر کی دو اد کو مو پھک ہی نہ آوت ہے۔ حکیم جی کا جو ساندہ بیٹی ہے۔
”جوشاندہ تو بہت فائدہ مند سوتا ہے۔ وادی اماں بھی زکام کھانسی میں جوشاندہ
ی استعمال کرتی ہیں۔“ بنفشہ نے کہا

اتنے میں کمالو کی بیوی اندر سے نکل آئی اور اس سے بیٹھنے کے لئے اصرار کرنے لگی۔
اسی وقت رضانی، جو شاید بنفشہ ہی کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا ادھر آگیا۔

”بی بی آپ کو سلیمان میاں پوچھ رہے تھے۔“

”اچھا، کیوں؟“

”یہ ترپتہ نہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟“

”آپ تو بڑی بیگم کے پاس بیٹھے ہیں۔“

بنفشہ رضانی کے ساتھ وادی اماں کے کمرے کی طرف چل دی۔ مگر ان کے

لہے تک پہنچنے سے پہلے ہی سلیمان بھائی سے اس کی مدھیٹر ہو گئی۔ وہ ڈرائنگ
رک کے سامنے والی دایدری سے گزر رہے تھے، اسے دیکھ کر رک گئے۔

”سلام علیکم سلیمان بھائی۔“ بنفشہ نے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“

سلیمان بھائی مجسم شوق بنے اسے دیکھنے لگے۔

”آپ مجھے پوچھ رہے تھے۔“

بنفشہ ان کی نگاہوں کے انداز سے گھبرا گئی۔

تو اسے بنا سجا کر کھنا چاہتی تھی۔ کبھی نہلا رہی ہے، کبھی کپڑے دھو رہی ہے
کو شاید گندے اور غلیظ رہنے میں ہی مزہ آتا تھا، ادھر کپڑے بدلے اور ادھر
گندے کر لئے۔ لاپرواہی نے اسے بہت بگاڑ دیا تھا۔ مالی کی چھ اولادوں میں
وہی بچی تھی۔ وہ بھی منتوں اور مرادوں کے بعد اس لئے مال باپ اسے بہتیلی کا؟
کر رکھتے تھے۔

اس مالی کو آئے ہوئے کچھ زیادہ حصہ نہیں ہوا تھا۔ مشکل سے سات
ہوئے ہوں گے۔ پچھلا مالی، جس کی ٹیاسوس کے سر میں سے شہورانی بچپن
پکڑ پکڑ کر مارتی تھیں۔ اپنے عزیز واقارب سے ملنے کے لئے اپنے کاڈر
غریب ایسا بیمار پٹا کہ اللہ میاں کہے یہاں ہی جا پہنچا۔ بیوی اس کی چار سال
مر گئی تھی۔ اپنی بیٹی کی اس نے شادی کر دی تھی۔

بنفشہ پر نظر پڑتے ہی نئے مالی کالونے اسے سلام کیا۔

”سلام بی بی!“

”سلام علیکم مالی بابا۔“

بنفشہ نے کہا اور اس کی خیریت پوچھنے لگی۔

”بس بیٹیا، اللہ کا شکر ہے، بڑی بیگم صاب کی کم فرمائی ہے۔“

کالونے کہا۔

”تمہاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

”اوکا جنام ناجی ٹھیک ہوت ہے، بھار تو اتر گیا ہے۔“

کالونے کہا۔

”ہاں!“ سلیمان بھائی کی نگاہوں کا انداز نہیں بدلا۔

”کوئی کام ہے؟“

”نہیں، کوئی کام نہیں۔“

”پھر؟“

”بس ایسے ہی تم سے باتیں کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔“

اس کے آگے بنفشہ کیا کہتی، چپ چاپ کھڑی رہی۔

”کہہ جا رہی تھیں تم؟“

”ہیں آپ ہی کی طرف جا رہی تھی۔“

”تو پھر آؤ۔“

سلیمان بھائی نے کہا۔

”کہاں؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”باہر لان میں بیٹھتے ہیں۔“

”لان میں۔ اس وقت؟“

”کہوں۔ کیا حرج ہے؟“

”جی حرج تو کوئی نہیں، لیکن....“

بنفشہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ سلیمان بھائی سے کیسے کہتی کہ

باتوں سے ڈر لگتا ہے۔ حالانکہ وہ برسوں اس گھر میں رہتی آرہی تھی۔

سجاد بھائی اور شکیل بھائی کے ساتھ بھی تنہا بیٹھتے ہوئے جھجک

منہی۔ ہاں بڑھیا سے البتہ وہ فری تھی۔ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے

ن آتا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے۔

اس نے سلیمان بھائی کو ٹانے کی لاکھ کوشش کی لیکن وہ بھی ایک ہی مندی تھے

شران کی منہ کے آگے شکست کھا گئی۔ بھامسے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے

پناہ خورانی دادا جان کے کمرے سے نکل رہی تھی۔ بنفشہ کی جان میں جان آئی۔

انے آواز دے کر شجیعہ کو بلایا۔

”افو! شجیعہ کے بغیر آپ ایک منٹ نہیں رہ سکتیں۔“

سلیمان بھائی نے کہا۔

لیکن بنفشہ کا جواب دینے سے پہلے ہی شجیرانی ان کے قریب پہنچ گئی تھیں۔

”کیا بات ہے بنفشہ باجی“

شجیرانی نے سلیمان بھائی کو سلام کرتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی خاص بات نہیں، اگر کتاب ختم ہو گئی ہو تو ہمارے ساتھ بیٹھو۔“

بنفشہ نے سادگی سے کہا۔

ختم ہو گئی جی تو میں آپ کو یہاں نظر آ رہی ہوں۔ ورنہ میں اپنی جگہ سے بیٹنے والی تھی۔

شجیرانی نے کہا اور ترجمی لگا ہوں سے سلیمان بھائی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی

”آج کل آپ بنفشہ باجی پر بہت مہربان ہیں، خیریت تو ہے؟“

”ہم ان پرک مہربان نہیں تھے؟“

سلیمان بھائی خوشدلی سے مسکرائے۔

”لیکن میرا خیال ہے اگر آپ ان پر مہربان نہ ہی ہوں تو اچھا ہے۔“

شجر کے لیے میں بڑا گہرا طنز چھپا تھا۔

”کبھی نہیں۔“ بنفشہ نے کہا۔

”دل پاہتا ہے کب جانے کو؟“

”ہاں نہیں۔“ بنفشہ نے کچھ بے زاری سے کہا۔

”کیوں؟“

”مجھے وہاں کا ماحول پسند نہیں۔“

”تہیں وہاں کے ماحول کے متعلق کیا اندازہ ہو سکتا ہے، تم تو کبھی گئی ہی نہیں وہاں۔“

”دوسروں سے بہت کچھ سنا ہے، کتابوں میں پڑھا بھی ہے۔“

”مسنی سائی باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ لوگ تو ذرا اسی بات کو بڑھا چڑھا

ریا ہیں کرتے ہیں۔“

بنفشہ نے سلیمان بھائی کی اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

سلیمان بھائی نے محسوس کیا کہ وہ اس ذکر سے پور ہو رہی ہے تو کوئی دوسری

موضوع لگے مقصد صرف یہ تھا کہ بنفشہ زیادہ سے زیادہ دیر ان کے پاس بیٹھی رہے

لیکن باوجود کوشش کے کوئی ایسی بات ان کے ذہن میں نہیں آرہی تھی جس میں

بنفشہ کے دلچسپی لینے کا امکان تھا۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو انہوں نے بنفشہ کو اپنی طرف

پلے لی پیش کش کر دی۔ بنفشہ نے بہت ٹال مٹول کی لیکن سلیمان بھائی کچھ اس طرح

مرا کر رہے تھے کہ وہ سوائے بارمانے کے اور کچھ نہیں کر سکی۔

”میں پہلے اماں بیگم کو بتا دوں۔“

بنفشہ نے کھڑے ہونے ہوئے کہا۔

”کیوں۔ وہ منع کرتی ہیں۔“

”اب تو ہم ان پر مہربان ہو رہی چکے ہیں۔ آپ نے اپنا خیال ظاہر کرنے میں“

سلیمان بھائی نے کہا۔

شعبہ کوئی جواب دینے ہی والی تھی کہ رمضان اماں بیگم کا قاصدا سے بلانے آگے

شعبہ رانی کے اندر جاتے ہی سلیمان بھائی کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آ

انہوں نے لان چیر پر بیٹھے ہوئے بنفشہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

بنفشہ نے ایک لمحے کے لئے گھرائی ہوئی نظروں سے بڑھیا کے کمرے کی طرف

کسی سوچ میں پڑ گئی۔

”کیا سوچ رہی ہو تم، بیٹھو۔“

”کچھ نہیں۔“

بنفشہ تدریس پس دیش کے بعد ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

کچھ دیر تک فلموں، ناٹولوں اور ٹی وی کے پروگراموں پر بحث

کے بعد سلمان بھائی نے کہا۔

”تم ہماری طرف کیوں نہیں آتیں بنفشہ؟“

”جی۔ آتی تو ہوں کبھی کبھی۔“

بنفشہ نے کہا۔

”کس وقت، میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔“

بس اتفاق ہی سمجھ لیجئے کہ آپ کی موجودگی میں کبھی نہیں گئی۔“

”تم کبھی کبھی گئی ہو؟“

سلیمان بھائی کو کوئی اور بات ہی نہ سوجھی۔

”نہیں۔ منع تو نہیں کرتیں۔“

”پھر۔؟“

”بغیر کچے جانا مناسب نہیں ہے، ممکن ہے وہ کسی کام سے آوازیں
جیسی تمہاری مرضی۔“ سلیمان بھائی نے کہا۔

بنفشہ اماں بیگم کے پاس تو گئی نہیں البتہ اس نے شجیعہ کو بتا دیا۔ شجیعہ
جب وہ واپس آئی تو اس نے دیکھا کہ بڑھیا سلیمان بھائی کے پاس کھڑے
رہے ہیں۔ وہ ابھی ابھی باہر سے آئے تھے۔

”سلام علیکم شعیب بھائی۔“ بنفشہ نے کہا۔

بڑھیا نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا۔

”اچھا جناب اجازت؟“

سلیمان بھائی نے بڑھیا سے کہا۔

”اچھا۔“ بڑھیا نے کہا۔

”او بنفشہ۔“

پھر ایسا ہوا کہ سلیمان بھائی اکثر بنفشہ کو اپنے ساتھ کوٹھی کے اس حصے کی طرف
بلانے لگے۔ حمد وہ خود رہتے تھے۔ صوفیہ اور چچی جان کا سلوک پہلے بھی بنفشہ کے
اتھ کبھی برا نہیں تھا۔ لیکن اب سلیمان بھائی کو اس طرف ملنفت دیکھ کر وہ دونوں اس کے لئے
بہ زیادہ ہی ہیرا بن گئیں۔ بنفشہ پہلے تو کافی دنوں تک ان لوگوں کی طرف جاتے ہوئے
بلیق اور گہرائی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کی جھجک دور ہو گئی۔

سلیمان بھائی میں ویسے کوئی برائی نہیں تھی۔ بس ذرا کبھی کبھی شوخیں آجاتے تھے۔
اب ان کی اس عادت میں بھی بندہ بچ کی آتی جا رہی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی
بنفشہ کی دہر سے اب انہوں نے کلب جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ جس دن بنفشہ ان کے پاس
ہیں آتی تھی۔ اس دن وہ ضرور کلب چلے جاتے۔ صوفیہ اور چچی جی سلیمان بھائی کے اس

سلیمان بھائی نے بنفشہ کی طرف دیکھا جو کچھ پریشان سی نظر آ رہی تھی
کہے بغیر دو چھل قدموں سے ان کے ساتھ چل دی۔ بڑھیا پتلون کی دونوں
ہیں ہاتھ ڈالے گم سم سے کھڑے اسے سلیمان بھائی کے ساتھ ہانا ہوا دیکھ رہے
ان کی پیشانی پر غور و فکر کی سلوٹیں بہت گہری ہو گئی تھیں۔ وہ تو نہ جانے کب تک
کھڑے رہتے، لیکن بڑی اماں نے انہیں چرنگا دیا۔ جو انہیں خلعت تو
گھر میں موجود پارک چھولی نہیں سار سی تھیں۔

بدلتے ہوئے روپ کو دیکھ کر خاصی حیران تھیں۔

سلیمان بھائی کا عالم یہ تھا کہ اب انہیں بنفشہ کے علاوہ کوئی دوسری لڑکی ہی نہیں لگتی تھی۔ کبھی کبھی تو انہیں یہ احساس ہونے لگتا جیسے وہ بنفشہ کے ہی ہی نہیں لگتی۔ ان کے دل میں اس کے لئے جو جذبہ پیدا ہوا تھا اسے انہوں بہت دن پہلے ہی جھٹ سے محبت کا نام بھی دے دیا تھا۔ لیکن اس محبت کا ما اقرار کرتے ہوئے اب تک جانے وہ کیوں گھبرا رہے تھے۔ شاید بنفشہ کی سادگی، نا اور منانیت کا رعب بہت تھا ان پر۔ ورنہ وہ تو ان مردوں میں سے تھے جو پہلی ہی میں بے جھجک ہو کر کہہ دیا کرتے ہیں۔

"مس آئی کو لبہ۔"

بنفشہ کے سامنے اس جذبے کا اعتراف کرنے کے لئے اب تک انہیں کوا مناسب ہی نہ معلوم ہوا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی کہ مواقع ملے نہیں تھے۔ بہت تھے۔ اگر دوسرے لوگوں سے رائے لی جاتی تو وہ یہی کہتے کہ بھئی اس باہہ نار قلعے کا بھی نہیں۔ مگر سلیمان بھائی کو جانے کیا ہو گیا تھا۔

لیکن آخر کب تک وہ دل کی بات دل ہی میں لئے بیٹھے رہتے۔ انہوں نے اس سے صاف صاف سب کچھ کہہ دیا اور کہا بھی تو کچھ اس اندازے دل ہی نکال کر سامنے رکھ دیا۔ لیکن اتنی بات، مزو سے کہ ان کا انداز تھا بڑا خوبصورت انداز اپنایا تھا انہوں نے۔ کوئی اور لڑکی ہوتی تو ان کے اظہار محبت پر ہی مر مٹتی۔ لیکن بنفشہ بیگم تھیں کسی اور ہی طبیعت کی۔ ان کے دا میں اس قسم کی باتوں نے کبھی آدھ اپنچ کی جگہ بھی نہیں بنائی تھی۔ سلیمان بھائی

کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو وہ آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے ان کی طرف لگتی رہیں پھر آنکھوں میں آنسو چمکے، ڈب ڈب کر کے آنکھوں سے باہر نکلنے کے لئے زور آزمائی کرنے لگے اور دیکھتے ہی دیکھتے رخساروں پر پھیل پڑے۔ سلیمان بھائی نے جو یہ کیفیت دیکھی تو بے چارے زروس ہو گئے۔ چند لمحوں تک تو ان کی آواز ہی نکلی۔ جو کچھ کہتے، ابیا معلوم ہوتا تھا جیسے حلق میں گولہ چھنس گیا ہو، بڑی مشکل سے اپنی حالت پر تابو پا کر آہستہ سے کہا۔

"بنفشہ، میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی جو تم روتے لگیں۔"

بنفشہ نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بانڈو لگی سے روزنا شروع کر دیا۔ اب سلیمان بھائی کے ہونٹ بننے کی باری تھی۔ وہ اس انتظار میں غاموش بیٹھے رہے کہ اس کا روزنا دھونا ختم ہو تو وہ کوئی بات کریں۔ لیکن بنفشہ بیگم انہیں مزید کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اٹھ کر چل دیں۔ سلیمان بھائی اٹھ کر بچھے تک گئے۔ بنفشہ کو روکنے کی پوری کوشش کی مگر اس نے نہ مڑ کر دیکھا اور نہ ہی کسی بات کا جواب دیا۔ سلیمان بھائی اپنے کمرے کی طرف اس طرح چل دیئے جیسے جنازے کے ساتھ قبرستان جا رہے ہوں۔

ادھر بنفشہ بھی دباں سے اٹھ کر آنے کو تو آگئی۔ لیکن دادا جان کے کمرے سے کافی فاصلے پر، جہاں تاریکی تھی، کھڑی ہو کر سوچنے لگی کہ یہ رونی صورت لے کر کمرے میں کس طرح جاؤں۔ سب سے پہلے شمعیں سوا لوں کی بوچھاڑ کرے گی۔ کیا جواب دوں گی۔ اگر راتنے میں کسی نے دیکھ لیا تو وہ نہ صرف پوچھے گا بلکہ ہر ایک کو اطلاع بھی کرے گا۔ دادا جان اور بڑھیا کے کمروں کے پیچھے سے چھپتی چھپاتی کارڈوں

کچھ بھی نہیں، بنفشہ نے کہا۔

یہ بات تو سچی ہے کہ آپ روکر آ رہی ہیں لیکن کیوں؟ یہ آپ کو بتانا پڑے گا۔
بنفشہ نے بہت کوشش کی کہ جلدی سے کوئی بات ذہن میں آجائے، مگر دماغ کی حالت تو ویسے ہی تباہ تھی۔ سلیمان بھائی کی باتیں سن کر اور دل بھی بھرا ہوا تھا۔ شجورانی نے جب دوبارہ اور بارہ بارہ پوچھا تو اور کسی بات پر تو بس نہیں چلا، رونا شروع کر دیا۔ شجورانی کے ہاتھوں کے طریقے اذکر وہ دور لان کے دھتور میں سے کسی ایک پر جان بٹھے۔
”اُن تو کوئی غیر معمولی بات ہی ہوئی ہے۔“

انہوں نے دل میں سوچا۔

اسبے چاری بھی لگے میں باہیں ڈال رہی ہیں کبھی اپنٹے دوپٹے سے آنسو مان کر رہی ہیں کبھی کسی بہانے سے رونے کا سبب پوچھ رہی ہیں کبھی کسی بہانے سے۔ لیکن بنفشہ غریب بتائے بھی تو کیسے بتائے بات ہی ایسی تھی۔
بڑی مشکل سے کہا بھی تو اتنا۔

مجھے تنہا چھوڑ دو شیعہ۔ میرا دل بہت پریشان ہے۔

شیعہ نے بھی سوچا۔

نکس ہے تھوڑی دیر بعد خود ہی بتا دیں۔

سڑک کرتی ان کے لئے پانی لینے چلی گئیں۔ پانی لے کر آ رہی تھیں کہ رضانی سے لمبے بیٹھ ہو گئی۔

بی بی کھانا کھا لیجئے اکرم۔ رضانی نے کہا۔

اچھا۔

کی طرف نکل گئی۔ لان میں پانی دینے کے لئے باہر جوں لگا تھا اس کے قریب ہا منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ آنکھوں کو خوب اچھی طرح دھویا کہ کہیں وہ سب کا سامنے راز انشا نہ کر دیں۔ اس کے ساتھ ایک بڑی مشکل یہ بھی تھی کہ ذرا سا دروازے سے بلکہ بعض دفعہ تو صرف آنکھوں میں آنسو آجائے سے ہی آنکھیں سرخ ہو جاتی تھیں منہ دھونے کے بعد خیال آیا کہ اس طرح تو کمرے میں جا ہی نہیں سکتی۔ دروازہ کھول کر جس کو بال کی کھال نکالنے کی عادت ہے اسی بات پر پیچھے پڑ جائے گی کہ یہ بڑے منہ کیوں دھویا ہے، اور کہا سے دھویا ہے؟ قدرے پس و پیش کے بعد اس نے اپنے نئے جار جٹ کے دوپٹے سے جو آج شام پہلی ہی دفعہ اوڑھا تھا۔ کیونکہ چھدا باجی نے چار روز پہلے ہی اس کی نذر کیا تھا، منہ پونچھ لیا، پھر آہستہ قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چل دی شجورانی کمرے میں ہی موجود تھیں اور الماری کھولے دوسرے دروازے کا لچ پہن کر جانے کے لئے کپڑوں کا انتخاب کر رہی تھیں۔ قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا تو ان کی نگاہیں بنفشہ کے چہرے پر جمی ہی رہ گئیں۔ آنکھیں سرخ صورت پریشان۔ چنٹے وہ حیرت زدہ سی انہیں دیکھتی رہیں۔ پھر الماری کے پٹ کھلے چھوڑ کر ان کے قریب آ گئیں۔ بنفشہ ان کی نگاہوں کا انداز سمجھ کر اور بھی زیادہ ندوس ہو گئی، اور چہرے پر زبردستی مسکراہٹ بکھیر کر ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ مگر شجورانی ایک ہی گھاگ تھیں۔ زبردستی کی مسکراہٹ انہیں فریب نہ دے کہ ان کے دماغ میں ہنڈیا پکینے لگی۔ یہ تو سمجھ گئیں کہ دال میں کچھ کالا ہے، لیکن اصل بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکیں۔

کیا بات ہے بنفشہ باجی؟ انہوں نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ پھر لو کھلائی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

اس اثنا میں بنفشہ اپنا رونا دھونا بند کر کے کمری پر بیٹھ چکی تھی۔

شبخو رانی نے اپنے ہاتھوں میں گلاس بکریہ کر اسے پانی پلایا اور کھانا کھانے کے لئے

مجھے بالکل بھوک نہیں ہے، شہجیہ تم کھا لو۔

میں تو کھا ہی لوں گی مگر آپ بھی.....

جب مجھے بھوک لگے گی میں بھی کھا لوں گی۔

اچھا جیسی آپ کی مرضی۔

شبخو رانی نے زیادہ اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا۔

لیکن کھانے کے کمرے میں بنفشہ کی عدم موجودگی کو ہر شخص نے محسوس کیا۔

سے سوال جواب کے جانے لگے کھانے کی میز پر آج اتفاق سے بڑھتیا بھی موجود۔

انہوں نے اس کی کمی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کیا لیکن سوائے ایک بار پوچھنے کے

کچھ نہ کر سکے۔ دادی اماں کی محبت نے کچھ زیادہ ہی جوش مارا، وہ کھانا چھوڑ کر

کمرے کی طرف چل دیں۔

بنفشہ کمری چھوڑ کر پلنگ پر دراز مٹی اور ایک ٹک سارنے والی دیوار کو گورا

جار ہی مٹی سوچ سوچ کر اپنے داغ کو پریشان کئے جا رہی تھی۔ دادی اماں کو

میں داخل ہوتے دیکھ کر ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔

کیسی طبیعت ہے بیٹا؟

دادی اماں نے قریب پہنچ کر اس کی پیشانی کو چھوا۔

سر میں دودھ ہے دادی اماں۔

بنفشہ دل ہی دل میں اپنے اس جھوٹ پر ڈری بھی۔

سر میں دودھ ہے تو کوئی گولی لے کر کھا لینا تجا دے۔

اچھا بنفشہ نے دھیر سے کہا۔

گولی نکلنا اس کے لئے ویسے ہی قیامت سے کم نہ تھا پھر اچھی بھلی طبیعت میں

راس کا تصور بھی.....

گر کھانا تو کھا لو بیٹا۔

دادی اماں اپنی شفقت کے موتی لٹانے سے باز ہی نہیں آ رہی تھیں۔

بھوک نہیں لگ رہی ہے آج دوپہر میں نے کچھ زیادہ ہی کھانا کھا لیا تھا۔

ارے رہنے دو بیٹا۔ بتا تم کھاؤ ہو میں روز ہی دیکھا کروں ہوں۔

نہیں۔۔۔۔۔ آج تو سوچ پرچ میں نے زیادہ کھانا کھا لیا تھا۔

اتنی دیر تک رکھا بھوڑی ہو گا وہ کھانا۔

دادی اماں نے کہا مگر بنفشہ نے پھر انکار کر دیا۔

اچھا تو پھر میں شیراز تن کے ہاتھ دودھ بھجواتی ہوں۔ پی کر سو جانا۔

دودھ کا نام سن کر بنفشہ اور پریشان ہوئی۔ دودھ تو اسے ویسے ہی ناپسند تھا۔

میں دودھ نہیں پیوں گی دادی اماں۔ اگر بھوک لگی تو میں کھانا کھا لوں گی۔

پلو رہی سہی۔

دادی اماں راضی ہو گئیں اور جلتے جانے کہہ گئیں۔

سبا دیکھا کھائے تو میں سر درد کی گولی بھجواتی ہوں اس کے ہاتھ۔

اچھا بنفشہ نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

سجاد بھائی کرے سے چلے گئے تھوڑی سی — جو گلاس میں پانی لئے کھڑی تھیں،

لیں:

گولیاں پانی کے ساتھ کھا لیجئے، بعد میں دودھ پی لیجئے گا۔
بنفشہ نے پریشان ہو کر شجورانی کی طرف دیکھا اور دھیرے سے بولی:
وہ — شجور! بات یہ ہے کہ مجھے گولیاں کھانی ہی نہیں ہیں۔
کیوں؟

میرے سر میں بالکل درد نہیں ہے میں نے دوا دی اماں سے بونہی کہہ دیا تھا۔
اچھا تو یہ کئے!

شجورانی مسکرائیں اور گولیاں بنفشہ کے ہاتھ سے لے کر چھپا دیں۔

چھٹ باجی اور آپا جان بھی دوا دی اماں کے منہ سے یہ جملہ سن کر کہ ”بنفشہ کا جی اچھا
نہیں ہے“ اسے دیکھنے چلی آئیں۔ اپنا کھنا پڑھنا سب چھوڑ کر کافی دیر تک بیٹھی
اس سے اور شجورانی سے کہیں ہانکتی رہیں۔ ان لوگوں کو اپنے کمرے میں گئے ہوئے
ہند ہی منٹ ہوئے تھے کہ فوٹو نے آکر اطلاع دی۔

بنفشہ بی بی فوٹو شس، کو، سن، ہی کتا تھا، بڑھیا بلا رہے ہیں آپ کو۔

ان سے کہو وہ یہیں آجائیں، شجورانی نے کہا۔

فوٹو نے قدموں چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اپنے پیلیے پیلیے دانتوں کی بتیسی کھولے واپس آیا اور دروازے کے

قریب رک کر بولا:

جی وہ پھرتے ہیں کہ آپ دونوں ہی ان کے کمرے میں آجائیں۔

پھر دل میں سوچا:

چپکے سے پھینک دوں گی گولی۔ کسی کو کیا پتہ چلے گا؟

وہ پھر آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی تھوڑی دیر بعد قدموں کی آہٹ ہوئی اور
بھونک پر سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا۔ آگے آگے شجورانی اور ان کے پیچھے سجاد بھائی چلے آ رہے
سجاد بھائی نے اس کے بستر کے قریب رک کر ایک منٹ کے لئے اس کی
دیکھا اور مسکرا کر بولے:

اس طرح اٹوٹی کھوٹا لے کر نہ پڑ جایا کرو بنفشہ بیگم!

بنفشہ چپ چاپ ان کی طرف دیکھتی رہی۔

سدا گھر پریشان ہو جاتا ہے تمہارے لئے۔

انہوں نے سر درد کی دو گولیاں اس کی طرف بڑھائیں۔

اس نے گولیاں لے کر مٹھی میں دبائیں۔

مٹھی میں دبانے کے لئے تھوڑی دیر ہی نہیں کھاؤ۔

سجاد بھائی نے کہا۔

ابھی شجورانی بوا دودھ لائیں گی تو کھانوں کی گولیاں۔

بنفشہ نے پھر بھوٹ بولا حالانکہ دودھ والا مشورہ تو اس نے اسی وقت

کر دیا تھا۔

اچھا چلو یہی سہی گر کھا لینا، پھینک مت دینا۔

سجاد بھائی نے توازن راہ مذاق یہ بات کہی تھی، لیکن بنفشہ کو ایسا لگا جیسے

اس کے دل کا چور کپٹ لیا ہو۔

چلتی ہیں بنفشہ حاجی؟ شجورانی نے پوچھا۔

دادی اماں ناراض نہ ہوں!

کیوں؟

کہیں گی ویسے تو طبیعت خراب ہے مگر کہیں لڑانے پہنچ گئی۔

نہیں۔ دادی اماں کچھ نہیں گی۔

شجورانی نے بڑے یقین سے کہا۔

فتوح چپ چاپ پکڑا ان دونوں کے کسی فیصلے پر پہنچنے کا منتظر تھا۔

تم جاؤ فتو! شجورانی نے کہا۔

پھر میں ان سے کیا راج دے عرض کر دوں؟

فتو نے بڑی عاجزی سے کہا۔

کن سے کیا راج کر دوں؟ شجورانی نے کہا۔

بڑھتیے۔ فتو نے کہا۔

ان سے کچھ کہنے کی فردت نہیں ہے، ہم جاتو رہے ہیں۔

اچھا۔ فتو سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔

شجورانی بنفشہ کے ہمراہ بڑھتیے کے کمرے میں پہنچیں تو وہ دتہ کے میز پر

معلوم نہیں تاریکی میں کیا تلاش کر رہے تھے۔

خیریت تو ہے بڑھتیے، کیوں یاد فرمایا؟

شجورانی نے انہیں چونکا دیا۔

ہاں، ویسے تو سب خیریت ہی ہے، البتہ ان محترمہ کی خیریت نیک

۴۔

بڑھتیانے کہا۔

میں خود پریشان ہوں، پوچھ پوچھ کر تھک گئی، مگر یہ کچھ بتا کر ہی نہیں دیتیں۔

بتا کر ہی نہیں دیتیں۔ کیا مطلب؟

بڑھتیانے چیراں ہو کر شجورانی کی طرف دیکھا ان کے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں

ماصل بات کیا ہے۔

بنفشہ شجورانی کو اشارے سے منع ہی کرتی رہ گئی مگر انہوں نے جلدی جلدی

لیٹاپ کے، اس کے رونے دھونے کا قصہ بتا بھی دیا بنفشہ کمرے کی پشت سے

اٹے ان کی طرف دیکھتی ہی رہ گئی۔

ہوں اؤں۔

بڑھتیانے پوری بات سن کر ایک لمبی سی ہوں کی ادگری نظروں سے بنفشہ

نہ لیا۔

آپ کیا کہتی ہیں اس سلسلے میں؟

بڑھتیانے اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

جی۔

بنفشہ نے ان کی طرف دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

جی۔

بڑھتیاسل اس کے چہرے کا جائزہ لئے جا رہے تھے۔

بڑھتیانے تو جا رہی ہوں، آپ اس سے پوچھ کر ہی رہے گا۔

شجورانی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کیوں؟ تم بھی بیٹھو، بڑ بھیا نے رعب جمایا۔
مجھے اپنے کپڑوں پر استری کرنی ہے۔
صبح کر لینا۔

صبح تو میں ویسے ہی دیر سے اٹھتی ہوں۔

ٹھیک ہے، میں سمجھ لوں گا ان سے، بڑ بھیا نے کہا۔
"انی مسکراتی ہوئی چلی گئیں۔"

بل۔ اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟

بڑ بھیا اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

کچھ بھی نہیں۔

بڑے انوس کی بات ہے کہ اب تم جھوٹ بھی بولنے لگی ہو

بنفشہ نے بڑ بھیا کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہ بس ابھی رو پڑا۔

بڑ بھیا کو اس کی صورت دیکھ کر خواہ مخواہ ہی ترس آ گیا۔

شاید کوئی ایسی بات ہے جو تم بتانا نہیں چاہتیں، بڑ بھیا نے

بنفشہ نے ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے سر جھکا لیا۔

اچھا چھوڑو جانے دو، کوئی اور بات کرو۔

بڑ بھیا شاید اسے مزید لانا نہیں چاہتے تھے۔

بنفشہ نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھ کون ہو کہہ بیٹھ گئی۔

آج کل کیا مصروفیات ہیں تمہاری؟

باکرتی رہتی ہو صبح سے شام تک؟

بنفشہ نے صبح سے لے کر رات تک کی مصروفیات گنا دیں، لیکن سلیمان بھائی کے

نڈیڈیڑھ گھٹن تک باتیں کرنے کا کوئی تذکرہ نہ کیا، معلوم نہیں کیوں چاہتے ہوئے

ہاکی ہمت نہ بڑھ سکی۔

میں نے سنا ہے صوفیہ سے آج کل تمہاری بڑی گاڑھی چھن رہی ہے۔

بڑ بھیا نے بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

بنفشہ کے چہرے کا رنگ ایک دم بدل گیا۔ لیکن فورا ہی وہ اپنے آپ کو

اتے ہوئے بولی:

وہ لوگ خود ہی بلا کر لے جاتے ہیں۔

وہ لوگ کون، سلیمان؟

بڑ بھیا نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بنفشہ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

آج بھی تمہاری ملاقات ہوئی تھی سلیمان سے؟

جی، بنفشہ کی آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

کوئی جھگڑا ہو گیا اس سے؟

نہیں تو۔

پھر تم ادھر سے روتی ہوئی کیوں آئی تھیں؟

میں کب ادھر سے روتی ہوئی آئی تھی؟

سلیمان بھائی کی صحبت نے اسے جھوٹ بولنے میں خاصا مامور کر دیا تھا۔

بنفشہ ناموش کھڑی رہی۔

نہیں بتانا چاہتیں؟

نہیں!

اچھا تو بیٹو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔

بنفشہ نے حکم کی تعمیل کی۔

دیکھو بنفشہ! مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تم بہت معصوم اور بھولی ہو، میں جب

بری لڑکیوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے تعجب بھی ہوتا ہے تمہاری سادگی اور بھولپن پر

جیسی لڑکیوں کو لوگ بہت آسانی سے بے وقوف بنا سکتے ہیں۔ اس لئے میں چاہتا

ہوں کہ تم بھی قدم اٹھاؤ بہت سوچ سمجھ کر اٹھاؤ زندگی کے کسی بھی لمحے میں میں یہ نہیں

چاہتا اور سننا چاہتا کہ تم کھٹو کر کھا کر گرہ پڑی ہو جو کچھ بھی فیصلہ کرنا بہت سوچ سمجھ

کرنا۔

بڑھیا ایک سیکنڈ کے لئے رکے اور قدرے ترہم آواز سے بولے۔

زندگی میں نہیں کوئی سیکیف پہنچے، یہ بات میرے لئے بڑی اذیت ناک

بات ہوگی، کیونکہ تم مجھے بہت عزیز ہو۔ بہت عزیز ہو بنفشہ!

بنفشہ نے بڑھیا کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا:

اور آپ بھی تو مجھے بہت عزیز ہیں خبیث بھائی!

سمجھ گئی میری باتیں؟ بڑھیا مسکرائے۔

بنفشہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

تم نے بڑا تو نہیں مانا میری نصیحتوں کا؟

بنفشہ بیگم مجھ سے کوئی بات چھپانا فصول ہے۔

بڑھیا نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ بنفشہ ان کے لہجے سے دل

کانپ گئی۔ ان کی بات کا جواب تو کیا دیتی، سر جھکائے فرش کو گھورتی رہا،

میں تم سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں بڑی گہری نگاہ رکھتا ہوں ہر بات

میں نے آپ سے کب کوئی بات چھپائی۔

بنفشہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

پھر اب تم کیوں چھپا رہی ہو؟

بنفشہ سے مزید برداشت نہ ہو سکا، اپنی بے بسی پر وہ دونوں ہاتھوں میں

رو پڑی۔

یہ حماقت مجھے قطعی پسند نہیں۔

بڑھیا کا دل تو بہت دکھا اسے رفا دیکھ کر لیکن انہوں نے اپنی سنجیدگی

میں فرق نہ آنے دیا۔

کچھ دیر تک رونے کے بعد بنفشہ کا دل ڈراما کا ہوا تو وہ بغیر کچھ کے

جانے لگی۔

اس طرح نہیں جاسکتیں تم۔

بڑھیا نے اس کا راستہ روک لیا۔

میں بہت پریشان ہوں خبیث بھائی! مجھے اور تنگ نہ کیجئے۔

مجھے بتا دو اپنی پریشانی۔

بڑھیا نے اس کی طرف جھک کر بے حد نرمی سے کہا۔

نہیں۔

بس اب ساری فضول باتیں اور پریشانی خیالات نکال دو ذہن سے
سوجاؤ۔

بنفشتہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو شفیق بھائی اس کی طرف والمانہ انداز
دیکھتے ہوئے زیر لب بولے۔

معصوم بڑ کی کچھ نہیں سمجھتی کچھ نہیں جانتی۔

دوسرے روز رات کو بڑ بھیا غاصی دیو سے گھر آئے۔ بنفشتہ چھٹ باجی
اور نکیل بھیا کے ساتھ تاش کھیل رہی تھی اور شجورانی بڑ بھیا کے کمرے کے
والی سبز روش پر بڑی بے چینی سے ٹپل رہی تھیں۔ کل رات سے ہی ان کے
میں کھدبہو رہی تھی۔ مارے پریشانی کے کالج میں دل لگانے گھر آ کر کسی کام میں دل
کی پریشانی کچھ بے جا بھی نہیں تھی۔ وہ جو ہر ایک کی ہندی چند ہی کی ٹکڑی میں رہا
تھیں، اپنی بنفشتہ باجی کی طرف سے کیسے لائق ہو جاتیں؟ رات کو کچا اٹھا
سوئی تھیں کہ کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر صبح کو ہی بڑ بھیا سے ساری بات
گی لیکن بڑ بھیا اس روز دراجلدی ہی آفس چلے گئے تھے۔ دل موس کر رہ گئیں کہ
اب تو رات کو ہی موقع ملے گا اور وہ بھی جانے کے بجائے؟

ادھر کچھ بند سے بڑ بھیا ذرا جلدی گھر آ جاتے تھے۔ لیکن آج پھر لیٹ با
ہو گئے تھے، ان کے انتظار کی کوفت سے بور ہو کر انہیں اور کچھ نہ سوجھا تو بڑ
کی سیر جیوں پر بیٹھ کر اپنی بھونڈی آواز میں گنگنا شروع کر دیا لیکن پٹیا بانس ج
گنگنا نے میں بھی اتنی زور سے نکل رہی تھی کہ دادا جان کے کمرے تک جو قریب

اس کے پہنچ جانے کا امکان قوی تھا اور اس کے بعد ان کی ڈانٹ سننے کے امکانات
الہ بھی بچتے تھے اپنی آواز کو مار گھونٹے ڈال رہی تھیں، اور گانا بھی اتنا فضول تھا کہ کہیں
دادی اماں سن پائیں تو اچھی طرح خبر لیں پہلے بھی کئی دفعہ اس گانے کے پیچھے انہیں ڈانٹ
پڑ چکی تھی اس کے بول تھے ہی اتنے بے ہودہ۔

معلوم نہیں انہیں کیا حس نظر آتا تھا اس گانے میں۔ اور ایمان کی بات تو یہ تھی کہ
انہیں ڈھنگ کا کوئی گانا یاد ہی نہ تھا۔ اپنے پسندیدہ گانے کے بول وہ دن میں
ایک دفعہ نہیں بلکہ بیسیوں دفعہ گنگاتی تھیں۔ اس وقت بھی انہیں اس مشغلے میں
مصرف ہوئے صرف چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ ان کے
کان حرکتوں کے کانوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ بڑ بھیا کو گیٹ پر دیکھتے ہی وہ اٹھ کر
گھڑی ہو گئیں۔

بڑ بھیا آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے برآمدے کی سیڑ جیوں تک آئے تو
شجورانی کو وہاں کھڑے دیکھ کر ان کے ہونٹوں پر سکڑا ہٹ بکھر گئی انہیں اچھی طرح
معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں کھڑی ان کا انتظار کر رہی تھیں۔
شجورانی نے انہیں دیکھتے ہی سلام کیا۔

بڑ بھیا نے سر کے خفیہ سے اشارے سے جواب دیا۔

میں بہت دیر سے آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔

اچھا —!

معلوم ہے کیوں؟

بہت اچھی طرح معلوم ہے۔

چلوں میں آپ کے کمرے میں یا یہیں بتائیں گے؟

اسی وقت بتانا ضروری ہے؟

افوہ۔۔۔ آپ بھی کمال کرتے ہیں آپ کو اندازہ ہے کہ میں نے کل رات اس وقت تک کے یہ بے شمار گھنٹے کس طرح گزارے ہیں۔۔۔؟

بہت خوب۔

بڑھیا کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھے تو شجورانی بھی ان کے پیچھے پیچھے دم ہی چل رہی تھی۔ بڑھیا بے چارے تھکے ہارے آئے تھے نہ کپڑے بدل سکے نہ منہ دھو سکے۔ شجیہ کو ان کی اس حالت پر بھی قطعی رحم نہیں آیا جب تک الف سے ی تک پڑا داستان ان سے سن نہ لی۔ ڈٹی بیٹھی رہیں۔

ہوں تو یہ بات ہے۔

شجورانی نے بڑی بوڑھیوں کی طرح گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

جی، اور آپ کیا سمجھے بیٹی تھیں؟

مجھے بھی شبہ تھا کہ کچھ اسی قسم کا ہے، لیکن بنفشہ باجی کے رونے دھونے سے میں غصے میں پڑ گئی تھی۔

کیوں؟ بڑھیا نے پوچھا۔

یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جس پر رویا جائے، اس لئے۔

شجیہ بیگم! بنفشہ بہت معصوم اور سادہ ہے۔

ہاں، آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں۔

اس بھولی لڑکی کے دل و دماغ میں تو اس قسم کی باتوں کا کبھی گز رہی نہیں ہوا۔

بڑھیا کے لیے سے بنفشہ کے لیے پیار جھکا پڑ رہا تھا۔

آپ کو کیسے معلوم آپ سے انہوں نے کبھی کچھ کہا؟

اس کو چہرہ تو ایک صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں ہر شخص اس کے دل کی

تصویر کو واضح طور پر دیکھ سکتا ہے۔

بڑھیا کی آنکھوں میں بڑی گہری سوچیں تھیں۔

شجیہ نے ان کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا بلکہ بڑے نرم سے ان کے چہرے

کا اندازہ لینے لگی۔ شاید بڑھیا کا چہرہ بھی کوئی آئینہ ہی نظر آ رہا تھا۔ جی میں وہ ان کے دل

کی تصویر کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن ہر آئینے میں واضح اور صاف صورت نہیں دکھی

جس کی کچھ آئینے دھندے بھی تو ہوتے ہیں اور پھر بڑھیا تو بہت گہرے نئے بہت ہی گہرے

بڑھیا نے شجیہ کو وہ جملے بھی بتائے جو انہوں نے بنفشہ سے نصیحت کے طور پر کہے

تھے لیکن حرف بحرف نہیں۔

ہاں بڑھیا اللہ نہ کرے جو بنفشہ باجی زندگی میں کبھی ٹھوکر کھائیں، ان کا دل تو بہت

نازک ہے۔

ہاں بہت نازک ہے جیسے۔۔۔ جیسے کوئی آئینہ۔

بڑھیا سوچوں میں ڈوب گئے۔

شجیہ انہیں سوچوں میں ڈوبا ہوا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئی۔

کئے تھے ان کا عشق چُپا، گھٹا اور محتاط قسم کا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ کانپتے، لرزتے اور
 ہر ہر آنے قسم کے عشق سے انہیں شروع سے ہی چڑھتی اور ایمان کی بات تو یہ بھی کہ اب
 تک انہوں نے جتنی لڑکیوں سے عشق کیا تھا وہ خود بھی انہی کے ٹامپ کی تھیں۔ آزاد
 ماحول کی پروردہ لڑکیاں تھیں جو دوسری ہی ملاقات میں ”ہیلو ڈارلنگ“ کہہ کر غلط
 کرتی تھیں۔ سلیمان بھائی خود تو ایک طرف رہے ان کے باپ، ماں اور بہن بھی آزادی
 اور روشن خیالی کے معاملے میں زمانے سے ایک قدم آگے ہی چلنا پسند کرتے تھے۔ سلیمان
 بھائی تو خیر سے اتنے برسوں تک یورپ بھی رہ گئے تھے۔ برسوں پر سہاگہ نہ ہوتا تو اور کیا
 ہوتا۔ وہاں سے تو اچھے اچھے غازی اور پیریز گار بھی اپنا چولا بدل کر آتے ہیں، پھر سلیمان بھائی
 بیگم سے تو ہمیں سے آدھے مسلمان گئے تھے۔ آدھے مسلمان کی اصطلاح دادا جان ان کے لئے
 استعمال کرتے تھے، کیونکہ قرآن شریف انہوں نے ختم نہیں کیا تھا۔ نماز بھی نہیں پڑھتے تھے،
 لیکن بنفشتہ کے معاملے میں تو وہ شروع ہی سے اپنے آپ کو بہت بڑا لگدھا سمجھ رہے
 تھے۔ کس شکل سے تو بیک کے اظہار کر پائے تھے۔ وہ اپنی غیبت کا اللہ جانے کیوں اس
 کی سادگی اور معصومیت نے انہیں بجائے شیر نمانے کے جو بنا دیا تھا حالانکہ الہی صورت
 میں تو معاملہ برعکس ہی ہوا کرتا ہے۔ پھر اس کے دھن دھن سے وہ بالکل ہی ہونق
 بن کے رہ گئے تھے۔ کمزور اب تک تو یہ ہوتا آیا تھا کہ اظہار غیبت کے جواب میں جلنے
 اور ٹرانے کی ادائیں ملی تھیں، ہونٹوں پر چٹکتی ہوئی کلیاں اور رخساروں پر کھلتے ہوئے
 گلاب دیکھنے کو ملے تھے، لیکن یہاں تو لنگاہی الٹی بید رہی تھی۔
 ان کی لڑائیوں کی مینڈیں آدھ گیسٹوں کے ایک دوست نے ایک دفعہ ان کے
 معاشقوں کی تعداد گناتے ہوئے کہا تھا۔

طرف سلیمان بھائی بھی کچھ کم پریشان نہیں تھے کیونکہ اس دن کے بعد سے
 دوسری بنفشتہ ان کی طرف نہیں گئی تھی۔ پانچ چھ روز تو ہوسوی چکے تھے اس واقعے
 کو وہ خوب بلا ناعہ اپنے سب بزرگوں کو سلام کرتے آتے تھے، لیکن بنفشتہ اس وقت
 یقیناً اپنے کمرے میں چھپی رہتی ہوگی، کیونکہ ایک دن بھی تو وہ انہیں نظر نہیں آئی۔ اب
 ہر روز تو اتفاق ہونے سے رہا۔ سلیمان بھائی اپنے آپ میں اتنی ہمت ہی نہیں پارہے
 تھے کہ خود اس کے کمرے میں جا کر اس کا مزاج پوچھ سکیں۔

یہ بات نہیں تھی کہ سلیمان بھائی عشق و شوق کے معاملے میں دلوں بھینپو یا بزدلی قسم کے
 انسان تھے۔ نہیں، وہ تو بڑے ہی دیہ بکھر دیدہ ویر واقع ہوئے تھے۔ اس معاملے میں اب
 تک ڈھیروں عشق کر ڈالے تھے انہوں نے اور وہ بھی چوری پیچھے نہیں بلکہ ڈنکے کی چوٹ پر

سلیمان! تم نہ صرف ان لڑکیوں کو اور اپنے آپ کو فریب دے رہے ہو بلکہ اپنے وقت کے قیمتی لمحات بھی ضائع کر رہے ہو۔ تم کیا جالو، محبت کیا چیز ہوتی ہے؟ سلیمان بھائی نے بڑے تندہ سے اپنے دوست کی اس بات کی مخالفت کی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ محبت اسی طرح کی جاتی ہے جس طرح وہ کر رہے ہیں۔

اس پر ان کے دوست نے کہا تھا:

نہیں سلیمان! میری یہ بات یاد رکھنا، محبت کبھی زندگی میں ایسے لمحات آئیں کہ انہیں راتوں کی نیند چھوٹ جائے، دل کو کسی لمحے چین نہ آئے، دماغ کو کسی وقت سکون نہ ملے کوئی چیز بھی نہ لگے اور کسی کام میں دل نہ لگے تو سمجھ لینا کہ تمہیں صحیح معنوں میں اب محبت ہوئی ہے۔ سلیمان بھائی نے اس کی بات کا خوب مذاق اڑا دیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ سادہ باتیں سوائے شدید حافقت کے اور کچھ تھیں نہیں۔ پورا یقین تھا کہ ان کی زندگی میں ایسے لمحے کبھی نہیں آئیں گے کیونکہ اپنی فطرت اور اپنی عادت کو وہ خوب اچھی طرح سمجھتے لیکن۔۔۔ شاید وہ نہیں جانتے تھے کہ کبھی کبھی انسان بدل بھی جاتا ہے اس کی عادتوں میں تغیر بھی آجاتا ہے بعض دفعہ محض ایک چھوٹا سا حادثہ زندگی کی پوری تفسیر ہی بدل دیتا ہے جذبات احساسات، سوچیں اور خیالات سب کچھ اس ایک معمولی سے حادثے سے متاثر ہو کر اپنا انداز بدل دیتے ہیں۔ زندگی کے ایسے لمحوں میں انسان اپنے آپ کو کتنا کمزور و کتنا بے بس اور کتنا عجیب و غریب پاتا ہے؟ یہ کوئی ان کے دلوں سے بچے جن کی زندگی ایسے حادثات سے دوچار ہو چکی ہو۔

اور سلیمان بھائی کی زندگی میں وہ لمحے آچکے تھے۔ ان کا ذہن الجھ گیا تھا۔ دل جلنے کوں سے بوجھ تلے دب گیا تھا، دماغ سن ہو گیا تھا اور ان کی پریشان سوچیں اور جالو

کا طرح جھلکتی پھر رہی تھیں۔ دل سے یہ آواز آتی تھی۔ سلیمان! تم بارگئے ہو۔

سلیمان! بنفشہ تمہاری زندگی ہے۔

سلیمان! تم اس کے بغیر زندہ نہ رہ سکو گے۔

لیکن اب جب کہ بنفشہ ان کی زندگی بن چکی ہے تو خود اس کے بارے میں انہیں یہ تک نہیں معلوم تھا کہ اس کے دل کی دھڑکنیں کسے پکارتی ہیں؟ اس سے دوبارہ بات کرنے کی وہ اپنے آپ میں ہمت ہی نہیں پارہے تھے اور کسی سے کچھ کہنا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ انہی سوچوں میں دن گزر رہے تھے۔ پھر ایک روز انہیں شیعہ کا خیال آیا۔

لیکن وہ تو ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھتے ہی جلی جلی سنانے لگتی ہے شاید میرے بارے میں اس کا خیال اچھا نہ ہو یا ممکن ہے یہ عرض میرا خیال ہو، کیونکہ اس کی تو عادت ہی ایسی ہے۔

شجورانی کا خیال آتے ہی سلیمان بھائی کے دل کو قدرے اطمینان ہوا اور انہوں نے قطعی فیصلہ کر لیا کہ وہ شیعہ سے ضرور اس سلسلے میں بات کریں گے،

پھر اگلے روز شام کو حبيب وہ دادا جان کی مزاج پر سی کر کے ان کے کمرے سے نکل رہے تھے تو شجورانی درپچے میں کھڑی نظر آئی وہ اس کے کمرے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ شجورانی بڑے انداز سے سکھاتے ہوئے انہیں سلام کیا تو انہیں خیال ہوا کہ شاید بنفشہ نے اسے ساری باتیں بتا دی ہیں۔ لیکن اس وقت وہ بجائے نموس ہونے کچھ زیادہ ہی مطمئن ہوئے۔ یہ سوچ کہ کہ چلو یہ زیادہ اچھی بات ہونی ہو سکتا ہے

سلیمان بھائی نے ایک لمبی سانس لی۔
کیوں۔ کیا تکلیف ہے آپ کو؟
تکلیف؟

جی ہاں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کو نزلہ ہے، بخار ہے یا کھانسی؟
ان میں سے کوئی بات نہیں ہے۔

اب اگر ان میں سے کوئی تکلیف نہیں تو باقی بیماریوں کا نام تو میں لیٹنے سے رہی۔
کیوں۔ کیا حرج ہے؟

آپ کے نزدیک کوئی حرج ہی نہیں جناب من، اتنی خوفناک اور خطرناک بیماریاں
میں وہ۔ اگر کہیں تھی جان نے سہا تو میرے جھونٹے پکڑ کر دو ٹاپا کچے ماریں گی اور کہیں گی۔
میرے بیٹے کی جان کی دشمن! تیرے منہ میں خاک، اللہ نہ کرے جو اسے یہ بہا بیاں
بول۔

افوہ۔ تم تو انتہائی فضول قسم کی باتیں کرنے لگی ہو
سلیمان بھائی اس کی بکواس سے بور ہو گئے۔

بچے تو اسی قسم کی باتیں کرنی آتی ہیں۔

شجور نے ابرو چڑھا ہے۔

کلام کی باتیں نہیں کر سکتیں تم؟

سلیمان بھائی اپنے مطلب کی طرف آئے۔

لفظ کلام سے آپ کا کیا مطلب ہے، خدا اس کی وضاحت کر دیکھے پہلے۔

تم سکون سے کسی جگہ بیٹھو تو میں کچھ کہوں بھی۔

شجور اس معاملے میں مجھ سے بات کرنے کے لئے خود ہی ابتدا کرے۔ میں بلاوجہ تنہا
سے بچ جاؤں گا۔

لیکن سلیمان بھائی بے چارے بھی بڑے بھورے تھے وہ شجور کی عادت کو جانے
بے شک تھے لیکن بہت زیادہ نہیں وہ کتنی گھنی اور سنگار تھیں، اس بارے
ان کی معلومات صفر کے برابر تھیں تیزی اور چالاکی کا علم تو سلیمان بھائی کو تھا
جس شخص کا سابقہ پڑتا تھا اسے تو وہ ناک چپتے چوڑا دیتی تھی۔ شامت کے لئے
بھائی اس وقت اس سے ٹکرا گئے تھے۔

کیسے سلیمان بھائی خیریت تو ہے؟

شجور کی مسکراہٹ نڈا اور گری ہوئی۔

یہ کوئی خیریت پوچھنے کا طریقہ ہے۔

سلیمان بھائی کی ہمت کچھ اور بندھی۔

کیوں۔ کیا خرابی ہے اس طریقے میں؟

تم اندھ کھڑی ہو، میں باہر کھڑا ہوں۔

بس اتنی سی خامی تھی اس طریقے میں۔ لیجئے میں بھی باہر آجاتی ہوں۔

شجور کافی بجائے دروازے سے باہر جاتے کے کھڑکی کے راستے ہی کو

پہنچ گئیں۔

اب فرمائیے، خیریت سے تو ہیں آپ؟

شجور کافی نے دوبارہ پوچھا۔

کہاں خیریت سے ہیں شجور بیگم۔

سلیمان بھائی کے منہ سے صاف صاف سن کر شجورانی نے یہ ظاہر کیا جیسے اسے بارے میں ایک لفظ بھی معلوم نہ ہو۔

کیوں — کیا کیا نقشہ نے — خیریت تو ہے؟
اس کی تو خیریت ہے، لیکن میری نہیں۔
آپ کی خیریت نہیں؟ شجورانی نے اپنے دیدے گھما لئے۔

ہاں —

بس اب کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہیں سب کچھ سمجھ گئی۔
شجورانی بڑی زور سے ہنسی۔
سمجھ گئیں؟

سلیمان بھائی خوش ہوئے۔

ہاں بالکل سمجھ گئی۔ وہی سلی جٹوں، شیوس، فریڈا، سوہنی مینوال یا سپر راجھا کا کوئی ڈرامہ ہو گا۔

بڑی شرم ہے تو تم۔ سلیمان بھائی مسکرائے۔

میں شرم نہیں ہوں اور آپ بالکل پاگل۔

کیوں —؟

دیکھنے میں ایسے سنجیدہ اور معقول آدمی نظر آتے ہیں اور اندر سے کیا نکلتے۔

سلیمان بھائی حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگے۔

ایسے آدمی کو ہم چند کہتے ہیں۔

شجورانی نے وضاحت کی۔

اس میں پیچیدگی کی تو کوئی بات ہی نہیں۔

سلیمان بھائی کچھ حیران گئے۔

بھئی ہم لوگ تو پیچیدگی ہی اصطلاح استعمال کرتے ہیں ایسے لوگوں کے لئے۔

شجورانی نے سوکھا سامنہ بنایا۔

نالائق ہو تم لوگ!

سلیمان بھائی نے بڑے رعب سے کہا۔

واہ۔ ہم لوگ کیوں نالائق ہونے لگے۔

بھئی محنت تو زندگی کے لئے اتنی لازمی چیز ہے کہ.....

نہ اس کے بغیر کیا ہضم ہوتا ہے اور نہ سانس کی آمد و رفت صحیح رہتی ہے۔

فجرت نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

بہت چمک رہی ہو ابھی جب نہیں کسی سے محنت ہوگی، جب پوچھو لگا۔

میں اتنی گھامڑ نہیں ہوں۔

کیا مطلب؟ یعنی اتنے سارے لوگ جو دنیا میں محنت کرتے ہیں سب گھامڑ ہیں؟

ہوں گے ہی۔

تم تو جیسے کسی سے کبھی محنت کر دو گی ہی نہیں؟

میرے پاس اس قسم کی فنون باتوں کے لئے وقت ہی کہاں ہے؟

محنت کرنے کے لئے وقت کی ضرورت ہے؟

جی — بالکل۔

ناحق ہی اپنا وقت منالئے کیا تمہارے ساتھ۔

سلیمان بھائی بڑی طرح جھلا گئے۔

نہیں خیر ایسی بھی بات نہیں ہے کچھ تو دل کا بوجھ ملکا ہوا ہوگا؟
شیتو نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔

بوجھ ہی ملکا کہنا ہوتا تو میں کسی دوسرے سے کہہ دیتا۔

سلیمان بھائی نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

تو انھوں نے کسی خاص وجہ سے کہا تھا آپ نے؟

ہاں، شامت ہی کاٹی تھی میری۔

کیوں۔ میں نے کیا کیا؟

پتہ کیا، معلوم تھا کہ تم.....

سلیمان بھائی نے بات اوجھڑی چھوڑ کر کھا جانے والی نظروں سے اس کی طرف

ہاں، کیا کہہ رہے تھے آپ، آپ کو کیا معلوم نہیں تھا؟

اب تو مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ تم سے کچھ نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ تم تو ہفتہ کو؟

ٹی پڑھا دو گی۔

نہیں۔ میں ان کو بالکل صحیح اور بجا راستہ دکھاؤں گی۔

شجورانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تمہاری صحبت میں رہتی ہے جی تو بالکل جو پٹ ہو کر رہ گئی ہے۔

ہاں۔ کیونکہ انہوں نے آپ کے اندر عزت کے جواب میں یہ نہیں کہنا کہ

آپ بھی مجھے سوٹ لگتے ہیں، اس لیے جو پٹ ہی کہیں گے آپ تو!

اچھا بس تیرے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

سلیمان بھائی بڑی طرح ناراض ہو گئے۔

اس کا مطلب ہے آپ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔

ہاں۔ بالکل

پکی بات ہے؟

شجورانی نے پوچھا۔

سلیمان بھائی منہ ٹٹکائے خاموش بیٹھے رہے۔

جواب تو دے دیجئے بات کا۔

سلیمان بھائی چپ رہے۔

سوچ لیجئے سلیمان بھائی! مجھ سے ناراض ہو کر آپ بہت گھٹے میں رہیں گے۔

سلیمان بھائی کسی کی پشت سے سڑکائے اس کی طرف گھورتے رہے۔

یہ سمجھ لیجئے کہ آپ کی سفارشات صرف میں ہی کر سکتی ہوں نہ صرف ہفتہ باجی سے

بلکہ ان بیکم اور داوی اماں سے بھی۔

اور یہ بات مت بھولنے کہ آپ کہ اس بیل کو منڈھے چر چلنے کے لئے اماں بیکم اور

داوی اماں کی رضامندی بہت ضروری ہے۔

مجھے بھی معلوم ہے۔

سلیمان بھائی نے بڑی دیر بعد زبان ہلائی مگر انداز ایسا ہی تھا جیسے ابھی شجورانی کو

ٹٹکائی تھی۔

ان دونوں تک یہ بات پہنچانے اور انہیں راضی کرنے کے لئے مجھ سے زیادہ دیر لگے

ویدہ دیر لپ کو لپور سے گھر میں کوئی اور نظر نہیں آئے گا۔

ہاں۔ تم تو بچپن سے ہی اس کھڑکے کی رہی ہو۔

سلیمان بھائی ذرا سا مسکرائے۔

اب دیکھئے نا اس سدا کا رگزار کی کے دوران مجھے بے شمار دفعہ ڈانٹ چٹکا کر پڑا

لیکن چونکہ میں بچپن سے ہی چٹکا گھر ڈا اور ڈھیٹ واقع ہوئی ہوں اس لئے ان سدا کی میرے اوپر کوئی اثر نہیں ہوگا۔

اس میں کوئی شک بھی نہیں ہے۔

سلیمان بھائی نے ہاں میں ہاں ملائی۔

لیکن شجورانی نے اس بات کا قطعی برا نہیں مانا۔ ان کا تو شروع سے ہی یہ کہنا جب دوسرے لوگ کسی کی خوبیوں کا اعتراف کریں تو اس کو برا نہیں ماننا چاہیے۔

شجورانی نے کچھ دیر فلسفوں کے سے اماندے کچھ سوچا، پھر ایک انگلی سے ہونٹے بولی۔

”ذرا ایک بات تو بتائیے؟“

ایک نہیں دو باتیں پوچھو۔

سلیمان بھائی ایک دم موٹے میں آگئے۔

آپ کو بنفسطہ حاجی سے کس قسم کی محبت ہے؟

کیا مطلب۔ محبت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں؟

ہاں۔ کیوں نہیں۔

شجورانی بہت ڈونڈ سے کہا۔

تم نے تو محبت بھی نہیں کی کسی سے پھر تمہیں.....

دراصل میں نے ریسرچ کی ہے اس موضوع پر اور پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی مل چکی ہے مجھے اس مسئلے میں۔

شجورانی ہنستے ہوئے کہا۔

بکواس نہ کرو زیادہ۔

سلیمان بھائی مسکرائے۔

ہاں تو بتائیے نا کس قسم کی محبت ہے آپ کو؟

میں تمہارا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

میرا مطلب ہے کہیں یہ اسی قسم کی محبت تو نہیں جو اب تک آپ بہت سدا دیکھوں سے.....

دماغ صحیح ہے تمہارا؟ میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔

سلیمان بھائی صاف جھوٹ بول گئے۔

کیوں جھوٹ بولتے ہیں سلیمان بھائی اتنے پارسا تو آپ کبھی نہیں رہے۔

شجورانی مسکرا کر کہا۔

تم تو احمق ہو۔

سلیمان بھائی صاف کتر اگئے۔

اچھا تو کیا آپ شادی بھی کریں گے بنفسطہ باجی سے؟

شجورانی سلیمان بھائی کا انٹرویو لینے پر تلی بیٹھ تھیں۔

ہاں تو اور کیا، گھاس تو نہیں کھا گئی ہو تم؟

سلیمان بھائی چڑھ کر بولے۔

اس میں چڑنے کی بات نہیں ہے، ہر بات کی وضاحت پہلے سے ہو جائے تو کیا
شبجو نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ ضبط کی۔

کیوں۔ اس وضاحت کی ضرورت کیوں پیش آئی؟

اس وضاحت کی ضرورت یوں پیش آئی کہ بعض لوگ محبت تو کسی اور سے کرتے ہیں
اور شادی کسی اور سے کر لیتے ہیں۔

شبجو نے زبردستی سنجیدگی جاری کرتے ہوئے کہا۔

اطمینان رکھو، میں ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہوں۔

سلیمان بھائی نے بڑے اعتماد سے کہا۔

خدا کرے ایسا ہی ہو۔

شبجو بیکم اب واقعی سنجیدہ ہو گئیں۔

چند منٹ تک دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے رہے، پھر شبجورانی کو ایک دم نا

ایا کر انہیں نیان آئے بہت دیر ہو چکی ہے لہذا ان کی ڈھنڈیاچی ہوتی ہوگی۔ بغیر کچے

تفزیبنا بھاگتی ہوئی وہ درمیانی گیٹ کی طرف چل دیں۔

دوسری طرف واقعی ان کی ڈھنڈیاچی ہوتی تھی۔ ایسے موقعوں پر سب سے زیادہ

فکر وادی اماں کو ہوا کرتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ایک ایک سے پوچھتی پھر رہی تھیں

اسے کسی نے شبجو کو دکھایا؟

اسے یہ گئی کہ ہر کو؟

اس کا کچھ پتہ نہ چلے ہے۔ چل کی پل میں اڑ چکے ہو جو ادا ہے۔

آپ ناحق فکر مند ہو رہی ہیں اماں۔ وہ ضرور کسی کو نے میں بھیجی ہوگی کتاب میں مزید

اماں بیکم بولیں۔

اتنے بہت سے کو نے تو میں دیکھ آئی ہوں مجھے تو کہیں نہ دکھائی دی۔

داوی اماں کچھ اور ہی زیادہ فکر مند ہو گئیں اور اپنا باوامی لیڈی ہملٹن کا عزا رہ سنبھالے

ان کی طرف چل دیں۔ ابھی برآمدے کی میٹھیوں سے پیچے اتری ہی تھیں کہ کسی سے ٹکراتے

ٹکراتے پھیں۔ منہ اٹھا کر جو دیکھا تو شجیعہ بیکم ہی تھیں۔ داست نکا سے ان کی طرف دیکھ

رہی تھیں۔

کدھر جا رہی ہیں داوی اماں؟

تجھے ہی دیکھنے جا رہی تھی۔

کیوں۔ آپ سمجھیں میں کھو گئی۔

تیرے منہ میں خاک، کبھی تیرے منہ سے ڈھنگ کی بات بھی نکلے ہے؟

کیا بہت بے ڈھنگی بات کہہ دی میں نے؟

شبجو نے اٹا داوی اماں سے ہی سوال کر دیا۔

تو تھی کدھر کو اتنی دیر سے؟

داوی اماں نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

میں ادھر تھی سلیمان بھائی کی طرف۔

کیا کہہ رہی تھی؟

باتیں۔ خوب مزے مزے کی باتیں۔

شبجورانی نے منہ کچھ اس طرح کا بنایا جیسے مزید رکھی میٹھی گولیاں کھا رہی ہوں۔

بیٹا۔ بتا کر جایا کر وہ اس طرح بغیر کے جا کر نہ بیٹھ جایا کر وہ۔

اے پھر کب بتائے گی؟ ابھی بتا دے۔

آپ ہی تو کہتی ہیں کہ ہر کام کرنے کا اور ہر بات کہنے کا وقت مقرر ہوتا ہے۔

ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔

بس سمجھ لیجئے ابھی وہ وقت نہیں آیا۔

شجورانی نے انہی کی بات کا حوالہ دے کر انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ وادی اماں درگدگ گئی تھی۔ ان کا اسرار جب زیادہ بڑھا تو نتیجہ میں سوچا کہ یہ تو کھپلا ہو گیا وادی اماں دادا رکھائے بیٹھی ہیں کہ ابھی پوچھ کر رہیں گی۔ اب کیا ترکیب کی جائے؟ جب کچھ نہ بن رہا تو جھٹ سے جھوٹ بولیں:

ارے وادی اماں! میں تو مذاق کر رہی تھی، آپ سچ سمجھ گئیں۔

تیرا مذاق بھی بس ایسا ہی ہوا کہ ہے۔

وادی اماں مصنوعی ناراضگی سے بولیں۔

نتیجہ بیگم وادی اماں کو مزید کچھ کہنے سننے کا موقع دیئے بغیر جھپک سے دادا جان کے کمرے میں گھس گئی۔

دادا جان بے چارے چھہ بھیلے بیٹھے ہوئے معلوم نہیں کونسا اسٹیشن لگائے غریب سن رہے تھے، ایک دم گڑ بڑا گئے۔

ارے جی ڈرا! تنگی سے داخل ہوا کہہ دکر میں۔

جی اچھا۔ بہت بہتر۔

شجور نے بڑی سعادت مندی سے کہا اور دادا جان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔

کہاں سے چلی آرہی ہو؟

کیوں پریشان ہو جاتی ہیں آپ میرے لئے؟

ایک میں کیا؟ سبھی پریشان ہو جاویں ہیں۔

گھر میرا تو خیال ہے آپ زیادہ پریشانی ہو جاتی ہیں میرے لئے۔

وادی اماں چپ رہیں۔

میں کتنی خوش قسمت ہوں وادی اماں! آپ کتنا پیار کرتی ہیں مجھے۔

شجورانی ان کے گلے کا ہار ہی بن گئیں۔

اے ہے یہ کی میری گردن دبائے گی، چھوڑ تو سہی۔

آپ کی گردن دبانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وادی اماں۔ ابھی تو مجھے آپ سے

ساری باتیں سنوائی ہیں۔

شجورانی بڑی مکاری سے مسکرائیں۔

بے چاری وادی اماں کے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ یہ ساری خوشامد اور چال

اس وقت کس لئے ہے اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شجورانی کو وادی اماں سے

پیار تھا۔ لیکن اس وقت تو اس قدر شدت سے پیار کا اظہار وہ اپنے مطلب سے

بھٹی۔ حالانکہ فی الوقت تو اس خوشامد کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وادی اماں تک

باتیں پہنچانے کا مسئلہ بہت بعد کا تھا۔ وہ تو وادی اماں کیونکہ اس وقت سامنے آگئے

اس لئے شجور کی چڑ سے کی زبان پھسل گئی۔

کوئی باتیں سنوائی ہیں مجھے؟

وادی اماں نے پوچھا۔

ابھی نہیں بتاؤں گی وادی اماں۔

دادا جان باقا عدہ انڈویو لینے پڑل گئے۔
وہ ——— ذرا چچی جان کی طرف گئی تھی۔
سب خبر سیت تو ہے؟

جی ہاں۔

یہ تمہاری دادی اماں کیا تقریر کر رہی تھیں؟
تقریر ———؟ شجورے زور سے ہنسی۔

ہاں ——— اور کیا ———؟

وہ تو مجھ سے باتیں کر رہی تھیں۔

شجورے ہنستے ہوئے کہا۔

ان کی ہر بات کسی تقریر سے کم محسوس ہوتی ہے۔

کوئی بھی نہیں دادا جان۔ آپ تو خواہ غواہ ہی دادی اماں کو چڑھیں رست میں۔

شجورے ان کی بات سے لطف اندوز ہو کر کہا۔

لا حول ولا قوۃ مجھے کیا پڑی ہے جو میں ان کو چڑھاؤں گا۔

آپ کچھ ناراض ہیں دادی اماں سے؟

پھر وہی فضول باتیں ہیں جو کہہ رہا ہوں اس میں ناراضگی کا سوال کہاں سے پیدا ہو گیا؟

اب یہ تو مجھے نہیں معلوم۔

جب کچھ معلوم نہ ہوا کرے تو خاموش رہا کرو۔

اچھی بات ہے، جیسی آپ کی مرضی۔

شعبہ بیگم نے بیٹری کی طرح گردن جھکا لی۔

آج کل کچھ کھتی پڑھتی بھی ہوتی تھیں؟

دادا جان نے موضوع بدلا۔

جی! شجر نے مری ہوئی آواز سے کہا۔

کچھ نئی کتابیں بھی پڑھیں تو نے؟

جی ہاں۔

شجر نے جلدی جلدی نئی پڑھی ہوئی کتابوں کے نام گنوا دیئے۔

ماشاء اللہ!

دادا جان خوش ہو گئے۔

گھر کے سب بچوں میں بس تمہیں اللہ شعیب کو ہی شوق ہے پڑھنے کا۔ باقی تو سب

گھاس کھودتے ہیں۔

دادا جان نے کہا۔

شجر رانی چکی بیٹری ہیں، پھر ایک دم کچھ سوچ کر بولیں:

سجاد بھائی بھی بہت دلی لگا کر پڑھتے ہیں۔

سجاد وکیل تو بالکل نامعقول ہیں۔

نہیں تو دادا جان! سجاد بھائی کا میڈیکل کا آخری سال ہے

اگر اس کی کتابیں پڑھ لینے کو میں کافی نہیں سمجھتا۔ پڑھ لکھ کر گھر پر لادیں گے دادا جان نے کہا۔

شجر کو دادا جان کی بات پر ہنسی آ گئی۔

ہنسنے کی کیا بات ہے اس میں خالی ڈگریاں لے لے کر جمع کرنے سے کچھ نہیں ہوتا

نانچ تو مفر کے برابر ہوتی ہے آج کل کے لڑکوں میں۔

یہ تمہارے سجاد بھائی میڈیکل کا امتحان پاس کر کے کونسا تیرا دیں گے۔

کیوں — وہ پریکٹس کریں گے۔

ہاں پریکٹس کریں گے، جسے نذر ہوگا، اسے سجاد کی دوا دیں گے، کسی کو بھوک کی کمی

شکایت ہوگی تو اسے پریز پریکچر دے کہ کھانا پینا بند کر دیں گے۔

دادا جان پہلے بھنے بھنے ہیں بولے۔

شجر خلاف معمول چپ چاپ بیٹھی ان کی باتیں سنے جا رہی تھی، بات حیرت کی

ہی تھی لہذا اس کی زبان کہاں قابو میں رہتی تھی۔

میری ہی مثال تمہارے سامنے ہے، اچھا بھلا تھا کہ صاحبزادے نے میرا کھانا پینا

سب بند کر دیا۔

نہیں دادا جان! آپ کی طبیعت پچھلے مہینوں واقعی بہت خراب رہی ہے۔

رہنے دو بس، بیٹھ گئی ہیں بھائی کی حمایت لینے۔

دادا جان چر کر کہہ بولے۔

دیکھئے نا دادا جان! اب آپ کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہے تو انہوں نے کئی چیزیں

کھانے کی اجازت دے دی ہے، ڈاکٹر بے چارے تو مجبور ہوتے ہیں ان سب باتوں

کے لئے۔

کسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا، سب چھپے رستم ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں
پیٹ میں داڑھیاں ہوتی ہیں۔

شجرانی اپنی دھن میں گن، اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی معلوم نہیں کیا کہو اس کر گئیں۔
ارے کیا بک رہی ہو؟ خوش میں تو ہو شجر؟

اماں بیگم بولیں۔

ہماری بیٹی نکوتی میں پڑھ پڑھ کر بالکل فخر جھبٹی بنتی جا رہی ہے اماں نے کہا۔
اماں بالکل صحیح کہتے ہیں۔

شجیعہ نے جلدی سے تائید کی اور غٹا غٹ پانی چڑھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔
اسے بس، آنا ذرا سا!

دادی اماں بولیں۔

دادی اماں، اتنی ہی بھوک تھی۔

جئے تم لوگوں کی بھوک کو کیا ہو گیا ہے؟

دادی اماں فکر مند ہو کر بولیں۔

دوبے چاری اسی نکرہ میں دہلی ریتی تھیں۔ کہ فلاں لڑکی نے کل رات کم کھا نا کھایا تھا۔

فلاں نے آج دوپہر صرف کھا نا سوکھ کر چھوڑ دیا۔ سجاد نے صبح نہ تو آکھیٹ کھایا نہ

بالکل راولوں کی کیا ہوا اٹھا کھایا اور ٹیکسیل کی خوراک اب آدھی بھی نہیں رہ گئی ہے۔

کہہ کر کاٹھا ہوا جا رہا ہے۔

دادی اماں سوچتی ہی رہ گئیں کہ شجر نے بہت کم کھا نا کھایا، کہیں اس کا جی تو نازہ نہیں۔

کل اس کے لئے تھوڑا سا صلہ بنا دوں گی، شوق سے کھاتی ہے، اور

ابھی کہاں ڈاکٹر بنا ہے۔ خواہ مخواہ دوسرے کے معاملے میں ٹانگ پھینکا کر.....

مگر آپ یہ بھی تو دیکھیے، ڈاکٹر فاروقی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا، پھر جب اپنی
کو دکھایا تو اس نے بھی.....

ارے بیٹی! ان لوگوں کا تو دھنڈا اسی طرح چلتا ہے، دوسروں کو بھوکا مار کر۔

شجیعہ دادا جان کی بات سن کر منس پڑی۔

دادا جان کا لیکچر ابھی اور جاری رہتا مگر مضامی اسے بلانے آگیا۔ کھانے پر انتظار

رہا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران ہی شجر نے سوچا کہ آج نفستہ باجی سے فائنل بات ہوئی؟

آج ذرا بچے فرصت بھی ہے کوئی کتاب نہیں ہے پڑھنے کے لئے اور نہ ہی کالج کا کام ہے۔

کام ہے۔

جلدی جلدی نوالے منہ میں ڈالتے ہوئے وہ دل ہی دل میں سوچتی رہی کہ بات

آغاز کس طرح ہوگا اور اختتام کہاں پر ہوگا۔

بڑی اماں جو سامنے ہی بیٹھی تھیں۔ بڑے غور سے جائزہ لے رہی تھیں کہ شجر

آج نوالوں کو ریس کے گھوڑے بنا کر کھا ہے۔ کچھ دیر تو وہ چپ بیٹھی رہیں لیکن آخر

منک؟ بول ہی دیں۔

اتنی جلدی کس بات کی ہے شجیعہ بیٹی!

کہاں — کس کو؟

شجیعہ بیگم چونک پڑیں۔

آرام سے کھا نا کھاؤ، بھگا کا تو نہیں جا رہا؟

شعوبیکم بھیک کمرے سے باہر بھی نکل گئیں۔ پہلے تولان میں ٹٹلے گاؤں
 مگر پھر کچھ سوچ کر پروگرام کینسل کر دیا۔ اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ الماری کھلا
 ہوئی سو نف اور چھپا کر نکال کر پھینکا لگا با اور منہ چلاتی ہوئی در تپکچے میں اکھڑی ہوئی
 میں تو ہر وقت دینا زمانے کی باتیں کچھڑی کی طرح پکتی رہتی تھیں۔ دین و دنیا سے
 ہو کر اگلی کھلی باتیں سوچنا شروع کر دیں۔ چونکہ اس وقت جب بنفشہ اگر نہ ہوتا
 کھڑی ہو گئی بلکہ کچھ کما بھی کیا کیا؟ یہ تو شعوبیکم سن نہ سکیں۔ اپنے ہوشوں میں کب تھیں
 اب۔ کیا، مجھ سے کچھ کہا؟
 افوہ۔ کہاں رہتی ہو؟ بنفشہ مسکراتی۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
 کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

شعوبیکم نے موڈ میں آکر سفر سنایا۔
 آج تو سفر و شاعری کے موڈ میں معلوم ہوتی ہو؟ بنفشہ نے کہا۔
 ہماری ایسی قسمت کہاں؟
 فنچو نے ٹھنڈی سانس بھری۔
 کیوں۔۔۔ خیریت؟

ابھی صرف کتابیں پڑھتی ہوں تو اگلی صبح شام چھپکا رتی رہتی ہیں۔ اگر کہیں کچھ
 شروع کر دیا تو ٹوٹا لے کر دوڑا کر گئی۔
 بنفشہ کو اس کی بات سن کر منہ ہی آگئی۔
 خیر چھوڑیئے اس ذکر کو، ہاں یہ بتائیے آپ کیا کر رہی تھیں؟
 میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ شام کو کہاں غائب تھیں؟
 میں۔۔۔ وہ ذرا سیماں بھائی لے گئے تھے۔
 بنفشہ نے لاپرواہی سے کہا۔
 بنفشہ کچھ چوری بن گئی۔
 آپ نے یہ نہیں پوچھا، کیوں لے گئے تھے؟
 شعوبیکم نے بڑے غور سے بنفشہ کی طرف دیکھا۔
 دیئے ہی لے گئے ہوں گے۔
 بنفشہ ایک دم اپنے آپ کو لاپرواہ ظاہر کرنے لگی۔
 جی نہیں، ایک خاص وجہ سے لے گئے تھے۔
 شعوبیکم نے بڑے انداز سے کہا۔
 خاص وجہ، پر بنفشہ کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔
 آپ بڑی وہ ہیں، مجھے آپ سے ایسی امید نہیں تھی۔
 بنفشہ نے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
 میں۔۔۔ میں نے کیا کیا؟
 بنفشہ دل ہی دل میں سم گئی، اگر اب خیریت نہیں ہے۔
 میں جب تک آپ کو اپنی ہر چھوٹی بڑی بات بتا نہ دوں مجھے چین نہیں پڑتا اور
 نی بڑی بات مضطرب نہ کر گئیں؟
 بنفشہ نے سوچا، اب تو باوجود کوشش کے میں اس سے بھوٹ نہیں بول سکتی۔
 وہ چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی رہی۔ لیکن شعوبیکم کسی کا چچا کپڑی بھٹی تو اسے

گھر تک پہنچا کر آتی تھی۔

انہوں نے جب تک ایک ایک لفظ بنفشہ سے اگوا نہ لیا انہیں جین بٹا بنفشہ بے چاری نے بتانے کو تو سب کچھ بتا دیا لیکن حالت یہ تھی کہ کلاڑی میں سو نہیں چہرے کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا، ہاتھ پر ایک دم ٹھنڈ سے تھے اس ہونٹ کھڑی تھی جیسے ابھی پھانسی کے تختے پر ٹکا دی جائے گی۔

شجورانی نے اس کا یہ حالت دیکھی تو ایک دم انہیں رحم آگیا اور پیار تو خیر انہی ہی آٹا تھا بنفشہ باجی کے اوپر۔

مسکرا کر ان کے گلے کا ہار بننے ہوئے پولیس۔

آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔

شبیخہ مجھے بہت ڈر لگتا ہے ان تمام باتوں سے، سلیمان بھائی کو منع کر دینا آئندہ ایسی باتیں نہ کریں۔

بنفشہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

کیوں؟

شجورانی ایک دم تھانیدار بن گئیں۔

یہ سب مجھے نہیں معلوم۔

آپ کو سلیمان بھائی اچھے نہیں لگتے؟

مجھے نہیں معلوم، میں نے کبھی ان کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔ بنفشہ

تو اس کا مطلب ہے آپ کسی اور کے بارے میں سوچتی ہوں گی۔

بھئی، میں کسی کے بارے میں نہیں سوچتی۔

بنفشہ کچھ بیزار ہو کر بولی۔

تو آپ کو سوچنا چاہیے نا۔

شبیخہ نے بڑی بیخودگی سے کہا۔

کیوں۔ ضروری ہے؟

ہاں بالکل، اب آپ بڑی ہو گئی ہیں۔

شبیخہ اور عمرانہ آپا بھی تو بڑی ہو گئی ہیں۔

تو آپ کو کیا معلوم، سوچتی ہوں گی وہ بھی کسی کے بارے میں، مجھے اور آپ کو نہ بتائی ہوں گی۔

چھوڑنا اس ذکر، تم تو بچھے پر لگتی ہو۔

بنفشہ سے اور کوئی بات ہی نہ بن سکی۔

چھوڑنے کے لئے نہیں کپڑا تھا میں نے اس ذکر کو۔

تو پھر میں کیا کروں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

بنفشہ چڑھ کر بولی۔

دیکھیے جناب! میں تو آپ کو بلا فیس کے یہ مشورہ دوں گی کہ یہ سیلی اعجاز کا ڈرامہ رچانا

تو بالکل فضول ہے، مجھے یہ سب باتیں قطعی نا پسند ہیں۔ ہاں

اگر آپ راضی ہوں تو اماں یکم اور داوی اماں سے کہہ کر سلسلہ آگے بڑھایا جائے۔

سلسلہ کیا؟ بنفشہ گھبرا گئی۔

شادی کا اور کیسا؟ شجوا کا انداز بڑی بڑھیلوں کا سا تھا۔ اگر مجھ سے تنگ آگئی ہو تو ویسے

ہی تبادلاتی جلدی اس جہنم میں جھونکے... ارے ارے بڑا انوس ہوا آپ کے منہ سے

ایسی باتیں سن کر، تنبیہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بنفشتہ نے کوئی جواب نہیں دیا، مزہ ناکہ ایک کرنے میں بیٹھ گئی۔

آپ تو بلاوجہ ہی افسوس کرنے بیٹھ گئی ہیں، میری پوری بات بھی نہیں سنی۔

بنفشتہ نے پھر بھی جھکا ہوا سر اوپر نہیں اٹھایا۔

میں تو اس لئے کہہ رہی تھی کہ سیدنا بھائی بہت بے تاب ہیں۔

تم چاہتی ہو میری پڑھائی لکھا کی منتہم ہو جائے؟ بنفشتہ رونے پر کامہ بیٹھی تھی۔

تو ابھی کوئی ہوئی جا رہی ہے شادی ابھی تو بات سمیت شروع ہونے میں ہی دن

لگ جائیں گے۔ شجر نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

پھر اس کے بعد؟

اس کے بعد یہ کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے اماں بیگم اور دادی اماں ہرگز راضی نہیں ہوں گی ابھی۔

بنفشتہ نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ کیوں؟

”آپ بڑی چھٹ باجی اور آپا جان موجود ہیں پہلے ان کا کچھ سلسلہ ہو گا۔“

تنبیہ بیگم نے اس طرح ان باتوں کا ذکر چھوڑ رکھا تھا جیسے شادی بیاہ کے سارے

معاملات کی ذمہ داری صرف انہی کے ناتواں کندھوں پر آن پڑی ہو۔

بنفشتہ یہ سوچ کر دل ہی دل میں خوشی ہوئی کہ اسے، شمسہ اور عمارتہ آپا کا تو بچے خیال ہی

نہیں رہا تھا، ابھی تو ان کا منہ ہے۔

”ایمان کی بات یہ ہے بنفشتہ باجی، کہ مجھے تو صرف آپ کی مرضی معلوم کرنی تھی، میں یہ

دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا آپ کے دل میں کچھ جگہ بھی پیدا ہوئی سلمان بھائی کے لئے یا وہ یوں ہی

خالی کرتے پھر رہے ہیں۔“

بنفشتہ بھلا اس بات کا کیا جواب دیتی۔

”اب میرا معاملہ یہ ہے کہ آپ کو نہ تو لیلیٰ اور شیریں بننے کی ضرورت ہے اور

ہی سوہنی کیونکہ ان سب باتوں سے مایدلت کو سخت چڑ ہے۔ آپ بے شک سلمان

کی لڑائی ہے، لیکن اس آزمائشی دور میں اتنا آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وقت

نے پرنچھے لوٹا ہی مشکل ہو جائے۔“

بنفشتہ پھر بھی منہ میں گنگھنیاں ڈالے بیٹھی رہی۔

”ہر اپنے دل کو اتنا مضبوط بنایجئے کہ اگر ابھی آپ چار قدم آگے بڑھ جائیں تو ضرورت

نے پردہ قدم پیچھے ہٹ جانے پر آپ کو ذرا بھی ملال نہ ہو۔“ تنبیہ بیگم بڑی بردبار بنی

کہ کوئی عیشیں کمری نہیں۔

اور بنفشتہ سوچ رہی تھی، ہر شخص کو اپنی طرح مت سمجھو تنبیہ انہ سب کے ذہن ایک

ایسے سوچتے ہیں اور نہ سب کے دل ایک جلیسا اثر قبول کرتے ہیں۔

”پھر آپ نے کیا سوچا؟ میں کیا کہہ دوں سلمان بھائی سے؟“

تنبیہ نے پوچھا۔

”کچھ بھی مت کہو۔“

بنفشتہ نے کہا۔

”واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کچھ تو فیصلہ کیجئے۔“

”کیا ابھی بیٹھے بیٹھے فیصلہ کر لوں؟“

بنفشتہ ہزار ہو کر بولی۔

”نہیں، میں آپ کو کچھ دن کی مدت دے دیتی ہوں۔“

”اچھی مشکل میں پڑ گئی ہوں میں تو۔“

بنفشتہ نے پریشان ہو کر کہا۔

”کوئی مشکل نہیں ہے اپنے دل و دماغ کی مرضی سے فیصلہ کیجئے اور یہ بھی مزہ

ہے کہ آپ سلمان بھائی کے عہد میں ہی فیصلہ کریں۔“

”اچھا بابا، اب ختم کرو اپنی تقریر۔“

بنفشتہ ایک کتاب اٹھا کر اپنے بستر پر دانا ہو گئی۔

ایک طرف سلمان بھائی کا یہ حال تھا کہ وہ بنفشتہ کا فیصلہ سننے کے لئے بڑا

تھے، روز کشکی بھانے سے اشارہ کرنا بیڑہ شجیعہ سے اس بات کا ذکر کر دے تھے تھے

اسی کے ذریعے کچھ پتہ چل سکے مگر وہ بھی کہ ایسی بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔

”ایسی جلدی کیا ہے؛ بالکل ہی ہونٹ بنے جا رہے ہیں۔“

اور بے چارے ولایت پلٹ سلمان بھائی ایک دم بھیگی جلی بن جاتے تھے۔

ماتنے کیا کرتے بے چارے؛ بڑا وقت آن پڑا تھا۔ ان پر ہر ایسی بُری بات ہر

دوسری طرف بنفشتہ فیصلہ کرنے میں اتنی ہی دیر لگا رہی تھی۔ وہ غریب بھائی

اسے کبھی اس قسم کی باتوں سے سابقہ ہی نہیں بڑا تھا۔ وہ عام لوگوں سے بالکل مختلف

اور سادہ فطرت لڑکی تھی۔ اس کے بچپن میں گھر پر ماحول کچھ اس قسم کا رہا تھا کہ ضرور

حساس اور کم سخن ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر چھوٹی بڑی بات کو چپ چاپ سہہ لینا اس کی ملا

کسی سے کچھ کہنا سنا اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ جب کسی بات پر لبس نہ چلتا تو بڑے

آسنو کرانے بیٹھ جاتی۔

”جنت“ اس نے اپنے باپ سے کی تھی، جو برسوں پہلے اسے چھوڑ کر اس دنیا سے چلا گیا تھا۔

جنت — اس نے اپنی ماں سے بھی کی تھی؛ جو نہ جلتے کہاں ۹۰۰۰۰؟

اور جنت اس نے اپنے بھائی سے بھی کی تھی؛ لیکن اس کے متعلق بھی وہ کچھ نہیں مانجی تھی

یادوں کی کچھ کلیاں تھیں جنہیں وہ بچپن سے اپنے دامن میں سینے چپ چاپ سوچا

کرٹی تھی اور رویا کر تی تھی۔

اس کے گھر میں اس کے سمیت صرف چار ہی آدمی تھے۔ نہ اُمی کے کوئی رشتہ دار تھے۔

اور نہ باؤ کے کیوں نہیں تھے؛ کہاں چلے گئے تھے؛ یہ سب اسے کبھی نہیں بتایا گیا تھا؛ لیکن

بعد میں — جب وہ بڑی ہوئی اور بہت ساری باتیں بغیر بتائے اس کی سمجھ میں آ گئیں

تو جی ان سوالوں کے جواب بھی اسکے دماغ نے ڈھونڈ لئے۔

اور پھر — جب وہ بخورانی کے گھر میں آئی تو اتنے بہت سارے لوگوں کو

دیکھ کر وہ بہت دنوں تک سہمی ہوئی گھبراہٹی ہوئی اور پریشان سی رہی۔ یہاں اسے بے پناہ

جنت اور ڈھیروں غلوں والا اس نے پھیلی تمام باتیں بھلا دینے کی کوشش کی؛ لیکن برقعش نہیں

ٹاٹا کہ نا اور نہ ہر یاد دھندلوں میں چھپا کر تی سے ملے آتے ہیں گزر جاتے ہیں، پھر آتے

ہیں پھر گزر جاتے ہیں؛ مگر لمحوں کے مجھڑ میں عمر رفتہ کی شبیہ ڈوب ڈوب کر ابھرتی، سی

رہتی ہے۔

اس جنت کے سوا اور کسی قسم کی جنت کے روپ نے اس کے دل و دماغ میں کبھی

جگہ نہیں بنائی تھی۔ وہ نہ آج کل کی موڈرن لڑکیوں کی طرح چمٹا دھاڑتا عشق کر سکتی تھی۔

اور نہ گزشتہ دور کی لڑکیوں کی طرح خاموش، بے زبان اور گتھی جنت کر سکتی تھی۔ اس کا

ذہن کبھی اس قسم کی باتوں کی طرف گیا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ کہنے کو گھر میں ماشاء اللہ تین جوان مرد

تھے۔ مگر انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات ہی نہیں کی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اپنی ہنر لیں اور اس میں کوئی فرق سمجھتے ہوں۔

ہاں، ادھر کچھ عرصے سے بڑھتیہا کے رویے میں کچھ عجیب سی تبدیلی آگئی تھی۔ ان کا باتوں پر بعض دفعہ شجورانی چونک چونک پڑتی تھیں۔ مگر باوجود ایک طرارہ ہونے کے ان کی یہ ہمت کبھی نہ ہوتی کہ اس سلسلہ میں بڑھتیہا سے کچھ پوچھتیں، بنفسفہ کا ذکر کرتے وقت یا اس سے باتیں کرتے وقت ان کے لمبے میں کچھ اس قدر محبت اور پیار سمٹ آتا تھا کہ شجیرہ کے دماغ میں کھڑکے ہونے لگتی تھیں۔ لیکن دوسری طرف یہ خیال بھی آتا تھا کہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی تو بڑھتیہا اب تک منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کیوں بیٹھے رہتے؟ آخر یہ بات کہتے ہوئے ان کی راہ میں کونسی چیز مانع ہو سکتی ہے؟ پس یہیں یہ اگر شجورانی پہنچی کھا جاتی تھیں بنفسفہ کو شجیرہ بیگم نے کچھ روز کی مدت دی تھی کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اس مسئلے پر سوچ کر کوئی فیصلہ کر لے اور انہیں بتا دے تاکہ وہ خود یعنی شجیرہ بیگم بغیر ایک لفظ نہ

کے وہ ساری بات مسلمان بھائی کو نہ کہ ان کے اوپر سے چغندین کا خول اتار پھینکیں مگر وہ ”کچھ روز“ گزر بھی گئے۔ اور بنفسفہ غریب کا معصوم اور سیدھا دل و دماغ کوئی فیصلہ ہی نہ کر سکا۔ شجیرہ بیگم کے جبر کا پیمانہ بھی بے پناہ ہو گیا۔ آگئیں اس کی جان کو۔

بنفسفہ واداجان کو اجازت نہ کر لینے کر سے میں آکر بیٹھیں ہی تھی کہ وہ دندنا تی ہوئی اس کے سر پہ پہنچ گئیں۔

”بھئی یہ بڑی غلط بات ہے بنفسفہ حاجی“

”ہیں اکیب؟“

بنفسفہ ایک دم چونک پڑی۔

”آپ نے تو اپنا منہ ہی سی لیا ہے“

وہ آہر دھڑکا کر بولیں۔

بنفسفہ اپنی روشن اور نشاف آکھوں سے ان کی طرف چپ چاپ دیکھتی رہی۔

”ابھی تک آپ نے کوئی فیصلہ ہی نہیں کیا اتنے دن گزر گئے“

”میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا“

بنفشتہ اپنی پشیمانی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے بولی۔

”شعبو کو ایک دم اس کی حالت پر ترس آگیا۔ قریب بیٹھے ہوئے پیار سے بولی۔

”سچی، بڑی حیرت ہوتی ہے آپ کو دیکھ کر۔۔۔ معلوم نہیں کیسے اتنی بڑی ہڈی“

بنفشتہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”میری صحبت میں نہ کر بھی آپ نے کوئی اثر نہیں لیا“

”تو تم نے کب کسی سے محبت کی جو میں تمہارا اثر قبول کرتی“

بنفشتہ نے دھیر سے کہا۔

”ایمان سے، بڑی بھولی ہیں آپ“

شعبو نے بے اختیار بنفشتہ کو گلے سے لگایا۔

”کیوں؟ کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟“

بنفشتہ نے پوچھا۔

”میں محبت کی بات ٹھوڑی کر رہی ہوں۔ اللہ نہ کرے جو مجھے کبھی کسی سے محبت ہو“

شعبو نے کانوں کو ہانڈو لگاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر؟“

”میرا مطلب ہے آپ نے میری تیزی طراری سے بھی کوئی سبق نہیں لیا“ شعبو نے

بنفشتہ کو ایک دم ہنسی آگئی۔

”ہٹنے کی کیا بات ہے اس میں؟“ شعبو نے گھورا۔

”کچھ نہیں، ویسے ہی“

بنفشتہ نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔

”اچھا خیر، یہ سب تو آپ بھر پڑیے، آپ بس مجھے ایک بات بتا دیجئے“

”کوئی بات؟“

”آپ کو سلمان بھائی بڑے تو نہیں لگتے؟“

”نہیں“ بنفشتہ نے سوچ کر کہا۔

”ہاں لگتے بھی نہیں چاہئیں، ان میں بڑائی ہی کیا بات ہے؟ خوبصورت آدمی، میں۔

بھی ہیں“

شعبو نے فوراً اپنی رائے بھی پیش کر دی۔

بنفشتہ خاموش رہی۔

”آپ ایسا کیجئے، ان کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے پر کھائے اور میں ان سے کمزوروں کی کہ اگر واقعی

بدہ ہیں تو جی جان ادھ پھوٹے چچا سے کہئے وہ اپنے آپ بات کر لیں گے داوی اماں سے“

شعبو نے کھسر پکھر کرتے ہوئے کہا۔

”جی سچی بات یہ ہے شعبو، مجھے جی جان سے ڈر لگتا ہے اور دوسری بات یہ کہ مجھے

لوگوں کا ماحول پسند نہیں“

”ہاں، آپ کی یہ باتیں تو میرے دل کو بھرتی لگتی ہیں۔ ڈرتی ٹھرتی تو ہیں کسی سے

نہیں، سچی جان کس کھیت کی مولی ہیں؟ لیکن وہ مجھے اچھی کبھی بھی نہیں لگیں اور نہ ہی

مذہ ان کے اچھے لگنے کا امکان ہے اب رہ گئی ان کے ماحول والی بات تو سلمان بھائی تو خاصے

لاگتے ہیں، آپ کے دام عشق میں گرفتار ہونے کے بعد کئی کئی دن تو وہ کلیب نہیں جاتے“

بنفشتہ نے سوچا۔ دوسری بات تو شعبو بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔

” اویہ سب کچھ تو آپ کے ہاتھ میں ہے کہ ان کی عادتوں کو کس حد تک کے مطابق بدل سکتی ہیں“
 نتیجہ نے کہا۔

بنفشتہ اپنی سوچوں میں ڈوبی بیٹھی رہی۔

” مرد تو نوم کی ناک ہوتے ہیں، عورت کا جدھر دل چاہے پکڑ کے موڑ لے گا۔“
 ہے کتاب میں اس کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔“
 نتیجہ نے کسی خیر برباد عورت کے سے انداز میں کہا۔
 بنفشتہ بھر بھی کچھ نہیں بولی۔

” آپ کو تو آپ کے سدھاپے نے مار رکھا ہے، کہیں کا نہیں چھوڑا اس نے آپ کو۔“

نتیجہ بیگم خاصی پریشان نظر آرہی تھیں۔
 بنفشتہ اس کی بات سن کر سکرا دی۔

” بولئے پھر کیا کہتی ہیں؟ بات ملے ہے نا پھر؟“
 ” چھوڑو، دیکھا جائے گا“ بنفشتہ نے بورہ کر کہا۔

” آپ کی یہ بات تو ٹھیک ہے لیکن آپ سلمان بھائی پر یہ کیوں ظاہر کرتا ہیں؟“
 غیر معمولی بات ہوئی ہے، پہلے ہی کی طرح ہنسنے بولنے ان کے ساتھ، ”نتیجہ بیگم اپنا دینے سے باز نہ آئیں۔“

” اچھا، فی الحال تو نیند آرہی ہے“

بنفشتہ نے بات ٹالنے کو کہا اور تکیہ سر کر اڑی تبھی لیٹ گئی۔

” نیند آرہی ہے تو آرام سے لیٹئے، نتیجہ اٹھتے ہوئے بولی۔ اور بڑی کاہلی سے اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔

اللہ — اگلی دفعہ جب سلمان بھائی نے نتیجہ بیگم سے صاف صاف بات کرنے کا ارادہ کیا، تو اس سے پہلے ہی ایک دن وہ بھری ہوئی ان کے پاس پہنچ گئیں اور بغیر کسی تمہید کے لٹھ مار تے ہوئے بولیں۔

” بھئی میں نے کہہ دیا ہے سلمان بھائی، میں کسی کے پیچ میں نہیں پڑوں گی، کل کو توئی بات ہوئی تو سب میرے ہی چار بال اتارنے کو دوڑیں گے۔“
 ” خیر سیت! بغیر سیت!“

سلمان بھائی چونکے۔
 ” آپ لوگوں کا معاملہ ہے آپ لوگ خود ہی سمجھ لئے۔“ نتیجہ بیگم نے کہا۔
 ” آخر ہوا کیا؟“

” آپ کو بنفشتہ باجی پسند ہیں تو چچی جان سے کہئے، چھوٹے چچا سے کہئے۔“
 ” مگر اس کے دل کا حال تو معلوم ہو۔“

” جب اماں بیگم ان کی مرضی معلوم کریں گی تو اپنے آپ ہی دل گروے کا حال معلوم ہو جائے گا۔“

” مگر اس طرح تو....“

” نہ اس طرح نہ اس طرح، اگر آپ اس چکر میں ہیں کہ وہ خود بخود کہ آپ سے عشق بگھاریں گی۔“

” لیٹے رہئے آرام سے“

” کوئی بات ہوئی تمہاری اس سے؟“

”ہوئی کیوں نہیں اور کوئی ایک دفعہ ہوئی“ شجوبیگم کاٹ کھانے کے لئے تیار ہیں۔

”وہ کیا کہتی ہے؟“

”کہیں گی کیا؟ ان کی تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتا“

”کیا سمجھ میں نہیں آتا؟“

”اب یہ آپ انہی سے پوچھئے گا۔ میں تو جب بھی پوچھتی ہوں وہ یہی جواب دیتی ہیں۔“

”اور ہاں، وہ آپ کی اماں سے بہت ڈرتی ہیں اور انہیں آپ کے گھر کا ماحول بھی پڑ نہیں“

شجوبیگم نے جلدی جلدی لگاس کاٹی۔

”بس یا الکیچہ؟“ سلیمان بھائی مسکرائے۔

”اور کچھ کیا؟ میں اپنے پاس سے گھر کر تباؤں؟“

”نہیں جناب، بہت بہت شکریہ اس ساری کارگزاری کا، باقی معاملہ میں خود دیکھ لوں گا۔“

سلیمان بھائی اس کے غصے سے غلط ہو کر بولے۔

”لیکن ساری کا لداویوں سے وقتاً فوقتاً مجھے مطلع ضرور کرتے رہئے گا“ شجورانی نے جاتے جاتے کہا۔

”بہت بہتر۔۔۔۔۔“ سلیمان بھائی نے کہا۔

اور شجوبیگم اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔

اسی روز۔۔۔۔۔ شام کو جب دادی اماں عصر کی غاز اور تسبیح پڑھ کر فرشتہ سے بیٹھی بنشہ سے ”حق و باطل“ پڑھوا کر سن رہی تھیں تو سلیمان بھائی آدھکے بنشہ کو دہاں دیکھ کر ان کا کئی چٹانک خون بڑھ گیا اور بنشہ کی ان کو دیکھتے ہی سٹی گم ہو گئی۔ ابھی بھی بیٹھی تھی ایک دم چہرے کا رنگ بدل گیا اور دل میں دھکے دھکے بھی ہونے لگی اس نے کتاب سے پرہیز کر لیا اور کتاب بند کر دی اور خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ دادی اماں بھی تخت پر ایک طرف لٹک کر بیٹھ گئیں اور اپنے لٹولے کے لئے ڈھیر ساری جگہ بنا دی سلیمان بھائی انہیں سلام کر کے بڑے مذہب انداز سے قریب بیٹھ گئے۔

دادی اماں نے دعائیں دینے کے ساتھ ساتھ دست شفقت بھی پھیرا جس سے سلیمان بھائی اگسائے کیونکہ ایسے میں انہیں ہمیشہ اپنے بالوں کا خیال آتا تھا جنہیں وہ کیر کر لگا کر بیڑی تار اور پیار سے سجاتے تھے۔ دادی اماں کی خبر سیت پوچھنے کے دوران وہ کنگھیوں سے لڑکا جائزہ بھی لیتے رہے بلکہ دو چار دفعہ تو بیڑی دیدہ دیر سے اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت کا بغور جائزہ لیا۔

بنشہ غریب حالانکہ سر جھکا لئے بیٹھی تھی۔ لیکن سلیمان بھائی کی پرشوق نگاہوں کی تیش سے کیسے بچتی؟ پلکوں کی جھلکی حلیمین مسلسل کانپ رہی تھی۔ ہونٹوں کے گوشوں میں بھی بڑی ہی جنش تھی۔ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ سلیمان بھائی جلدی سے وہاں سے میلے نہ لے کر سلیمان بھائی اسے دیکھ کر وہاں سے جلدی کیسے کیسے نکلے۔ اس کو اس قدر زور دے دے دیکھا تو اور بھی جرم کر بیٹھ گئے اس سے بات بھی کرنا چاہتے تھے اور یہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کریں؟ کس طرح شروع کریں؟ ایک لڑکی ان کی چھوٹی چھوٹی باہر لگا رکھیوں میں اور زیادہ چمک پیدا ہوئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ

دلدار سنبھل کر بیٹھ گئے۔

”دادی اماں؟“

انہوں نے بڑے دلدار سے انہیں پکارا۔

”ہاں بیٹے؟“

دادی اماں نے ان سے بھی زیادہ دلدار سے جواب دیا۔

”بنفشہ سے میری دوستی کروادیتے تھے۔“

انہوں نے کسی معصوم بچے کے سے انداز میں کہا۔

”اے ہے، تو کیا تم دونوں کی لڑائی ہے آپس میں؟“

دادی اماں چونکیں۔

”جی۔“

سیلان بھائی کی مسکین صورت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”کیوں؟ کس بات پر جھگڑ بیٹھے تم دونوں؟“

دادی اماں کی تشویش اور زیادہ بڑھ گئی۔

”میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا دادی اماں، بس اس نے خود ہی مجھ سے بولنا شروع کیا۔“

”سچ کہو بیٹے؟“

دادی اماں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”ہیں تو جھوٹ بولتا ہی نہیں۔“

سیلان بھائی نے بڑی معافی سے جھوٹ بولا۔

”وہ تو بڑی غریب بات ہے تم لوگ اتنے بڑے ہو کر لڑو ہو۔“

دادی اماں بے چاری بڑی نگرہ مند ہو گئیں۔

”دیے مجھے میرت ہی ہو رہی ہے اس بات پر، یہ بچی نور نے جھگڑنے والی بالکل نہیں ہے۔“

دادی اماں نے کہا۔

سیلان بھائی گھٹے دار سی بنے بیٹھے رہے۔

”اگر اس کی بجائے تم نے شیخ کا نام لیا ہوتا، تو مجھے یقین بھی آ جاتا۔ یہ غریب تو اللہ کا گناہ ہے۔“

”مگر شیعہ نواسٹریاں کی شیرنی ہے، وہی اسے اٹنی پٹی پڑھاتی ہے۔“

سیلان بھائی نے جھپٹ میں نور اچھکاری لگائی۔

بنفشہ — جو یہ ساری باتیں سن کر بالکل سہمی ہوئی کمونڈی بنی بیٹھی تھی، الٹی دیاں

شیرنی والی بات سن کر بڑی شکل سے اپنی ہنسی روک سکی ہونٹوں کو بڑی طرح بھینچ

بیٹھ گئی لیکن مسکراہٹ تو پھر بھی نہ چھپ سکی۔

”شیخ تو فرود ہے زبان اس کی بیشک پانچ ہاتھ کی ہے گمیرہ پی ڈی پڑھانے کا

نور غریب بھی نہ جانتے ہے۔“

دادی اماں نے بڑے انصاف سے کام لے کر کہا۔

”تو پھر اس سے پوچھئے، یہ کیوں لڑتی میرے ساتھ؟“

سیلان بھائی نے نور اموقتے سے فائدہ اٹھایا۔

دادی جان نے جلدی سے بنفشہ کی طرف دیکھ کر سوال و جواب کے ڈر سے مسکرا کر

بڑا ناب بھول کر پریشان نظروں سے دادی اماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”کیوں بنفشہ؟ کیا بات ہوئی؟“

دادی اماں نے بڑے پیار سے پوچھا۔

”میں تو نہیں میں نے تو کچھ بھی.....“

بنفشہ ایک دم بوکھلا گئی۔

”کوئی بات ہوئی ہے تو بتا دو بیٹی۔“

”دادی اماں، مجھے تو پتا ہی نہیں آتا۔“

بنفشہ نے جلدی سے کہا۔

”ہاں ہاں، وہ تو میں بھی جانوں ہوں، لیکن کبھی کبھار ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے

دادی اماں نے اس کی دھارس بندھائی۔

”ہاں ہاں بتا دو نا، دادی اماں ڈانٹیں گی، غصہ ہوگی۔“ سلیمان بھائی نے بیچ میں تو

بنفشہ نے سو دینے والی نگاہوں سے سلیمان بھائی کی طرف دیکھا۔

”ڈانٹنے کا کیا سوال ہے، اگر کوئی بات ہوگی تب بھی نہیں ڈانٹوں گا“

دادی اماں نے کہا۔

بنفشہ بے بسی کے عالم میں کبھی سلیمان بھائی کی طرف دیکھتی تھی، کبھی دادی

کی طرف۔

اور جب دادی اماں نے مزید اصرار کیا، تو اس نے یہ کہہ کر رونا شروع کر دیا۔

”دادی اماں، میں تو کسی سے بھی کچھ نہیں کہتی۔“

اس کو روتا دیکھ کر سلیمان بھائی بیٹھائے، دادی اماں بھی اور زیادہ پریشان ہو گئی

سلیمان بھائی کی اور کچھ سمجھ میں نہ آیا، تو عبوراً سچ بول کر پڑا۔

”دادی اماں، میں تو مذاق کر رہا تھا۔ اس بے چاری نے واقعی کچھ نہیں کہا۔“

”تم لوگوں کی باتوں کا کچھ پتہ نہ چلے ہے۔“

دادی اماں بولیں۔

”لوگوں کے دادی اماں، اس قدر چھوٹا دل ہے اس کا؟ ذرا مذاق نہیں برداشت

کر سکتا۔“

سلیمان بھائی نے لپٹا پوتی کرنے کی کوشش کی۔

”میں بھی یہی سوچ کر حیران تھی کہ اس بے چاری کے منہ میں تو زبان ہی نہیں ہے۔“

دادی اماں اپنی ہی جیرونی پریشانی کا ذکر کر کے جا رہی تھیں۔

”دادی اماں، بات دراصل یہ تھی کہ میری طرف آتی ہی نہیں، اس لئے میں سمجھا کہ

ٹائیڈر مجھ سے ناراض ہے۔“

”اے تمہاری طرف جا کے کرے بھی کیا؟ صوفیہ کے تو پاؤں ہی نیس ٹکے ہیں کسی

لٹ گھریں۔ وہاں جا کے دیواروں سے تو بات کرنے سے رہی۔“

”میں تو ہوتا ہوں گھر میں، مجھ سے بات نہیں کر سکتی؟“

”تم بھی کوںسا لگو ہو گھر میں، اب کلب جانے کی ات نہیں بھی ہے۔“

”اب کہاں جاتا ہوں؟ اب تو سب کچھ چھوٹ گیا۔“

سلیمان بھائی نے بڑے عجیب سے لہجے میں کہا۔

دادی اماں بنفشہ کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”آتی ذرا ذرا سی بات پر کیوں رونے لگو ہو تم؟“ لڑکوں کی تو عادت ہو رہی ہے مذاق

کرنے کی۔“

دادی اماں نے اپنے دوپٹے کے انچل سے اس کے آنسو پونچتے ہوئے کہا۔
 دادی اماں نے بڑی مشکل سے چکار پکپکار کر اسے چپ کر لیا، تو سیماں بھاؤ
 ایک نیا شوشہ چھوڑا۔
 ”اچھا دادی اماں، اگر یہ ناراض نہیں ہے تو اس سے کہئے کہ میرے ساتھ چل کر
 کیرم کھیلے۔“
 ”جاؤ بیٹی، چلی جاؤ۔“

دادی اماں جلدی سے بولیں۔
 بنفشہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔
 جب دادی اماں کا امر اڑ بٹھا تو اس نے بہانہ بنا دیا۔
 ”اب تو مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔“
 ”ابھی کہاں، ابھی تو بیس منٹ باقی ہیں۔“
 سیماں بھائی جلدی سے بولے۔
 ”ہاں، ابھی تو وقت ہے۔“
 دادی اماں نے بھی تائید کی۔

بنفشہ کو عبور اٹھتے ہی بی بی پڑی۔ وہ مڑے مڑے قدموں سے سیماں بھائی کے
 ساتھ چل دی۔
 سیماں بھائی کی طرف سوائے ملازموں کے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ بنفشہ کو لئے ہوئے
 لان میں آگئے۔
 ”ہاں جناب، بیٹھے۔“

وہ کمرہ سی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔
 بنفشہ نے بڑی سعادت مندی سے حکم کی تعمیل کی۔
 ”کچھ ناراض ہو گئے؟“
 سیماں بھائی سانسے والی کمرہ سی پر بیٹھ گئے۔
 ”نہیں۔“ بنفشہ کی آواز مدہم تھی۔
 ”پھر؟ خوش ہو؟“

سیماں بھائی سکڑ گئے۔
 اس بات کا بنفشہ کی جواب دہی؟ خاموش رہی۔
 سیماں بھائی اس کے چہرے پر نظر میں جمائے کچھ سوچتے رہے پھر اس کی طرف اُترے
 بک کر بولے۔
 ”میں نہیں بہت برا لگتا ہوں بنفشہ؟“
 ”نہیں تو۔“
 ”بہت اچھا لگتا ہوں؟“
 سیماں بھائی ذرا ستور ہو کر بولے۔
 ”معلوم نہیں۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
 سیماں بھائی نے کہا۔
 بنفشہ کی جھکی ہلکی بہت اہستہ سے کانپ کر رہ گئیں۔
 ”اب دیکھو نا، مجھے اپنے بارے میں معلوم ہے کہ تم مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔“

سلمان بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

”میں نے سنا ہے تم میری جی سے بہت ڈرتی ہو۔“

سلمان بھائی مسکرائے۔

بنفشتہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”اچھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تمہیں ہمارے گھر کا ماحول سخت ناپسند ہے۔“

سلمان بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

بنفشتہ سمجھ گئی کہ یہ ساری کارستانی تجویج کی ہے۔

”اگر سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہوا تب تو تمہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا؟“

سلمان بھائی صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

”جی“

بنفشتہ ایک بار پھر گھبراتا، مگر منہ سے بیٹھی رہی۔

”میری بات کا جواب تو دو دلوں یا نہ میں“

”میں کیا جواب دوں؟“

بنفشتہ کی آواز بڑی مشکل سے نکلی۔

”ٹھیک ہے، تمہارے پاس کوئی جواب ہو یا نہ ہو۔ میں تو آج جی سے کہہ دے گا۔“

داؤدی اماں سے بات کر لیں۔“

سلمان بھائی نے ایک دم دم دھکی دی۔

بنفشتہ نے ان کی طرف دیکھا، وہ بہت سنجیدہ تھے۔

”پھر غصے کوئی الزام مت دینا، سیدھی طرح کوئی بات ہی تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔“

سلمان بھائی نے رعب بھاڑا۔

بنفشتہ نے پھر بھی کچھ نہیں کہا تو سلمان بھائی بڑی طرح چڑ گئے۔

”ہر وقت گونگے کا گلو کھائے بیٹھی رہتی ہو۔ یہ کوئی بہت اچھی بات نہیں ہے۔“

اتنی ڈانٹ ڈپٹ سن کر بنفشتہ نے نئے سرے سے رونے کی تیاری کی تو سلمان بھائی

بھانے نرم پڑنے کے غصے میں آ گئے۔

”بس یہ آسان ہے، سامنے والے کو پاگل بنا کر بٹھا دو اور خود رونا شروع کر دو۔“

بنفشتہ نے جلدی سے آنسو پونچھ لئے اور پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔

”میں نے کس کو پاگل بنایا؟ میں تو بلا ضرورت کسی سے بات بھی نہیں کرتی ہوں۔“

”مجھے پاگل بنایا، اور کس کو بناؤ گی؟“

بنفشتہ کا گلہ زندہ کیا، کچھ بولنا چاہتا تو آواز ہی نہ نکلی۔

”میرا سارا سکون ختم کر کے رکھ دیا ہے تم نے۔“

سلمان بھائی نے کھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں آپ سے کیا کہتی ہوں؟“

بنفشتہ نے بڑی مشکل سے آواز نکالی اس کا تو اس وقت چیخ پیچ مگر رونے کو دل

پاہہ ہاتھ، مگر میاں تو عالم یہ تھا کہ ماہو اور رونے بھی نہ دے، غریب کیا کرتی؟ اندر ہی

ازدھٹ رہی تھی۔

”اے بابا، رونا تو اسی بات کا ہے کہ تم کچھ کہتی ہی نہیں ہو۔“

سلمان بھائی کچھ عاجز آ کر بولے۔

”آپ بتا دیجئے کہ کیا کہا کر رہا؟“

”میں کیا بتا دوں؟ مجھے کیا معلوم تمہاری کیا مرضی ہے؟“

سیمان بھائی کا رعب و بدربہ کچھ زیادہ ہی خفت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

”میری تو کوئی مرضی ہی نہیں ہے۔“

”ہاں تمہیں کیا؟ تمہاری بلا سے کوئی جہنم میں جائے۔“

سیمان بھائی نے کھانسنے والی نفروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں تو ہیر پیر مطلب تھوڑی ہے۔“

بنفشہ نے بڑے بھولپن سے کہا۔

”پھر کیا مطلب ہے؟“

”میں تو..... میں تو ہمیشہ دوسروں کی ہی مرضی پر چلتی ہوں۔“

بنفشہ کے لیے میں کسی قسم کی کوئی بناوٹ نہیں تھی اسلئے افسرہ چہرے اور پُریم اکھنڈ

ساختہ بات کہی تھی۔

سیمان بھائی کا سارا عقدہ سارا رعب ایک دم کا فوہ ہو گیا۔ ان کا دل چاہا اور بے

چاہا، وہ آگے بڑھ کر اس معصوم اور سیدھی سادی لڑکی کو گھٹے سے لگائیں مگر یہ یورپ

نہیں تھا اور نہ بنفشہ کوئی شرخ و چینیل تیلی تھی۔ وہ اس کی طرف والہانہ انداز سے دیکھ

رہ گئے۔

بنفشہ کی جھکی پلکیں اٹھیں اور جب اس نے سیمان بھائی کو اس انداز سے دیکھتے پایا

وہ سادی جان سے کانپ گئی۔ اس کے لئے سیمان بھائی سے مزید نظر ملانا مشکل ہو گیا

دل چاہا اور اس جگہ سے اٹھ کر بھاگ جائے مگر وہ اتنی بہادور کبھی بھی نہیں رہی تھی۔

چپ چاپ گزر رہے تھے نہ سیمان بھائی کی والہانہ نگاہوں کا تسلسل ٹوٹ رہا تھا اور نہ

لٹکی لکڑی کی لہر شرم ہو رہی تھی۔

”میں نے تمہیں بہت ڈانٹا ہے بنفشہ! لیکن میں معافی میں مانگوں گا۔“

کچھ دیر بعد سیمان بھائی نے بڑی آہستگی سے کہا۔

اور بنفشہ کی یہ سوچ کہ جان میں جان آئی مگر سیمان بھائی کی نگاہوں کا اندازہ تو یقیناً

بدل گیا ہو گا۔ اس نے بڑی ہمت کر کے ان کی طرف دیکھا۔ سیمان بھائی اس کے چہرے

پر نفوس جاتے بڑی سنجیدگی سے کچھ سوچ رہے تھے۔

اسی وقت مغرب کی اذان ہوئی۔

بنفشہ سر پہ آنچل ڈالتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔

”اب میں جاؤں؟“

اس نے آہستہ سے پوچھا۔

”جاؤ! لیکن.....“

سیمان بھائی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

بنفشہ نے سواہر نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”کچھ نہیں، اب جو کچھ مجھے کہنا سنا ہو گا تم سے نہیں، بلکہ امی اور دادی اماں سے

لگا۔“

بنفشہ ان کی یہ بات سن کر نہ شرمائی نہ لجائی، چپ چاپ آہستہ قدموں سے

پانی گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔

لیا تھا، بس جلال ہی جلال رہ گیا تھا اور اس لحاظ سے شجورانی کا یہ کہنا ٹھیک تھا کہ اب
کا نام شہزادے میاں کے بجائے شہنشاہ میاں ہونا چاہیے تھا ویسے انہیں تو اس بات
بھی شہرہ ہی تھا کہ وہ کبھی شہزادوں جیسے جلال کے مالک رہے ہوں گے۔ صاف گڑبڑ
والی بات لگتی تھی وہ شہزادے میاں کے قصبے سن سن کر دل ہی دل میں سوچا
تو تھیں کہ اسے بھی چلو، رنگ بیماریوں کے سبب اڑ کر منو لایا تو کیا قدر بھی گھس گیا؟
راک فتنے کو کیا ہو گیا؟ اللہ کے فضل سے ان کو کبھی چچک بھی نہ ہوئی تھی جو صورت
دے بگڑ جاتی۔

اور پھر شجورانی کی سمجھ میں ”شہزادوں جیسے جلال“ والی بات بھی کبھی نہیں آئی تھی
شہزادوں کی شکل و صورت کے لئے اللہ میاں نے کوئی الگ سا پتھر بنلے کھچھوڑا ہے
انہوں نے صورت اور بڑا حسین بنا، کہ بھئی، سارے شہزادوں کی صورت اسی سانچے میں ڈھالی
گئی۔ یہ بات کس کتاب میں؟ اور کس صفحے پر لکھی ہوئی ہے کہ سارے شہزادے حسین و
ارہتے ہیں؟ بھئی جیسے دنیا کے دوسرے جوان مرد ہوتے ہیں کوئی اچھا اور کوئی بُرا۔
مڑا کوئی دبلا، کوئی ٹانگ کوئی لمبا، کوئی گودا اور کوئی کالا، ویسے ہی شہزادے بھی ہوتے ہیں
بالا اور عجب دیدار والی بات تو صرف سمجھ میں آتی ہے کیونکہ ان کی پرورش
ایسے ماحول میں ہوتی ہے، تربیت ہی کچھ اس انداز سے ہوتی ہے اور پھر زرد و جاہر
الائی تو انسان میں رعب دیدار پیدا کرتی یا کرتی ہے۔

شہزادے میاں کا اصل قصبہ تھا کہ ان کے پاس بی۔ اے کی ڈگری تھی۔ ایم۔ اے
لے نہیں کیا تھا کہ نوکری کرنی نہیں تھی تو ڈیڑھ کپڑے چیرتھے؟ کس کھیت کی مولیٰ ہے؟
ہدایت کا شور بہتے؟ نوکری تو ان کے باپ یعنی پھوپھا ابلانے بھی نہیں کی تھی؟

سیماں بھائی اپنی مہمی سے نفقہ کے بارے میں بات کرنے کے لئے ابھی سوچ رہی تھی۔
تھے کہ ان کی مہی کو سڑ چلی گئیں۔ ان کے پھوٹے بھائی کا گردے کا آپریشن ہوا تھا، طبیعت
کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ سیماں بھائی کا معاملہ کھٹائی میں بڑھ گیا۔

دوسری طرف گھر میں ایک نئی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ اچھے بھلے دن گزر رہے تھے
کہ ایک دن بڑے زور کا بم پھٹا اور ہم اس وقت بیٹھا جب بڑی پھوپھی جان اپنے ذرا
ارجنہ شہزادے میاں کا رشتہ آیا جان کے لئے کھڑے کھڑے۔

شہزادے میاں کا اصلی نام تو زبیر احمد تھا، لیکن چار بہنوں کے اکوڑتے بھائی تھے
پہلو بھئی کی اولاد تھے اور بقول پھوپھی اماں اور اماں بیگم کے بچپن میں بہت حسین تھے
شہزادوں کا سا جمال تھا اور شہنشاہوں کا سا جلال تھا۔ جمال و مال تو اللہ جانے کدھرا

دن کی مالک تھیں، کوئی فضول قسم کی بات تو ان میں نظر ہی نہ آتی تھی، لیکن سسرال
 نہ کے قہوڑے عرصے بعد انہوں نے تو ایسا چولا بدلا کہ کسی کی پہچان ہی میں نہ آتی تھیں
 بان کی بات تو یہ تھی کہ اس میں قصور ان پیاروں کا نہیں تھا بلکہ ان کے سسرال
 کا تھا، پھر بھی اماں تو اس گھر کی بہو بن کر گئی تھیں، ساس بن کر نو گئی نہیں تھیں، جیسا
 نہ اندھ احوال دیکھا اسی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیا۔ ایسا نہ کرتیں تو سواسے
 سسرال والوں کے طفول کے ان کے حصے میں اور کچھ بھی نہ آتا ان کے سسرال والے
 ب کے سب بڑی عجیب و غریب عادتوں کے مالک تھے۔ عقیدہ سب کی ناک پر دھرا
 ہا تھا۔ ہٹ دھرمی میں ہر شخص دوسرے سے بڑھا ہوا تھا، تعلیم کا کوئی زیادہ چرچا
 نہ تھا، شترادے میاں کی چار بہنوں میں سے کسی نے میٹرک پاس کر کے چھوڑ دیا تھا
 یا نہ ڈل کسی نے ساتویں جماعت پاس کر لی تھی اور کوئی نوں پاس۔

پیسے کی فراوانی کے سبب فضول قسم کی جاہلانہ رسموں پر خوب اتلے تلکے ہوتے تھے
 ہا کی مسلمان پر روپیہ پانی کی طرح بہا یا جارہا ہے کبھی عقیقے پر منگنی کی تقریب پر
 نادائی کی تقریب کا ساسماں ہے تو مونچھ کا نوڈا بھرنے کی تقریب پر منگنی کی تقریب کی
 ہی کیفیت ہے گھر میں اللہ کا فضل ہے، ہر چیز موجود تھی، مگر گھر ہمیشہ کسی کھاڑی
 لاکھ کا اس نقشہ پیش کرتا تھا۔ نہ کسی قسم کی کوئی ترتیب تھی نہ صفائی، ہاں! یہ بڑی
 برت کی بات تھی کہ وہ لوگ اپنی صفائی کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ گھر کی عورتیں
 ملازمہ دھو کہ قیمتی اور قیمتی جوڑے زیب تن کرتی تھیں، اور کپڑے دھونے والی
 عورت روزانہ ان قیمتی کپڑوں کو صابن میں لیتھ کر بڑی بیداری سے موٹے سے
 لڑے سے کوٹتی تھی۔

بلکہ خود ان کے باپ نے بھی نہیں کی تھی۔ پچھلی صدی میں ان کا خاندان چمڑے کا
 کا خاندان کہلاتا تھا اور وہ یوں کہ چمڑے کا رو بار ہوتا تھا ان کے یہاں سیرکار کی ٹا
 ان کے یہاں کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اس پر دوسرے ہی لغت بھی جاتی تھی۔ دلا
 چمڑے کے کاروبار میں خوب نام پیدا کیا۔ بیٹے صاحب بھی کافی عرصے تک چمڑے کا
 منگتے رہے۔ دل بھر گیا۔ دل کا تو خیر کیا ذکر؟ جب اس کا دبا میں زیادہ ملا
 امید نہ رہی، تو گھر یوں کا کاروبار شروع کر دیا اور پوتے میاں یعنی شترادے میاں نے
 کاروبار پر ہاں نہ بنایا، تو آہستہ آہستہ باہر اجاس خود نو بن گئے اور کیونکہ دنیا میں رہ
 ماؤ بیچ سے بہت اچھی طرح واقف تھے، اس لئے کاروبار دن بدن مزید
 رہا تھا، بلکہ چمڑے چمڑے رہا تھا اور قینا اسی چمڑے چمڑے امل بیگم کی آنکھوں کو بچا
 کر دیا تھا۔

شترادے میاں کا قد درمیانے سے ذرا چھوٹا ہی تھا، نہ دھیلے تھے نہ مو
 آنکھیں چھوٹی، ناک قدر سے موٹی، دھانہ بھی ٹھیک ہی تھا اور بال ان کے اس
 زبردست گھوٹکے پر لے تھے کہ کمرا نیوں کے بالوں کا ساحلیہ ہو گیا تھا، مگر شترادے
 اپنے بالوں کو بڑا خوبصورت سمجھتے تھے مجموعی طور پر اگر شترادے میاں کا جائزہ
 تو وہ قطعی برے نہیں نظر آتے تھے۔ انسان کے قبول صورت بچے نظر آتے تھے، ا
 اصل میں ان کی فضول قسم کی اداؤں نے ملا تھا۔ پھر ان کے متعلق کسی بوٹی بہ بار
 بھی زیادہ کھلتی تھی کہ وہ پہلے جین و جیل رہے تھے۔ بس اسی حسن و جمال کے
 قصے نے ان کی معقول صورت کے لئے بھی دلوں میں رتی بھر جگہ نہ چھوڑی تھی۔
 وادی اماں کا کہنا تھا کہ مجھ بھی اماں جیسا کہ اپنے میکے سے گئی ہیں تو

نہجورانی کی سمجھ میں صفائی کی یہ قسم کبھی نہیں آئی تھی گھر گندا ہے، باورچی ہا
ہے، اگر خود قیمتی جوڑوں میں بلوس عطر تیل اور جلیل میں اپنے آپ کو بسا
ٹھنی بیٹھی ہیں۔

ایک اور بڑی عجیب رسم ان کے یہاں اور بھی تھی اور وہ گھر دامادی کی رسم
پوری کوشش یہی کی جاتی تھی کہ لڑکا گھر داماد بن کے رہے مگر ہر ایک پر توڑ
چل سکتا تھا، اس کوشش میں کبھی کامیابی ہوتی تھی اور کبھی نہیں ہوتی تھی۔
نتیجہ بیگم کے گھر میں ہم بیٹھے کسی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ بھوپچی اماں شہزاد
میاں کا رشتہ آپا جان کے لئے نہ کر آئی تھیں، بلکہ میاں گھیلے بازی کچھ دوسری
تھی۔ اور وہ گھیلے بازی یہ تھی کہ آپا جان کے من مندر میں کوئی اور ہی سامیا ہوا تھا
جانے کب سے؟ اب کسی کو کیا معلوم؟ اور کسی کو یہ بات چاہے معلوم تھی یا نہیں
گھنی چھٹ باجی کو سو فی صد معلوم تھی۔ آپا جان کی ہمارے جو یقین وہ، لیکن وہ بھی ہم
کی بنی ہوئی تھیں کہ کسی کو بھاپ تک نہ لگنے دی۔

ہر گوری کے من مندر میں کوئی نہ کوئی بانکا سیلا، پھیل چھیللاس ہی جا رہا
یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی اور اس پر شاید ماں بیگم بہت زیادہ چراغ پا بھی نہ
اگر خاندان کا کوئی لڑکا ہوتا۔ یہاں تو قیامت صغریٰ اس لئے ٹوٹ پڑی تھی کہ
کے من مندر میں چپکے سے سامنے والے ان کے بیچارے منٹ کے ڈاکٹر و می تھے،
لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ڈاکٹر و می کے من مندر میں آپا جان کی باتیں تھیں
تو بعد میں شہزادانی نے چھٹ باجی کے حلق میں انکی ڈال کر اگلو آئی تھی کہ آپا جان
کو تو یہ بات معلوم بھی نہیں تھی اور نہ ہی پہل ان کی طرف سے ہوئی تھی کیونکہ جس

نہجورانی کی سمجھ میں صفائی کی یہ قسم کبھی نہیں آئی تھی گھر گندا ہے، باورچی ہا
ہے، اگر خود قیمتی جوڑوں میں بلوس عطر تیل اور جلیل میں اپنے آپ کو بسا
ٹھنی بیٹھی ہیں۔

ایک اور بڑی عجیب رسم ان کے یہاں اور بھی تھی اور وہ گھر دامادی کی رسم
پوری کوشش یہی کی جاتی تھی کہ لڑکا گھر داماد بن کے رہے مگر ہر ایک پر توڑ
چل سکتا تھا، اس کوشش میں کبھی کامیابی ہوتی تھی اور کبھی نہیں ہوتی تھی۔
نتیجہ بیگم کے گھر میں ہم بیٹھے کسی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ بھوپچی اماں شہزاد
میاں کا رشتہ آپا جان کے لئے نہ کر آئی تھیں، بلکہ میاں گھیلے بازی کچھ دوسری
تھی۔ اور وہ گھیلے بازی یہ تھی کہ آپا جان کے من مندر میں کوئی اور ہی سامیا ہوا تھا
جانے کب سے؟ اب کسی کو کیا معلوم؟ اور کسی کو یہ بات چاہے معلوم تھی یا نہیں
گھنی چھٹ باجی کو سو فی صد معلوم تھی۔ آپا جان کی ہمارے جو یقین وہ، لیکن وہ بھی ہم
کی بنی ہوئی تھیں کہ کسی کو بھاپ تک نہ لگنے دی۔

ہر گوری کے من مندر میں کوئی نہ کوئی بانکا سیلا، پھیل چھیللاس ہی جا رہا
یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی اور اس پر شاید ماں بیگم بہت زیادہ چراغ پا بھی نہ
اگر خاندان کا کوئی لڑکا ہوتا۔ یہاں تو قیامت صغریٰ اس لئے ٹوٹ پڑی تھی کہ
کے من مندر میں چپکے سے سامنے والے ان کے بیچارے منٹ کے ڈاکٹر و می تھے،
لفظوں میں یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ ڈاکٹر و می کے من مندر میں آپا جان کی باتیں تھیں
تو بعد میں شہزادانی نے چھٹ باجی کے حلق میں انکی ڈال کر اگلو آئی تھی کہ آپا جان
کو تو یہ بات معلوم بھی نہیں تھی اور نہ ہی پہل ان کی طرف سے ہوئی تھی کیونکہ جس

پھر چھٹ باجی نے بڑی ہمت کر کے قدرے زور سے کہا۔

”آپا جان راضی نہیں ہیں۔“

پھر تو امان بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ کچھ دیر تک، بڑے غور سے چھٹ باجی کا کہہ اسنے ہو کش و حواس میں ہی یہ بات کہہ رہی ہیں یا.....!

مگر چھٹ باجی کے حواسوں کو بھلا کیا ہونا تھا، دیکھنے میں بالکل نارمل لگا۔
”ہاں، حواس گم ہونے کی باری تو امان بیگم کی تھیں۔“

”کیوں راضی نہیں ہے؟ کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔“

امان بیگم کی پیشانی پر ہلکی سی تیوریاں نظر آئیں۔

”وہ کہتی ہیں ابھی تو میں پڑھ رہی ہوں۔“

چھٹ باجی نے طے شدہ پروگرام کے مطابق مکالمہ بولا۔

”اب کے دن کی پڑھائی باقی ہے، صرف امتحان ہی دینا تو باقی ہے۔“

امان بیگم بولیں۔

”ایم۔ اے کے بعد ریسرچ کرنے کا ارادہ ہے ان کا۔“

چھٹ باجی نے کہا۔

”ہاں، اور اسی ریسرچ میں بوڑھی گھاڑہ ہونے کا ارادہ بھی تو ہے۔“

امان بیگم کے بلڈ پریشر نے ایک ہلکا سا دنگ دکھایا۔

اب بھلا بے چاری چھٹ باجی کیا کہتیں؟ سوچ میں پڑ گئیں، کہ آگے

ڈائلاگ بولیں یا نہ بولیں۔

اس سے کہہ دینا، بس بہت ہو چکی پڑھائی دکھائی۔“

امان بیگم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

”امان بیگم اور اصل بات یہ ہے کہ ان کو یہ رشتہ پسند نہیں۔“

چھٹ باجی نے ہمت کر کے سچی بات کہہ ہی دی۔

”ہاں تو یوں کہنا۔“

امان بیگم ایک دم چپ ہو گئیں۔

چھٹ باجی نے سر جھکا لیا۔

”کیوں؟ کیا برائی ہے اس رشتے میں؟“

امان بیگم نے پوچھا۔

”آپ کو پتہ تو ہے امان بیگم، کہ ان لوگوں کے گھر کا ماحول آپا جان کے لئے مناسب نہیں ہے۔“

چھٹ باجی باقاعدہ بحث کرنے پر تیار نہیں۔

”یہ بات تو لڑکی کے ادب پر ہوتی ہے گھر کا ماحول جیسا چاہے بنالے۔“ امان بیگم نے

سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”پھر بھی امان بیگم چاری کو دیکھ بیٹھے۔“

چھٹ باجی کے بچے میں تاسف تھا۔

”تمہاری بیوی بھی امان کو تو معلوم نہیں کیا ہو گیا تھا؟ ورنہ یہ کوئی ان کے بس سے

اگر کی بات نہیں تھی۔“

امان بیگم نے ابھی بات ختم ہی کی تھی کہ شجورانی۔۔۔ جو بڑی دیر سے باہر کھڑی

لی ہوئیاں رہی تھیں اندر آ گئیں۔ ”بی بی شریف بی بی، امان بیگم کے بلڈ پریشر بیٹھ گئیں۔“

”جب ان کو پسند نہیں ہے یہ رشتہ تو ختم کیجئے اس قصے کو“

شجور بیگم پھر بوڑھی دادی کے انداز میں بولیں۔

”اے ہے اے تم سے کہاں سے آگئیں، ہماری نانی بن کے؟“

اماں بیگم نے آنکھیں نکالیں۔

چھٹ باجی کی ایک دم ہنسی چھوٹ گئی، شجور چپکا گھر اپنی بیٹی رہی۔

”لو اور نہ، جلتی چھوٹی اتنی ہی کھوٹی۔“

اماں بیگم نے شجورانی کی طرف دیکھا۔

چھٹ باجی کی ہنسی کسی طرح رکنے میں ہی نہ آ رہی تھی۔

”گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں بالکل بچی اور

تھک ہوں۔“

شجورانی نے بحث کی۔

”نہیں، تم تو بوڑھی دادی ہو۔“

اماں بیگم نے پھر گھر کا۔

شجورانی نے سر نہ ہٹایا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اماں بیگم کے رعب میں آگئی تھیں

اپنی مسکراہٹ کو چھیلنے کا اور کوئی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا ہی نہیں۔

اماں بیگم پھر چھٹ باجی کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

تم اس سے دوبارہ بات کرنا۔

اماں بیگم نے چھٹ باجی سے کہا۔

”دیکھا ہے اماں بیگم، نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پائت بچکے گئے“

”تم اس سے کم و زرا اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرے۔“

اماں بیگم کے لیے یہ خاصی ملائمت آگئی تھی۔

”رشتوں کا ایسا کال تھوڑی بڑا ہے اماں بیگم، یہاں نہ مسمی کہیں اور ہو جائے“

چھٹ باجی نے ڈرتے ڈرتے یہ بات کہی۔

”کال ہی تو بڑا ہے رشتوں کا، آخر کہاں سے آئیں گے رشتے؟ آسمان سے ٹپکس گے

اماں بیگم قدرے تیزی سے بولیں۔

چھٹ باجی کی یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ آپا جان کا رشتہ تو یہیں زمین پر ہو رہا

بس کچھ دنوں میں آنے ہی والا ہے۔

”خاندان کا لڑکا ہے، دیکھا بھالا ہے، باہر سے کوئی رشتہ آئے تو لڑکا ملنا

لڑکا ہو؟ پھر ذات برادری بھی دیکھنی پڑتی ہے۔“

اماں بیگم تقریر کرنے کے موڈ میں تھیں۔

”لو، اب اماں بیگم کو بڑی، چمڑی اور بوٹی کی پڑی ہے۔“ شجورانی نے دل

دل میں سوچا اور کھٹکھا کر کہ بولیں۔

”آج کل ذات برادری کون دیکھتا ہے؟“

”دیکھنے والے دیکھتے ہی ہیں۔“

اماں بیگم نے کہا۔

”لیکن یہاں تو ساری بات پسند ناپسند کی ہے۔“

شجورانی بڑی سنجیدگی سے بولیں۔

اماں بیگم نے ان کی بات کا کوئی جواب ہی نہیں دیا۔

شجورانی نے پھر ٹھٹھانی کا منظر ہر کیا۔
”تم پھر بولیں، چلو یہاں سے جاؤ، اپنا کام کرو۔“

اماں بیگم نے ڈیپٹ کر کہا۔

مگر وہ شجورانی ہی کیا جو آسانی سے کسی کی بات مان لیں۔ جی بھٹی رہیں۔

اب مشکل تو یہ ہے کہ خاندان میں اول تو یہ کہے ہی کون سے ہیں، اور جیڑا!

کے دماغوں میں اللہ جانے کیا سودا سما یا ہوا ہے؟

اماں بیگم بڑبڑائیں۔

چھٹ باجی اور شجورانی نے ایک دوسرے کی نظر استغما مینہ لگا ہوں سے دیکھا

”شیب میں کیا کمی ہے، ہزاروں میں ایک ہے، تمہاری بڑی اماں کی توبہ خواہش ہے کہ گھر کی لڑکیوں میں سے کسی ایک کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے، گرا کے نام ہی سے بدکتا ہے۔“

اماں بیگم کا چہرہ لمحہ بہ لمحہ پریشان ہی ہوتا جا رہا تھا۔

”اماں بیگم، اگر آپ ناراض نہ ہوں تو ایک بات کہوں؟“

چھٹ باجی نے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکالتے ہوئے کہا۔

”کیا ہے؟ کہو؟“

اماں بیگم نے بیزار سی کہا۔

چھٹ باجی نے سوچا، لوبھی، یہاں تو ابھی سے اس قدر بیزار سی کا عالم ہے

پوری بات بتاؤں گی تو اللہ جانے کیا ہوگا، مگر اب کیا کیا جائے غمخواری ہے، اب کی ہزار اور دس ہزار ہوں تو سب کچھ بھگتا ہی پڑے گا۔ دینی زبان سے بولیں۔

”آپ آپا جان کی فکر نہ کیجیے، سب ٹھیک ہی ہو جائے گا۔“

”فکر کیسے نہ کروں؟ تم نے بڑی آسانی سے یہ بات کہہ دی، جب کل کلاں تم جو ان بیٹی لاں ہوگی تو تمہیں اندازہ ہوگا ہماری پریشانی کا۔“

اماں بیگم جھنجھلا کر بولیں۔

”کچھ دن انتظار کیجئے ان کا رشتہ آجائے گا۔“

چھٹ باجی نے اللہ کا نام لے کر یہ بات کہہ ہی دی۔

”ایں؟ کیا مطلب ہے تمہارا، صاف صاف بتاؤ۔“

اماں بیگم چونکیں۔

ان کے لہجے میں سختی نہیں تھی، اس لئے چھٹ باجی کی ہمت اور بیڑی تھی۔

”اماں بیگم، بات یہ ہے کہ — وہ — یونیورسٹی میں ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔“

وہ آپا جان سے شادی.....“

چھٹ باجی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

اور اماں بیگم کا حال یہ تھا کہ آنکھیں بھیٹی، منہ کھلا، ہانڈ معلق ہو کر رہ گئے تھے عجیب

ہوتی بن کر رہ گئی تھیں۔ یہ لیجئے، آپا جان تو چھی رستم کلی۔ شجورانی دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں۔

”ان کا نام ڈاکٹر وصی ہے، آپا جان کو پڑھاتے ہیں۔“

چھٹ باجی نے اماں بیگم کو خاموش دیکھ کر بات ادا گئے بڑھائی۔

”اچھا بس، آگے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جا کر اپنا کام کرو۔“

اماں بیگم نے اپنا نادشاہی حکم سنایا تو چھٹ باجی نے وہاں سے کھسک جانے

ہی میں عافیت سمجھی، لیکن شجورانی پھر بھی بڑی مستقل مزاجی سے جی رہیں۔

”تم بھی جاؤ۔“

اماں بیگم نے کہا تو شو بیگم کو مجبوراً اٹھنا پڑا۔ انہوں نے چھٹ باجی کا پیچھا پکڑا۔ اتنی بڑی بات کہ کیا مرے سے معصم کئے بیٹھی ہیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں کہا پھر گھنٹہ بھر تک چھٹ باجی کا انٹرویو لینے کے بعد شو بیگم کی نالچ میں کافی اضافہ ہوگا۔ انہیں یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر وصی امریکی ہسپتال، خوش شکل، دلدار، ذرا سانولی، سلونی رنگت کے آدمی ہیں عمر بھی کوئی تیس بیس سال ہے، بہت سنجیدہ اور دینیے رہنے والے ہیں۔ وہ تو آپا جان کی من مو منی صورت نے ان کے دل کی دنیا میں چلنا ورنہ لڑکیوں کے معاملے میں بڑے سخت مزاج آدمی ہیں، لڑکیاں ان کا نام سن کر ہی ڈرتی ہیں، مگر بقول چھٹ باجی کے شکل سیکن پڑی ہے کہ وہ پنجابی ہیں اور سید نہیں ہیں اماں، بڑی، لوٹی اور جڑھی سب کچھ دکھتی ہیں وہ تو سنتے ہی ایک لمبی سی ”ناں“ کہہ دیں گی۔ چھٹ باجی نے یہ بھی بتایا کہ وہ قواب تک رشتہ بھجوا بھی چکے ہوتے، اپنی، کی شادی کے اتنا رین تاخیر ہو گئی۔ اس کا منگیترا اسی جینے باہر سے واپس آ رہا ہے اگر کی سترہ تاریخ کو شادی ہے۔“

یہ ساری گفتا سن کر شو بیگم کی تو بائیں کھل گئیں مگر ساتھ ہی انہوں نے اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں کہ یا یہ بیل کیسے منڈھے چڑھے گی۔

بعد میں اماں بیگم کو ڈاکٹر وصی کے بارے میں ساری تفصیلات معلوم ہوئیں تو وہ ایک لم گہر پڑا۔ انہوں نے رشتہ آنے سے پہلے ہی صاف انکار کر دیا۔

”لوہ اور سلو، غضب خدا کا، اپنوں کو چھوڑ کر غیروں میں لڑکی کو بیاہتے پھر رہے گے۔“

”کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں؟ خاندان کیسا ہے؟ ڈاکٹر بن جانے سے کیا ہوتا ہے؟ لکڑ بھنگی، چمار، دھنسنے، جولاہے سبھی پڑھ رہے ہیں، اپنا شترادہ میاں کیا بڑا ہے؟ لڑکا ہے، کسی بڑی عادت میں نہیں، کوئی فضول شوق اسے نہیں، ماں باپ کا اکٹونا اسے اوروہ اس کے ہاتھ کا میل ہے۔“

اماں بیگم نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی اور بھی بہت کچھ کہا، جو کسی کو یاد رکھ سکی کو نہ رہا۔ دوسری طرف آپا جان بے چاری کی حالت یہ تھی کہ کہاں تو خندوں پہ گلاب کھتے تھے۔ بڑے کیلن شپکتی تھیں اور آنکھوں میں تارے چمکتے تھے، چہرہ ہر وقت مسکراتا ہی رہتا تھا۔ لڑکا کہاں ایک دم پہلی بلدی بن کر رہ گئیں۔ کدھر کے گلاب؟ کہاں کی کلیاں اور کیسے مارے؟ کھانا پینا سب چھٹ گیا، امتحان سر پہ کھڑے تھے اور وہاں یہ ہنگامہ ہو گیا۔ بابے ہی اور بے چارگی کی تصویر بن کر رہ گئی تھیں۔ اس پر سے اماں بیگم کی بڑی زبردست مکی یہ تھی کہ میں تو صفیہ آپا بھجھو بھی جان، ”کوہاں میں جواب دے دوں گی۔“

لدی اماں بھی اماں بیگم کی ہم خیال تھیں۔ بڑی اماں کا وٹ نہ ڈاکٹر وصی کے حق میں خاندانہ شترادہ سے میاں کے حق میں۔ ان بے چاروں کی خواہش تو یہ تھی کہ بڑھتی جانے کے ساتھ آپا جان کا رشتہ ہو جاتا کہ کیا کر تیں؟ بڑھتی کی تو دنیا ہی کوئی اور تھی۔ جوان مانا لڑکے کا گھر زبردستی کر نہیں سکتی تھیں کہ کل کلاں کو بیٹھے ہو کی زندگی عذاب نہ بن جائے۔ ان کا گناہ یہ تھا کہ ڈاکٹر وصی اور شترادہ سے میاں نہ سہی کوئی اور معقول آدمی مل جائے

اس سے تادی کر دی جائے گی۔ دو تین سال میں لڑکی بوڑھی تو ہو نہیں جائے گی۔ آج کل لڑکے میں لڑکیوں کی شادیاں جلدی ہوتی ہیں؟ ہوں گے کوئی سو میں چار پانچ گھر ایسے۔ چھوٹی چچی کا وٹ ڈاکٹر وصی کے حق میں تھا کہ وہ فضول قسم کی باتوں کو نہیں مانتی

اس طرف جانے کی اور کسی کی ہمت تو پڑی نہیں، لیکن شمع بیگم —
 ناگن کو سنا لیںے کی پُرانی عادت تھی، کیسے باز رہ سکتی تھیں۔ اپنے کمرے سے
 لڑائی کی طرح جب باؤں ڈرائنگ روم کی طرف چل دیں، کبھی ایک کھرکی کے
 لکان لگائے کھڑی ہیں، کبھی دوسری کھرکی کے پاس کبھی کسی دروازے کی بھری
 سے کان لگائے کھڑی ہیں، کبھی کسی دروازے کی طرف تاک رہی ہیں مگر مجال ہے جو
 بات بھی صحیح اور واضح طور پر سمجھ میں آتی ہو۔ دل میں جل ہی تو گئیں۔ بڑبڑاتے
 نہ بولیں۔

”توبہ ہے۔ ایسی بھی کیا رازداری؟ یہ لوگ تو ایسی کاناپھوسی کر رہے ہیں جیسے
 بے ہیں کبھی بات معلوم ہی نہیں ہونی ہے۔ آخر کل پر مسوں کبھی نہ کبھی تو بات ہیں
 بتائی ہی جائے گی۔“

انہوں نے چڑھ کر بند دروازوں اور کھرکیوں کی طرف دیکھا اور پرتختی ہوئی اپنے
 رے کی طرف چل دیں۔

چھٹ باجی، آبا جان اور بنفشہ سب وہیں موجود تھیں۔ منہ پر ہاتھ دھرے چکی بیٹھی
 بھی ایک دوسرے کی صورت نکستی تھیں اور کبھی دیواروں اور فرش کو گھورنے لگتی تھیں۔
 شہزادی کے کمرے میں داخل ہوتے ہی چھٹ باجی نے پوچھا۔

”سچو، کچھ سنا دی؟“

”ہنہ، خاک سنا دی دیا، کھیسوں کی طرح تو بھینچتا رہے ہیں یہ لوگ۔“ شہزاد نے
 اپنا ناک پھلاتے ہوئے کہا۔

آبا جان اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئیں، چھٹ باجی بھی ان کی دم بنی پیچھے

تھیں۔ آبا جان اور چچا میاں شہزادی بیباہ کے معاملے میں نئے زمانے کے دلدارہ
 ان دونوں کے نزدیک بہ لڑکے لڑکی کی پسند اور خوشی کا معاملہ تھا۔ ان کا خیال یہ
 لڑکا شریف اور کواہن پال بیٹے اور ساتھ ہی پڑھا لکھا بھی۔

بڑا پاس معاملے میں سب سے زیادہ اہمیت لڑکے کی قابلیت کو دیتے تھے
 انہیں خود کو بہت اہم اور طاقتور سمجھنے کا جہنم کی حد تک شوق تھا۔ لہذا وہ تو ڈاکٹر وصال
 قابلیت کے گرد بہرہ جو کر اپنا دلوں کے حق میں دے رہے تھے۔

یہی حال دادا جان کا تھا۔ لیکن ان کے دل میں سب ایک بات کھٹک رہی
 اور وہ تھی ڈاکٹر وصال کی بچائی ہوئی۔ ایسی بات نہیں تھی کہ وہ چچا بیوں سے الگ
 بلکہ قصہ اصل میں یہ تھا کہ ان کے خیال کے مطابق ان کی پوتی کا گزرا سمران کو گول کے
 میں مشکل تھا۔

گھر کی فضا بڑی عجیب سی ہو گئی تھی کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر
 نہ ہی کسی کو معلوم تھا کہ انٹ کس کر ڈٹ بیٹھے گا؟ گھر کی اس گھٹن آلود فضا
 کو سانس لینے ہوئے چارپانچ دفعت گزر گئے کہ ایک شام دادا جان نے گھر کے
 بڑے افراد کو تنگامی اجلاس کا نوٹس دے دیا۔ جلسہ رات کو ڈرائنگ روم میں
 کے دادا جان کی چیئر میں شپ میں منعقد ہونا قرار پایا۔

چنانچہ رات کو باختر تناؤ لانے کے بعد سب لوگ ڈرائنگ روم میں
 تو معلوم ہوا کہ چیئر مین صاحب شریف نہیں لائے ہیں کچھ لوگ انہیں لینے
 ان کے کمرے میں گئے چیئر مین صاحب جب جلسہ گاہ میں کمرے کی صدارت پر جلو
 گئے تو احتیاط کے طور پر کھرکی دروازے سے بند کر دیئے گئے۔

چل دیں۔

بنفشتہ کوئی کتاب کھول کر زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

شجورانی اپنے بستر پر آڑی ترچھی لیٹ کر سوچنے لگیں۔

”اللہ کرے کل سجاد بھائی اور ثکیل بھیا آجائیں۔“ ممکن ہے آپا

مشکل آسان ہو جائے۔“

ثکیل بھیا اپنی ٹیم کے ساتھ کرکٹ کا میچ کھیلنے لاہور گئے ہونے تھے اور سجاد بھائی
کل دقت بے وقت ہاسپٹل میں ڈیوٹی گننے کے سبب ہاسپٹل ہی میں رہتے تھے۔
سجاد بھائی اپنی بہنوں کے بڑے قابل فخر بھائی تھے۔ جان چھڑکتے تھے۔ اپنی بہنوں پر
بہنوں کو یکے کے حلق سے دوپائی اترتا تھا اور نہ روٹی۔ اور آپا جان
و انہیں کچھ زیادہ ہی پیار سی تھیں۔

شجورانی کو یہ یقین تھا کہ آپا جان کی خاطر سجاد بھائی ضرور ماں جان سے ملکر آجائیں گے
ماری بڑائی اپنے سرے لیں گے۔ لیکن آپا جان کا بیڑا مزور پارگادیں گے۔

اور اس سے اگلے دن ہوا بھی ایسا ہی۔ اتوار کا دن تھا، سب لوگ سجاد بھائی کا
انظار کر کے پانچ منٹ پہلے ہی کھانا کھانے بیٹھے تھے کہ سجاد بھائی اندر داخل

ہوئے۔ سب کو سلام کر کے اورد دعائیں لینے کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنی بھتیجی اورد بھتیجی کی طرف متوجہ ہوئے۔ فردا فردا ایک ایک کا مزاج پوچھا۔ کسی کے سر پر بابت تنہا کی دی کسی کی پیٹھ تھپتھپائی۔ سب آپا جان کا منہ آتا تو سجاد بھائی کی اس شفقت و محبت نے ان کی آنکھیں جھللا دیں۔ ان کا ارادہ بالکل ہی رونے دھونے اور آنسو بہانے کا نہ تھا۔ انہوں نے جلدی سے پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کو پی جانے کی کوشش کی تو رونا پر پھسل پڑے۔

بیک وقت ”ایں یہ کیا؟“ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اس پر باقی لوگ بھی آپا جان کا متوجہ ہو گئے۔ سجاد بھائی کی حیرت اورد پریشانی اس وقت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ”کیا ہو گیا میری بہن کو؟“

”بڑی اماں بولیں۔
شجر کی ہنسی چھوٹ گئی۔“

”بلا وجہ ہنسی کیوں آرہی ہے تمہیں؟“
اماں بیکم نے فوراً ٹوکا۔

شجورانی نے فوراً اپنا منہ بڑی سختی سے بند کر لیا۔

دوسری طرف آپا جان اپنے کمرے میں میز پر سر ٹیکے باقاعدہ سسکیوں سے رو رہی تھیں۔ سجاد بھائی کمرے میں داخل ہوئے تو اس منظر کو دیکھ کر ان کا دل بہت اذردہ ہوا۔ چند سیکنڈ وہ آپا جان کے پیچھے خاموش کھڑے دیکھتے رہے۔ پھر ان کا سر اورد اٹھانے کی کوشش کی، مگر آپا جان نے تو جیسے ماتھے پر گوند لگا کر میز پر سر ٹکا تھا۔ لڑے مس نہ ہوئیں۔

”یہ کیا بے وقوفی ہے؟“

سجاد بھائی نے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

”اچھا سر تو اوپر اٹھاؤ۔“

”لو اور سناو! بے مار کی توبہ۔“

سجاد بھائی نے بڑی نرمی سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اس کے بعد تو آپا جان کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ آہستہ سے کمرے اٹھیں اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔ سجاد بھائی نے سوالیہ نگاہوں سے سب کے چہ کی طرف دلیلا۔ اور خود بھی کمرے سے باہر چلے گئے۔ آپا جان کی پیشانی پر غور و فکر مٹی مٹی مٹی سلوٹیں نمایاں ہوئیں اور اماں بیکم نے زیر لب بڑبڑائیں۔

”لو اور سناو! بے مار کی توبہ۔“

بڑھیا بھی کھانے کی میز پر موجود تھی وہ تو کیونکہ گھر میں رہتے ہی کم تھے۔ انہیں حالات کا پوری طرح اندازہ نہیں تھا۔ انہیں صرف اتنا معلوم تھا کہ آپا جان کا شہزادے میاں کا رشتہ آ رہا ہے۔ اس کے بعد گھر میں کیا کیا ڈرامے ہو رہے سب سے وہ بالکل بے خبر تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے دل ہی دل میں یہ فیصلہ

بڑھتیانے آپا جان کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا، ان کے لمحے میں بے پناہ شفقت تھی۔
سجاد بھائی نے حیران نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گئے کہ آخر
ی کوئی بات ہوگئی۔

”شہسہ! تمہیں میری جان کی قسم، اگر تم مجھ سے کوئی بات چھپاؤ،“

سجاد بھائی نے کہا۔ وہ خاصے پریشان ہو گئے تھے۔

سجاد بھائی نے اپنی قسم دی تو آپا جان سوچ میں پڑ گئیں۔

”شاباش بتا دو“

سجاد بھائی نے کہا۔

”سجاد بھائی نہیں.....“

آپا جان پوری بات کہنے کی جرأت ہی نہ کر سکیں۔

”اے، ہاں کہو!“

”جی۔ میں شہزاد سے میاں سے شادی نہیں کروں گی۔“

آپا جان نے اپنی بات پوری کرتے ہی پھر سکنا شروع کر دیا۔

”شہزاد سے میاں سے؟“

سجاد بھائی کے ادب پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے بڑھتیانے کی طرف اس

فرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں۔

”کیوں بھی؟ یہ صحیح ہے؟“

”آخر یہ کس کا مشورہ ہے؟“

سجاد بھائی نے پوچھا۔

سجاد بھائی نے کہا۔

”ٹھیک سے بات کرو بھی، کچھ پتہ تو چلے۔“

سجاد بھائی نے پیار سے کہا۔

”مگر آپا جان تو جیسے ان کی آواز ہی نہیں سن رہی ہیں۔“

اتنے میں بڑھتیانے بھی پہنچ گئے۔

”دیکھو میں ناراض ہو جاؤں گا۔“

سجاد بھائی نے دھمکی دی۔

آپا جان پھر بھی کچھ نہیں بولیں۔

”بتاؤ نا، میری بہن!“

سجاد بھائی نے بڑی مشکل سے ان کا سراور پڑھایا۔

آپا جان کا چہرہ آسنوڑوں سے تر تھا۔ بڑھتیانے آسنوڑ بھری نگاہوں سے ان کا
دیکھا، لیکن خاموش کھڑے رہے۔

”کوئی بات نہیں سجاد بھائی، بس ویسے ہی.....“

آپا جان نے سسکیوں کے درمیان مشکل تمام کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ بلا وجہ تو کوئی نہیں دوتا۔“

سجاد بھائی نے جرح کی۔

آپا جان خاموش رہیں۔

”تم فکر مت کرو شہسہ میرے ہوتے ہوئے تمہارے ادب پر کسی قسم کی زیادتی

ہو سکتی۔“

آپا جان پیپ رہیں۔

اتنے میں شجورانی بھی چھٹ باجی کے ساتھ دو چار نواسے زہر مار کر کے لگے۔
 ”نم آخر اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہو؟ تمہارا اور شترادے میاں کا کوئی ٹوٹی ہوئی
 میں تو یہ زیادتی ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔“

”رشتہ آیا نہیں تو زنجیکٹ کیسے ہو گیا؟“

”یہی تو امان بیگم کا کمال ہے۔“

شجور نے مسکرا کر کہا۔

”تمہیں کس نے بتا دیا کہ ڈاکٹر دمی کا رشتہ آنے والا ہے؟“

بڑھتیانے پوچھا۔

”انہوں نے بتایا۔“

شجور نے چھٹ باجی کی طرف اشارہ کیا جو اس کی دیدہ دیری اور بے باکی پر آنکھیں

بازے اسی کی طرف دیکھ جا رہی تھیں۔

”کیوں عمارت؟ کیا قصہ ہے؟“

بڑھیا چھٹ باجی کی طرف متوجہ ہو گئے۔

چھٹ باجی نے کچھ جھجکتے ہوئے ساری تفصیلات بتانی شروع کیں تو آپا جان

ڈاکٹر نقشہ کے کمرے میں چلی گئیں۔

”ہوں، تو یہ بات ہے۔“

سجاد بھائی نے الف سے ہی تک پوری داستان سن کر بخجیدگی سے کہا۔

”اب آپ ہی لوگ اس پیل کو منڈھے چڑھ لیئے۔“

شجور نے باری باری سجاد بھائی اور بڑھیا کی طرف دیکھا۔

”ہاں، ہاں، بالکل! انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سجاد بھائی، بات صرف اتنی سی نہیں ہے کہ آپا جان کو شترادے میاں کا رشتہ

نہیں ہے، بلکہ اس کے آگے یہ قصہ بھی ہے کہ امان بیگم، دادی امان اور بڑی امان۔

ڈاکٹر دمی کا رشتہ زنجیکٹ کہہ دیا ہے۔“

شجور بیگم نے بغیر سانس لئے کہا۔

”ڈاکٹر دمی کون؟“

بڑھیا اور سجاد بھائی نے ایک ساتھ پوچھا۔

”یونیورسٹی میں ہیں، آپا جان کو پڑھاتے ہیں۔“

شجور نے بڑی بے باکی سے کہا۔

”ان کا رشتہ بھی آپا ہے؟“

سجاد بھائی نے پوچھا۔

”ابھی آیا کہاں، آنے والا ہے۔“

شجور نے کہا۔

”کیا ایسی بات کہہ رہی ہو گڑھا؟“ (سجاد بھائی شجور کو پیار سے گڑھا کہتے تھے)

سجاد بھائی کو ہنسی آگئی۔

سجاد بھائی نے بڑے وثوق سے کہا۔

”بڑ بھیا! آپا جان کی طرف چلے تو باقی لوگوں نے بھی ان کی تقلید کی آپا جان بڑ بستر پر اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ آئسوا ایک کے بعد ایک رضا روں پر پھیل رہا بنفشہ بے چاری انہیں چپ کرانے کی کوشش میں ناکام ہو کر پریشان سی بیٹھی تھی۔“

”ایسی حماقت کی توقع نہیں تھی مجھے تم سے۔“

بڑ بھیانے آپا جان کے قریب رک کر کہا۔

”آپا جان نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھیں کہ شاید بڑ بھیا بٹ کر کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ بڑ بھیا کا اشارہ ان کے رونے دھونے کی طرف تھا۔“

”ذرا اپنا چہرہ دیکھو، بالکل نرود ہو رہا ہے۔“

بڑ بھیانے مصنوعی ناراضگی کا مظاہر کیا۔

سجاد بھائی نے اپنے رومال سے آپا جان کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

”ارے، بس اتنی سی بات، ہم اپنی بہن کے لئے سب سے ٹکر لے لیں گے۔“

ڈاکٹر دھی کا رشتہ تو آنے دو۔“

آپا جان کا چہرہ شدم سے سُرخ ہو گیا۔

”پیلے ہم ڈاکٹر دھی کو دیکھ تو لیں کہ آخر وہ ہیں کتنے پانی میں؟ ہماری؟“

قابل بھی ہیں یا نہیں؟“

سجاد بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آپا جان نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

”باقی تو سب ٹھیک ہے، لیکن ان بے چاروں کا پنجابی ہونا ان کے لئے“

یا ہے۔“

بنو نے کہا۔

”لا حول ولا قوۃ، یہ کیا بات ہوئی۔“

بڑ بھیا کی پشتانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔

”مجھے کیا معلوم؟ بڑی اماں اور بیگم سے پوچھئے۔“

بنو نے ناک چڑھائی۔

”انہی لوگوں کو تو کہہ رہا ہوں، پنجابی مسلمان نہیں ہوتے یا انسان نہیں ہوتے۔“

”میرے نزدیک تو ہوتے ہیں۔“

بنو نے مسمیٰ صورت بنا کر کہا۔

”بلکہ بعض باتوں میں تو وہ ہم ہندوستانیوں سے بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔“

سجاد بھائی نے کہا۔

سجاد بھائی کی بات ابھی ختم ہی نہ ہوئی تھی کہ اماں بیگم کمرے میں داخل ہوئیں۔

”کیا کافر نس کر رہے ہو تم لوگ؟“

اماں بیگم نے گہری نظروں سے سب کا جائزہ لیا۔

”کوئی کافر نس نہیں اماں بیگم! بس ویسے ہی۔۔۔۔۔“

سجاد بھائی نے کہا۔

”ویسے ہی کیا؟ اور ہاں، تم نہادھو کر کھانا کیوں نہیں کھاتے؟“

اماں بیگم نے سجاد بھائی سے کہا۔

”ابھی کھاتا ہوں۔“

سجاد بھائی نے کہا۔

”کب کھاؤ گے؟ آخر کن چکروں میں پڑے ہو؟“

”چکر وکر کا قصہ تو آپ ہی بتائیے، معلوم نہیں کیا ڈرامہ بازی شروع کر رکھی۔“

”آپ نے؟“

سجاد بھائی مسکرائے۔

”کیسی ڈرامہ بازی؟ کیا کہہ رہے ہو؟“

”میں ذرا کھانا کھا لوں پھر بات کروں گا آپ سے۔“

سجاد بھائی نے ہنس کر کہا۔

سجاد بھائی کمرے سے باہر نکلے۔ تو اماں بیگم بڑبھتیا کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

”اور تم کیوں کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے؟“

”کھانا چھوڑ کے تو نہیں اٹھا۔“

”اور کیا؟“

”میں تو کما چکا تھا۔“

”کیا کما چکے تھے؟ آدھا پیٹ کھایا؟“

”بس اتنی ہی بھوک تھی۔“

”ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم لوگوں کی بھوک کو کیا ہو گیا ہے؟“

”دیکھو.....“

ابھی اماں بیگم کی بات منہ میں ہی تھی کہ رمضان، ابامیاں کا قاصد بن کے آگیا اور

اپنے غراسے کے پانچے سنبھالتی ہوئی چلی گئیں۔

اس دن تو اماں بیگم کی سجاد بھائی سے کوئی بات ہی نہ ہو سکی۔ وہ کھانا کھا کر اٹھے تو بڑبھیا

لنگھان کی ٹہلی آدھکی۔ شام کو وہ اپنے ایک دوست سے ملنے چلے گئے تھے۔ رات کو

راتے تو بڑے اماں جان آئے ہوئے تھے۔ عباس بھائی کے علاوہ دوسرے

بھائی ان کے ساتھ تھے۔ اگلے روز جب سب لوگ رات کا کھانا کھا کر اٹھے، ہفتہ

بٹے کر کے کی طرف چل دی۔ اس نے ایک ناول شروع کر رکھا تھا اسے ختم کرنے کی جلدی

ناول پڑھنے یعنی تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ وہ تو جب ناول پڑھنے پڑھنے

ہٹے انھیں بند کر کے ناول کی میروٹن کی اور اپنی زندگی کا موازنہ کیا تو ایک دم ہی اسے

لا اکر بخوبی دیر سے کمرے سے غائب ہے۔ وہ کتاب بستر پر رکھ کے کمرے سے

نکل گئی۔ ڈرائنگ روم کے سامنے والی راہ لاری سے گزری تو زور زور سے باتیں کرنے

آواز آئی۔ وہ در پیچھے کے قریب رک گئی۔ بڑبھیا اور بڑی اماں کی آواز بھی آ رہی تھی۔

اچھا، آپا جان کا مسئلہ زیر بحث ہو گا۔

اس نے سوچا اند آگے بڑھ گئی۔ اسی وقت سامنے سے بخورانی آتی ہوئی نظر آئیں۔

”ایسے اندھ چلیں، معلوم ہوتا ہے زوردار چھڑا ہو رہا ہے۔“

بخورانی قریب آ کر مسکرائیں۔

”تم کہاں سے آ رہی ہو؟“

”میں تو راجا جان کے پاس تھی۔“

شعبہ بیگم ہفتہ کا ہاتھ پکڑ کر اندر داخل ہو گئیں۔

ہفتہ نے دیکھا اماں بیگم کافی غصے میں معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی اماں کے تھنے بھی پھول

پھل رہے تھے۔ وادی اماں کا سروتہ کچھ زیادہ ہی تیزی سے چل رہا تھا۔ ابامیاں

بے چارے تو دیوان پر نیم دماڑا اپنی نوند کو سملائے جا رہے تھے۔

شجورانی بڑی مسکین صورت بنا کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔

”شبیخہ، چلو ہم لوگوں کو نہیں بیٹھنا چاہیے، بڑی بات ہے۔“
بنفشہ نے آہستہ سے کہا۔

”ابھی بیٹھی رہیے، اگر ڈانٹ پڑے گی تو چلے جائیں گے۔“

شجور نے اطمینان سے کہا۔

بنفشہ نے سوچا۔ میں تو یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ اماں بیگم کو غصہ بھی آ رہا ہے۔
ارادے سے اس نے قدم بڑھایا مگر شبیخہ نے فوراً اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا۔

قریب بٹھالیا۔

”تم لوگوں کے تو دماغ خراب ہو گئے ہیں۔“

اماں بیگم نے کہا۔

”دماغ خراب ہونے کی بات نہیں ہے اماں بیگم، جب وہ راضی نہیں۔“

”یہی تو میں پوچھتی ہوں کہ آخر ایسی کونسی بڑائی ہے اس لڑکے میں؟“

”جب وہ دوسری جگہ کرنا چاہتی ہے تو....“

بڑھتیا بولے۔

”اس کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ کسے گی مجھے کونئیں میں پھینک دوں گا۔“

دو گئے۔

بڑی اماں بولیں۔

”اور ابھی اس ڈاکٹر کا رشتہ آیا کہاں ہے؟“

اماں بیگم بولیں۔

”آجائے گا دو ایک روز میں۔“

سجاد بھائی نے بڑے وثوق سے کہا۔

”رشتہ آجائے تب بھی نہیں کرنی اس سے۔“

”کیوں؟“

سجاد بھائی نے پوچھا۔

”معلوم نہیں کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں؟“

”وہ تو ہم دیکھ لیں گے۔“

بڑھتیا بولے۔

”بیٹا، تم تو بس خاموش رہ رہو۔“

بڑی اماں بولیں۔

”کیوں؟“

”ابھی چلی تمہارے ساتھ ہو جاتی اس کی شادی، مگر تمہارے دماغ میں تو خناس

ہو گیا ہے۔“

بڑی اماں نے غصے سے کہا۔

”لا حول ولا قوۃ، یہ کیا بات ہوئی؟“

بڑھتیا سنجیدگی سے بولے۔

”ہوئی کیسے نہیں بت۔“

بڑی اماں بولیں۔

”یعنی ہر جگہ زبردستی مزد رکریں گی آپ لوگ، نہ وہ چاہتی ہے نہ میں چاہتا ہوں۔“
”یہی تو میں پوچھوں ہوں کہ آخر کیوں نہ چاہو؟“

دادی اماں بولیں۔

”اگس میں نہیں ہوں گی شادیاں تو کیا آسمان سے رشتے آئیں گے؟“
بڑی اماں بولیں۔

”آسمان سے رشتے آنے کا کیا سوال ہے؟ گھر میں اور بھی لڑکے ہیں۔“
سجاد بھائی بولے۔

”اور کون سے لڑکے ہیں؟“

اماں بیگم بولیں۔

”اپنے سلمان ہیں۔“

”سلمان تو انگریز کے بچے بنے ہوئے ہیں، ان کے ساتھ ہماری لڑکی لاگزور
کیسے ہوگا؟“

بڑی اماں بولیں۔

”اور پھر جب سلمان کی ماں نے کچھ نہیں کہا تو میں کیسے منہ بھوڑ کے کہہ دیتا کروں؟“
بیٹی کو ہونہار۔

اماں بیگم بولیں۔

”اپنے عباس بھائی کسی سے کم ہیں؟ ہزاروں میں ایک ہیں۔“
سجاد بھائی نے بڑے فخر سے کہا۔

”شادی بیاہ کے معاملے میں ان لوگوں کا نام نہ لینا بیٹا!“

اماں ایک دم بولیں
”کیوں؟“

”بس ان لوگوں کی خوبیاں انہی کے ساتھ رہنے دیں۔“

اماں بیگم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

اس کے بعد ہفتہ تو موقعہ پا کر اٹھ کر چلی آئی معلوم نہیں کیا کیا باتیں ہوتی رہیں
تو بیچھ کے کمرے میں آنے سے پہلے ہی سو بھی گئی۔

اگلے روز اسے شجیعہ سے پتہ چلا کہ بڑ بھتیجا اور سجاد بھائی ابامیاں کی سفارش پر
ہی شکل سے اماں بیگم کو اس بات پر راضی کر سکے ہیں کہ ڈاکٹر دمی کا رشتہ آنے
اماں بیگم انہیں اور ان کے گھر والوں کو خوب اچھی طرح چھان چھنگ لیں۔ پھر اگر مناسب
ہیں تو عامی بھریں۔

پھر ایسا ہوا کہ جمعہ ہی کے روز ڈاکٹر دمی کا رشتہ آگیا۔ دھاہرے ان بے چاروں
تو ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے یہ سن کر کہ ان کی من موہنی شادی کیوں اور
نے والی ہے۔ بات کچھ اس طرح بنی تھی کہ پہلے تو ڈاکٹر دمی کے ماموں دباپ تو ان کے
نہیں، کوٹلی فون آیا۔ پھر وہ ابامیاں کے آفس ان سے ملنے کے لئے پہنچے۔ آفس
دباپ ہی پر ابامیاں بولھلائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے اور اماں بیگم کے پاس
نہ گئے۔

”مجھ وہ لوگ آ رہے ہیں۔“

”اے ہے، کون آ رہے ہیں؟“

اماں بیگم نے پوچھا۔

دادی اماں بھی چوکنی ہو کر بیٹھ گئیں۔

”ارے وہ بھی کیا نام ہے ان کا؟“

ابامیاں مارے پریشانی کے نام بھی بھول گئے۔

”اس مسئلے میں وہ بے چارے قصور دار بھی نہیں تھے اسے جاسکتے تھے مگر“

بیٹی کے رشتے کا مسئلہ تھا نا۔

”اب مجھے کیا معلوم، کسے کہہ رہے ہیں؟“

اماں بیگم نے دادی اماں کی طرف دیکھا۔

”ارے بیگم، ڈاکٹر وصی کے گھر والے آرہے ہیں؟“

ابامیاں نے بڑی مشکل سے یاد کر کے کہا۔

”آپ کو کیسے معلوم؟“

اماں بیگم نے ذکالت کی۔

”وہ خود آئے تھے، ٹیلی فون بھی آیا تھا۔“

ابامیاں نے جلدی سے کہا۔

”کون؟ ڈاکٹر وصی؟“

”نہیں، ان کے ماموں۔“

”تو کیا وہ خود نہیں آئیں گے؟“

”آئیں گے، وہ خود بھی آئیں گے، ایک بہن آئے گی۔“ اماں آئیں گی۔

”باپ نہیں آئیں گے؟“

دادی جان نے پوچھا۔

”باپ جلتے نہیں ہیں۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے، مگر آپ کیوں اس قدر گھبرائے جا رہے ہیں۔“

”لیکریں بیگم، لڑکی کا معاملہ ہے نا، لڑکی کے باپ ہیں ہم۔“

ابامیاں نے ساوکی سے کہا۔

”میں بھی تو لڑکی کی ماں ہوں، منجھ پر تو....“

”آپ تو انشاء اللہ بہادر ہیں۔“

”یا اللہ، اس میں بہادری کہاں سے ٹپک پڑی؟“

”ہیں تو ایسا لگ رہا ہے بیگم، جیسے لڑکی کا رشتہ نہیں بارات آرہی ہے۔“

”اگر اس طرح ہاتھ پیر پھیلے آپ نے، تو ہوسکا کام۔“

”اچھا خیر، ہاں تو پھر کیا تیار ہی ہے؟“

”کاہے کی تیاری؟ جب آئیں گے تو چائے پانی ہو جائے گا۔“

اماں نے ”پرہیزی سے کہا۔“

”میں کون بٹیا، اگر سبھا داور شعیب بھی موجود ہوتے تو اچھا تھا۔“

دادی اماں نے کہا۔

”سبھا کو تو میں نے ٹیلی فون کر دیا تھا ہاسپٹل میں۔ اس کی ڈیوٹی نہیں ہے“

پہنچ جائے گا۔“

”الاشعیب؟“

اماں بیگم نے پوچھا۔

”اس کا معاملہ ذرا مشکل ہے، بہت کوشش کی، مگر....“

غیر، اگر سلسلہ آگے بڑھا تو پھر مل جائے گا، اس میں کیا بات ہے؟
داوی اماں بولیں۔

شیخو رانی، جو اس وقت اماں بیگم کے پاس یہ پوچھنے کے لئے کہہ رہی تھیں کہ
کو میں اپنی سہیلی فرزانہ کے پاس چلی جاؤں دوسرا سے کے قریب رک کہہ سارا
لے چکی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ اب تو پوچھنا بیکار ہے اگر وہاں چلی گئی تو ڈاکٹر
دیدار نہیں ہوسکے گا۔ وہ تو ویسے ہی انہیں دیکھنے کے اشتیاق میں مری جا رہا
اسٹے قدموں دوڑی ہوئی آپا جان کے پاس یہ خوش خبری سنانے چل دیں۔

شام کو ڈاکٹر وصی اپنی اماں، بہن اور ماموں کے ساتھ آئے۔ گھر کے سارے
مع واد ا جان کے ڈانگ روم میں جمع ہوئے۔ سجاد بھائی بھی پہنچ گئے تھے۔ بڑے
باتیں ہوئیں۔ چائے پانی کا دودھ چلا۔ آپا جان کو بلوایا گیا۔ مگر آپا جان بارے شرم
ہی نہیں، پھر ڈاکٹر وصی کی اماں خود ان کے کمرے میں پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر وصی اپنی
پسلے بھی تین چار دفعہ آپا جان سے یونیورسٹی میں ہوا چکے تھے۔ بلکہ بہن ہی کے در
تو آپا جان کو اصل بات کا علم ہوا تھا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد اماں بیگم تو ایسی ہشتاش ہشتاش نظر آ رہی تھیں
بات پر ہنس کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ کہاں تو ڈاکٹر وصی کے نام سے
رہی تھیں اور کہاں ایسی کا یا بیٹی کہ ان کے گھر والوں کی اور ان کی شان میں تعبد
جا رہی تھیں معلوم نہیں فرامی دیدار میں ڈاکٹر وصی کیا جا دو کر گئے تھے ان کے اوپر
شیخو بیگم کا خیال تھا کہ وہ کلفٹن والے بابا عبداللہ شاہ کے مزار پر حاضری د
منت اماں کہ چلے آ رہے ہوں گے۔

مغزی کہ اماں بیگم نے اندر ہی اندر چپکے چپکے ڈاکٹر وصی کے خاندان کے کئی افراد کے
رے میں چھان بین کر دیا کہ جب پوری طرح اطمینان کر لیا اور ڈاکٹر وصی کے گھر والوں کو
بے فکر نہ کی دوڑ دو چار دفعہ اور گوالی تو شہزادے میاں کو پریمیکٹ کر دیا اور سب کے
دلت ڈاکٹر وصی کے حق میں ڈلوادیئے۔

طے یہ پایا کہ آپا جان کے امتحان ختم ہوتے ہی۔ جس میں زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ
ہفتہ باقی تھیں۔ ان کی شادی کر دی جائے گی۔ یہ خبر سننے ہی آپا جان کے چہرے کی نورنگت
کا بدل گئی۔ پھر سے رضاروں پہ گلاب کھل اٹھے۔ ہونٹوں پہ کلیاں چمک اٹھیں اور آنکھوں میں
نارے جھلانے لگے۔

شیخو رانی دل ہی دل میں آپا جان کی قسمت پر رشک کیا کہرتی تھیں۔ ہائے کیا قسمت
پاں ہے آپا جان نے؟ چشم بد دور۔ کیسی شاندار جوڑی ہے دونوں کی؟ ڈاکٹر وصی تو بالکل
لالوں کے بنجیدہ، باوقار اور خوبصورت بہرہ کی طرح ہیں۔ وہ قسمت میں تنہا
بہن منصوبے بنا یا کہرتی تھیں کہ آپا جان کی شادی کے موقع پر فلاں دن فلاں رنگ کا جوڑا
ہونگا، ہیرا سٹائل میک اپ اور زیور کے بارے میں بھی بڑی بنجیدگی سے خود کہرتی
تھیں۔ نہ صرف یہ بلکہ اس بات کا فیصلہ بھی انہوں نے کر لیا تھا کہ ہفتہ باجی کس دن کس
بائے کے کپڑے پہنیں گی۔ امتحان بس شروع ہی ہونے والے تھے یہی کوئی بچہ سات روز
باتی تھے، لیکن ان کے دماغ میں اسی قسم کی باتیں کیڑوں کی مانند کھلتی رہتی تھیں۔ اماں بیگم
بڑی اماں، داوی اماں، چھوٹی چچی بڑے زور و شور سے آپا جان کا جینز بنانے میں مصروف تھیں۔
ایک طرف تو یہ ہنگامہ تھا اور دوسری طرف سلمان بھائی بڑی بے چینی سے اپنی می
لے لے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہفتہ سے باتیں کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ وہ اپنے

امتحان کی تیاری میں معروف محقق روزانہ پانچ دس منٹ کی مختصر سی ملاقات ہر روز کرتا تھا۔
اس میں مسلمان بھائی کا کہاں بھلا ہوتا تھا۔

خدا خدا کرے سچے جان واپس آئیں تو مسلمان بھائی نے شکریہ کا سانس لیا۔ دل پر پتھر کی بڑھان
رسل رکھ کے دو روز انہیں سستانے کے لئے بھی دے دیئے۔ ان کے آتے ہی اپنا مال
سنا سنا سب نہ معلوم ہوا، ورنہ ان کا دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ایئر پورٹ سے گھر واپس آئے۔
ای ان سے سب کچھ کہہ سن لیں۔

خدا خدا کرے کہ وہ دو روز مسلمان بھائی کے لئے دوسری بن کر گزر رہی گئے مگر تیر
دن اتفاق ایسا ہوا کہ جب مسلمان بھائی آفس سے واپس آئے تو معلوم ہوا کہ سچی جان
کے ساتھ آپا جان کے جہیز کی خریداری کے سلسلے میں بازار گئی ہوئی ہیں۔ چلو کچھ دیر اور
انہوں نے سوچا اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کرنے چلے گئے۔ شام کو چائے
بعد صوفیہ تو اپنی کسی سیلی سے ملنے چل دی۔ چھوٹے چچا اپنی کوئی میٹنگ اینڈ
چلے گئے۔ مسلمان بھائی کو اپنی می سے بات کرنے کا مناسب موقع مل گیا۔

”دوپہر میں کہاں گئی تھیں می آپ؟“

مسلمان بھائی نے اس زمان بن کر پوچھا۔
”شمسہ کے لئے کچھ چیزیں خریدنی تھیں بھابی جان کو، انہی کے ساتھ گئی تھی۔“

”بڑے زوروں میں تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

مسلمان بھائی مسکرائے۔

”ہاں بھئی، ماشاء اللہ ان کی پہلی بیٹی کی شادی ہے۔ جتنا بھی کریں ٹھوڑا ہے۔“

”میری شادی کب کریں گی آپ؟“

مسلمان بھائی لاٹھ میں اگر ان کے گلے کے ہار بن گئے۔
”تمہیں تو کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آتی؟“
”پسند تو آگئی ہے ایک لڑکی؟“
”اللہ تیرا شکریہ ہے؟“
”چچی جان خوش ہو گئیں؟“
”کون لڑکی ہے؟“

انہوں نے پوچھا۔

”آپ گیس کیجئے؟“

”یہ تو مشکل کام ہے تمہاری تو اتنی ساری لڑکیوں سے واقفیت ہے۔“

”پھر بھی، کوشش تو کیجئے؟“

”چچی جان نے کئی لڑکیوں کے نام گنوا دیئے، مگر مسلمان بھائی نے نو، ناٹ ایٹ آل
درالگ، اکی جوڑٹ لگانی شروع کی تو چچی جان عاجز آگئیں۔

”ادمانی گاڈ، اتنی ساری لڑکیوں کے نام تو گنوا دیئے، اب کون سی باقی رہ گئی ہے؟“

”ایک دفعہ اور ٹرائی کیجئے۔“

مسلمان بھائی مسکرائے۔

”نہیں بھئی، تم خود ہی بتا دو۔“

”ایک چانس اور دیتا ہوں؟“

”ملن ہے میری غیر موجودگی میں کلب کی تہاری کوئی نئی فرینڈ بنی ہو۔“

”کلب تو اب میں برائے نام ہی جاتا ہوں۔“

”پھر؟“

”اس کا باہر تمہارے ساتھ نہیں ہو سکے گا۔“

”کیوں؟“

”اس کی پرورش بالکل مختلف ماحول میں ہوئی ہے۔“

”ہاں، یہ تو درست ہے، لیکن رفتہ رفتہ وہ خود ہی عادی ہو جائے گی۔ اس ماحول کی، ورنہ....“

”سلطان بھائی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”چچی جان نے انتظامیہ نظروں سے دیکھا۔“

”ورد میں اپنے آپ کو اس کی مرضی کے مطابق ڈھال لو گا۔“

”تم؟؟؟“

”چچی جان نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔“

”جی ہاں۔“

”یہ تو ناممکن ہے۔“

”ناممکن کیوں ہے؟“

”بس مجھے معلوم ہے۔“

”ممکن ہے آپ ہی صحیح کہہ رہی ہوں، لیکن کوشش کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

”یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن....“

”سیکن؟“

”بنفشہ کا خاندانی بیک گراؤ بڑے کچھ ٹھیک نہیں ہے۔“

”کیوں؟ کیا آج کل زیادہ بڑی رہتے ہو؟“

”ہاں، بس یہی سمجھ لیجئے۔“

”سلطان بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔“

”آج تو تم معقول میں باتیں کہہ رہے ہو۔“

”اچھا، اگر میں آپ کو پھوڑی سی ہنٹ دے دوں تو....“

”نہیں، اب تم صاف صاف اس کا نام بتا دو۔“

”اس کا مطلب ہے آپ ہار گئیں۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”چلئے، میں بتا دیتا ہوں۔“

”بتا دو۔“

”بنفشہ۔“

”بنفشہ!؟“

”چچی جان حیرت زدہ سی ان کی طرف تکی رہ گئیں۔“

”جی ہاں، آپ کو اتنی حیرت کیوں ہوئی؟“

”بات تو حیرت کی ہے۔“

”کیوں؟“

”تمہاری فرینڈ میں ایک سے ایک اچھی لڑکیاں شامل ہیں، تمہیں بنفشہ پسند آئی۔“

”بنفشہ میں کیا برائی ہے؟“

”برائی تو کوئی نہیں۔“

”کیا ہوا اس کے خازانی بیک گراؤ بڑھ کر؟“

”اس کی ماں کسی کلب کی اسٹیج ڈانسر تھی۔ کلب میں بھنسنے کے فادر سے ملاقات ہوئی اور
میں گرافیزر ہو گئے۔ انہوں نے اس سے شادی کر لی۔ مگر اس وقت وہ دولت مند آدمی تھے
شادی کے بعد دو بچے ہوئے۔ بھنسنے کی پیدائش کے بعد انہیں کاروبار میں گھانا ہوا
ان کی مالی حالت کمزور ہوتی گئی۔ دوسری طرف بھنسنے کی ماں بھی ان سے دن بدن کھینچ پک
انہی دنوں کلب میں کسی اور سے اس کی فریڈ شپ ہو گئی۔ وہ اس کی طرف انٹرسٹ ہو
بے چارے ان صاحب نے اسے برت سمجھایا، بچوں کا واسطہ دیا، لیکن اس سرنگھا
عورت کے اوپر کسی بات کا اثر نہیں ہوا۔ بس پھر دونوں میں سپریشن ہو گئی۔“

”اوہ، دوسری سیٹ۔“

سلمان بھائی تاسف سے بولے۔

”چچی جان خاموشی بھی کچھ سوجتی رہیں۔
اپنے بیٹے کو وہ ساتھ لے گئیں؟“

سلمان بھائی نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”پھر؟“

”اسے کوئی اٹھا کر لے گیا۔“

چچی جان نے ایک طویل سانس لیا۔

”پوئے گراؤ۔“

سلمان بھائی نے کہا۔

چند لمے خاموشی رہی پھر سلمان بھائی نے کہا۔

”مگر ہمارے لئے ان تمام باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے می؟“
”کیوں نہیں پڑتا۔“

”اس سلسلے میں بھنسنے کا تو کوئی قصور نہیں۔“

”یہ کب کہتی ہوں کہ اس کا قصور ہے۔“

”تو پھر آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟“

”بھئی، وہ لڑکی تمہیں سوٹ نہیں کرتی۔“

”یہ تو آپ کی غلط فہمی ہے۔“

”بھئی سچ میں نہیں آتا کہ آخر تمہیں اس لڑکی میں کیا نظر آتا ہے؟“

”بھئی جان کچھ چدر کو بولیں۔“

سلمان بھائی نے سوچا کہ اس بات کا وہ کیا جواب دیں۔ انہیں بھنسنے میں کیا نظر آتا
ہے؟ اس بات کو وہ الفاظ میں کیسے بیان کریں۔

”ایک سے ایک اچھی لڑکیاں تمہارے نہیال میں موجود ہیں ان میں سے بھی کوئی
تمہیں پسند نہیں آئی۔“

”ہاں، بس اپنی اپنی نظر ہوتی ہے۔“

سلمان بھائی کا لہجہ دھیمّا تھا۔

”کلب میں بھی بڑی اچھی اچھی لڑکیاں ہیں ان میں سے کسی کو پسند کر لو۔“

”یہ زبردستی کا سودا تھوڑی ہے می، بس جو پسند آگئی سو آگئی۔“

سلمان بھائی مسکرائے۔

”جئے جبرست ہے، آخر ان میں سے کوئی لڑکی تمہیں کیوں نہیں پسند آئی؟“

”بس نہیں آئی، کیا کہوں؟“

”چچی جان کچھ دیدہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہیں، پھر بولیں۔“

”اچھا بھئی، جیسی تمہاری مرضی، مگر میرا خیال ہے.....“

”وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔“

”جی ایک خیال ہے آپ کا؟“

”نہیں کہہ رہی تھی پہلے صوفیہ کی شادی ضروری ہے۔“

”جی ہاں، بالکل، میں کب کتنا ہوں کہ پہلے آپ میری شادی کر دیں۔“

”اس کے لئے کچھ پروپوزل آئے ہوئے ہیں، اس کے کچھ انتظام ہو جائے تو“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”اتنے عرصے میں تمہیں بھی موقع مل جائے گا۔“

”کس بات کا موقع؟“

”میرا مطلب ہے بنفشہ کو پہننے کا موقع مل جائے گا۔“

”اسے تو میں پہن چکا ہوں۔“

”پھر بھی، اندازہ ہے کہ اس کی عادات و اطوار کا تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے“

”یہ اندازہ بھی میں لگا چکا ہوں۔“

”نہیں میرا خیال ہے کہ جتنا زیادہ عرصے تک ساتھ رہنے کا موقع ملتا ہے“

”اچھی طرح اور واضح طور پر آدمی کی شخصیت سمجھنے آتی ہے۔“

”ہوں۔“

”سلمان بھائی جانے کیا سوچنے لگے۔“

”ممکن ہے اس عرصے میں تم کوئی بہتر فیصلہ کر سکو۔“

”میرا فیصلہ تو اب بھی بہتر ہے۔“

”میرا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے کہ بنفشہ کے بارے میں تمہاری رائے تبدیل

ہو جائے۔“

”یہ تو ناممکن ہے جی۔“

”سلمان بھائی سنئے۔“

”اے بٹیا، جتنا میں جانتی ہوں نہیں جانتے، اور تمہیں جتنا زیادہ میں سمجھتی ہوں

کوئی دوسرا تو کیا خود تم بھی نہیں جانتے۔“

”اچھا خیر، اس ذکر کو چھوڑیے، اب آپ یہ بتائیے کہ داوی اماں اور تائی اماں سے

کب بات کریں گی اس سلسلے میں؟“

”ابھی سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”کیوں؟ تو پھر کب کریں گی؟“

”کچھ عرصہ ٹھہر جاؤ۔“

”آؤ کیوں؟“

”جب تک صوفیہ کا رشتہ بھی طے ہو جائے گا۔ اور تمہیں بنفشہ کو ابھی

سہ.....“

”نہیں جی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صوفیہ کا رشتہ بھی طے ہو جائے گا۔ ساتھ

یہ یاد رکھئے۔“

ہا ہے۔

”دادی اماں وغیرہ سے اس سلسلے میں بات ہو جائے گی تو پھر شاید اس کی جھجک رہ جائے۔“

”اچھی بات ہے میں آج یا کل ہی ان سے بات کر دوں گی۔“

چچی جان نے کہا۔

مسلمان بھائی اطمینان کا سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور سیڑی بجاتے ہوئے باہر گئے۔

اسی روز — رات کو کھانے کے بعد جب سب لوگ ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔

جان ہی دہاں پہنچ گئیں۔ آپا جان کا حسینہ کا موضوع زیر بحث تھا کہ ابھی کتنی تیاری ہوئی

ہے، کیا کچھ تیاری کر رہی ہے؟ اور کل کی شاپنگ میں کیا کیا خرید لیا ہے؟ چچی جان نے

موقع غنیمت جان کر اپنا صرف دعایا بیان کر دیا۔ کسی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ

جان مسلمان بھائی کے لئے بنفشہ کا رشتہ ہاگ رہی ہیں۔ چند سیکنڈ تک تو سب

بے ادبوں کی صورت ہی دیکھ رہے تھے۔ چچی جان نے دوبارہ اپنی بات دہرائی

دادی جان نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ پھر کسی وقت اس مسئلے پر سوچا جائے گا لڑکی کی

نہی بھی معلوم کی جائے گی۔ فی الحال تو شمسہ کی نشادی کا بیکھرٹا پھیلا ہوا ہے۔

چچی جان کو بھی دادی اماں کی بات مناسب معلوم ہوئی۔ انہوں نے کہا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔“

یوں بات آگئی ہو گئی۔ مگر اگلے روز دوپہر کو جب دادی اماں، بیگم، بڑی اماں

اور چچی آپا جان کے کچھ کپڑے سینے پر نہنے بیٹھیں، تو بنفشہ اور مسلمان بھائی کا ذکر چھڑ گیا

”بہت بے صبر ہے ہو رہا ہے۔“

چچی جان نے غبت سے ان کی طرف دیکھا۔

”اوہ جی، آپ کو نہیں پتہ.....“

”مجھے کیا نہیں پتہ؟“

”اصل میں مشکل یہ ہے تاکہ اس کے بغیر وہ لڑکی مجھ سے بات بھی نہیں کرے گی

”تمہیں کیسے معلوم؟ کوئی بات ہوئی تھی اس سے؟“

”وہ جو آفت کی پرکالا ہے نا نتیجہ۔“

”نتیجہ؟“

”ہاں، اس کی سرپرست بنی پھرتی ہے اس نے صاف کہہ دیا ہے کہ ریوڑ جو لڑ

بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اگر بنفشہ باجی پسند ہیں تو چچی جان سے کچھ دادی اما

سے بات کر کے رشتہ طے کریں۔“

”اچھا!“

چچی جان سکڑ گئیں۔

”ہاں، اور بنفشہ کا حال یہ ہے کہ جس دن سے میں نے اپنی پسند کا اظہار کیا اس

بات کر کے ہی رونا شروع کر دیتی ہے۔“

”ہاں، وہ بہت سی پیٹی سادی لڑکی ہے۔“

”کئی دن تک تو اس نے اپنی صورت نہیں دکھائی۔“

مسلمان بھائی نے کہا۔

چچی جان دل ہی دل میں سوچ رہی تھیں کہ مسلمان جیسے لڑکے پر بنفشہ نے کیا با

سب کا یہی خیال تھا کہ دیسے تو اس رشتے میں کوئی بڑائی نہیں، لیکن ڈراس بات کہ وہ لوگ بغضتہ کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیں گے۔ معلوم نہیں نقشہ اس اہل دل رہ سکے یا نہ رہ سکے۔

اس سلسلے میں دادا جان کی حیرت میں شہب میں کئی غصہ اجلاس ہوئے۔ ان میں طویل طویل بحثیں ہوئیں۔ ہر پہلو پر غور کیا گیا، کئی بار دادا جان اور دادی جان میں لڑائی بھی ہوئی۔ ان اجلاسوں کی کارروائی قطعی طور پر کافینڈنٹل اور سیکرٹ رکھی گئی۔ بہت دن لڑکیوں اور لڑکوں کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، کہ اندر ہی اندر کیا کچھ چڑی پک رہی ہے؟ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سب اپنے اپنے امتحانوں کے پیکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ آخری غصہ میٹنگ میں یہ طے پایا تھا کہ امتحان ختم ہو جائیں تو بغضتہ سے اس کی جائے گی۔ اس کام کے لئے شجورانی کا سہارا لیا جائے گا۔ امتحان سے پہلے بتانا اس نہیں تھا کہ کہیں بغضتہ کی توجہ پڑھائی کی طرف سے ہٹ نہ جائے۔

بڑی اماں نے یہ بات بڑھتیا کو بھی بتادی تھی بڑھتیا یہ خبر سن کر کافی دیر سے بیٹھے رہے۔ پھر بہت دھیمی آوازیں کما۔

”آپ لوگ اسے پڑھ لوینے دے مجھے کم از کم“

”پڑھ تو رہی ہے، بس امتحان سے فارغ ہو جائے“

”کیا مطلب ہے؟ کیا صرف بی اتے تک پڑھائیں گے؟“

”اے تو کیا پی-ایچ۔ ڈی کر داکے بوڑھا کرنا ہے اسے؟“

”ہاں، اگر اس کی مرضی ہوئی تو پی-ایچ۔ ڈی کر داؤں گا“

”تم سارے لڑکوں کے تو دماغ حراب ہو گئے ہیں“

بڑی اماں بولیں۔

”اور یہ بوڑھا کرنے والی بات بھی آپ نے خوب کہی“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ بغضتہ تو ابھی بہت کم عمر ہے“

”بچو کے ساتھ کی ہے“

”وہ کوئی بڑھیا ہو گئی ہے اور پھر....“

بڑھیا نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

بڑی اماں نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”پتلے اس کی مرضی تو معلوم کر لیجئے، زبردستی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے ساتھ۔“

”زبردستی کون کر رہا ہے؟ امتحان سے فارغ ہو جائے تو مرضی بھی معلوم کر لیں گے۔“

”ہاں، بالکل، یہ بہت ضروری ہے، وہ غریب تو بے زبان ہے، ہر بات پر سر جھکانا ہے“

”اچھا، اب تم اپنی تو کو“

بڑی اماں حرف دعا اپنی زبان پر لے ہی آئیں۔

”کیا؟“

”تم کب کر دگے شادی؟“

”آپ گھوم پھر کر میری ہی شادی کا ذکر کرتی ہیں“

بڑھیا مسکرائے۔

”سب ہی کی شادیوں کی فکر ہے مجھے تو“

” لیکن ساتھ میں مجھے مزد گھسیٹی ہیں “
 ” تم نے بھی تو مجھے عاجز کر رکھا ہے کسی طرح حامی ہی نہیں بھرتے۔ “
 ” فی الحال تو میرا موڈ ہی نہیں ہے شادی کرنے کا۔ “
 ” بڑھاپے میں موڈ ہوگا شادی کرنے کا؟ “
 ” کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ “
 ” میں زبردستی کروں گی تمہاری شادی کچھ گئے میاں؟ “
 ” بڑی اماں نے کہا۔ “
 ” میرا کیا ہے؟ آنے والی اپنی قیمت کو روٹے کی عمر بھر۔ “
 ” بڑھاپے نے لاپرواہی سے کہا۔ “
 ” تمہارے منہ میں خاک۔ “
 ” بڑی اماں جل کر بولیں۔ “
 ” بس پھر زبردستی کبھی نہ کیجئے گا میرے ساتھ۔ “
 ” میری بلا سے، جو تمہارا جی چاہے کرو، اپنے آپ کچھناؤ گے۔ “
 ” بڑی اماں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ “
 ” ارے، تو آپ جاگنا رہی ہیں، بیٹھے۔ “
 ” نہیں میاں، بس مرنے والی ہوئی کرو میرے حال پر۔ “
 ” کیوں؟ “
 ” کوئی نہال ہوئی جا رہی ہوں میں تمہارے پاس بیٹھ کے۔ “
 ” بڑی اماں اپنے بھاری بھر کم جسم کو سنبھالتی ہوئی کمرے سے باہر نکلیں۔ “

” ہفتہ اور شیعہ جس دن آخری پرچہ دے کہ مال سے باہر آئیں تو انہوں نے اس طرح
 بیان کا سانس لیا جیسے قید سے چھوٹ کر آ رہی ہوں۔ “
 ” اب کیا پردہ کرنا ہے ہفتہ باجی؟ “
 ” بھونے مسکرا کر پوچھا۔ “
 ” گھر چلے ہیں اور کیا پردہ کرنا ہے؟ “
 ” ہفتہ نے کہا۔ “
 ” بھوکھی سوچ میں پڑ گئی۔ “
 ” تم کس سوچ میں پڑ گئیں؟ “
 ” ہوں، میرا تو کوئی اور پردہ کرنا ہے۔ “
 ” وہ بھی بتا دو۔ “
 ” ماموں جان کے یہاں چلتے ہیں۔ “
 ” ماموں جان کے یہاں؟ “
 ” ہفتہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ “
 ” ہاں، آپ کو حیرت کیوں ہو رہی ہے؟ “
 ” اماں، یکم منع کرتی ہیں نا! “
 ” تو ہم کو فساد کی بات مان کے دیتے ہیں؟ “
 ” بھونے مسکرا کر کہا۔ “
 ” مگر یہ تو بڑی بات ہے، وہ ناراض ہوں گی۔ “
 ” ان کی یہ ناراضگی بے جا ہے۔ آخر ہم کیوں نہ ملیں اپنے ماموں سے؟ “

شجر نے تنگ کر کہا۔

”اگر ان کو پتہ چل گیا تو؟“

”چل جائے پتہ، بلکہ میں خود بتاؤں گی انہیں۔“

شجر نے کہا۔

بنفشتہ چپ چاپ اس کی طرف تکتی رہی۔

”اب تو میں ڈنکے کی چوٹ پہلوں کی ان لوگوں سے۔ اماں بیگم جتنا منع کریں گی۔“

ہی جاؤں گی ان کے یہاں، مجھے بھی ضد ہے۔“

عصے میں شجر لال چند رہی گئیں۔

بنفشتہ پھر بھی کچھ نہیں بولی۔

”آپ کو اگر میرا ساتھ دینا ہے تو دیجئے، ورنہ میں اکیلے چلی جاؤں گی۔“

شجر نے کہا۔

”افو، اتنا غصہ؟“

بنفشتہ مسکرائی۔

”ہاں، بس جلدی فیصلہ کیجئے۔“

شجر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی۔

”نکمرہ نہ کرو، میں تمہارا ساتھ دوں گی۔ مگر فردی ہے کہ آج ہی ان کے یہاں جاؤ۔“

”ہاں، آج، ابھی اور اسی وقت۔“

شجر نے ایک ایک لفظ پر زور دیا۔

”چلو، جیسی تمہاری مرضی، مگر اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔“

بنفشتہ نے کہا۔

شجر کا غصہ تو ایسا ہی ہوا کرتا تھا، ادھر آیا اور ادھر گیا۔

فراقتیسی باہر نکل آئی۔

کالچ گیٹ سے باہر نکل کر دونوں نے رکنہ پکڑا اور بڑے ماموں جان کے گھر چل دیں۔

رکنہ گھر کے سامنے رکھا تو ممانی جب لاف عباس بھائی کے کمرے سے نکلتے ہوئے نک

گئیں۔ انہوں نے درپچے کا سپردہ سر کا کر باہر بھاگنا اور ان کا چہرہ ایک دم کھل اٹھا۔

”کون ہے امی؟“

عباس بھائی نے پوچھا۔

”شیجہ اور بنفشتہ ہیں۔“

ممانی جان کے چہرے سے خوشی چھلکی پڑ رہی تھی۔

عباس بھائی بستر سے اٹھنے لگے۔

”تم کیوں اٹھ رہے ہو، لیٹے رہو۔“

ابھی اکہ مذاق اڑائیں گی شجیہ، کہ دراصل بخار ہو گیا تو بستر پر پڑ گئے۔“

عباس بھائی مسکرائے۔

”اس کی باتیں تو بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔“

ممانی جان نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ان کی آواز سے شدید محبت کا اظہار ہوتا تھا۔

شجر ممانی دروازے کے قریب پہنچتے ہی زوردار انداز سے سلام بھاڑتے ہوئے

ممانی جان سے پٹ گئیں۔ بنفشتہ کی آواز حسبِ معمول مدہم تھی۔ شجر ممانی الگ ٹہیں تو انہوں نے

بنفشتہ کو گلے سے لگا لیا۔

عباس بھائی نے کہا۔

ممانی جان اس بات کا جواب تو کیا دیتیں؟ ان دونوں کی نوک جھونک پر ہنسنے لگیں۔

بنفشہ درتپنے کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی ان لوگوں کی باتیں سن کر مسکرا رہی تھی ممانی جان

کمرے سے باہر نکلنے لگیں تو دوجی سے ٹکراتی ٹکراتی بچپن جو شمع کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی تھیں

”آج میں آپ لوگوں سے بات کرنے نہیں آئی ہوں“

بنجنے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ کیا قصور ہو گیا ہم لوگوں سے؟“

”آپ لوگوں کا قصور یہ ہے کہ ابھی آپ لوگوں کے امتحان ختم نہیں ہوئے“

”ذرا اپنی بات کی وضاحت کرو۔“

مدجی نے کہا۔

”مطلب یہ کہ تم تو اپنے امتحانوں سے فرصت پا کر آرہے ہیں۔“

”چھس؟“

”پھر یہ کہ آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتے۔ ممانی جان سے ملنے آئے ہیں۔“

”مگر تم تو بات کریں گے، چند گھنٹوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”جی ہاں، اور بعد میں مجھے کو سیں گی، یہ بھی تو کہئے۔“

”بڑی بدگمان ہو رہا رہی طرف سے۔“

”ہاں، معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔“

بنجنے ایک انگلی سے سر کھاتے ہوئے کہا۔

”تم بھی تو کچھ بولا کرو بنفشہ!“

کمرے میں داخل ہوتے ہی بنجو کی نظر عباس بھائی پر پڑی وہ حیرت زدہ رہا۔
جلدی جلدی انگلیوں کو ملتے ہوئے بولی۔

”اسے! آپ! اس وقت؟ اور کھر میں؟“

”جی نہاب!“

عباس بھائی مسکرائے۔

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں سب خیریت ہے۔“

عباس بھائی نے کہا۔

”نہیں بیٹی، طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

ممانی جان بولیں۔

”کیا ہوا طبیعت کو؟ مجھے تو پچھلے نظر آ رہے ہیں۔“

بنجنے کہا۔

”کانی تیز بخار ہے۔“

ممانی جان مسکرائیں۔

”ذرا دیکھوں تو۔“

”بنجنے آگے بڑھ کر ان کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔“

”یہ کہیں ٹھنڈا بخار ہو گا۔“

بنجنے نے کہا۔ حالانکہ پیشانی چھوتے ہی اسے احساس ہوا تھا کہ واقعی تیز بخار ہے۔

”میں تھوڑی عادت اچھی طرح جانتا ہوں، اسی لئے اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ میں ناٹا ہوں۔“

عباس بھائی نے کہا۔

”جی، میں بھی بولتی ہوں۔“

بنفشتہ ان کے ایک دم غائب کرنے پر ہلکا گئی، کوئی اور جواب ہی نہ بن پڑا۔
”کب بولتی ہو؟ میں تو تمہیں ہمیشہ چپ چاپ بیٹھے ہی دیکھتا ہوں۔“

عباس بھائی مسکرائے۔

”گھر میں بولتی ہوں۔“

”یہ کیا جنگل ہے؟“

عباس بھائی کی مسکراہٹ گری ہو گئی۔

”جی نہیں تو۔۔۔ اپنے گھر میں بولتی ہوں۔“

بنفشتہ اور زیادہ بولا گئی۔

”یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔“

عباس بھائی یہ بات کہتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ ان کی آنکھیں سوچوں میں ڈوب گئیں۔

”صرف ہم لوگوں کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے عباس بھائی۔“

بنخورانی بھی خاصی سنجیدہ ہو گئیں۔

”ہوں ٹھیک کتنی ہونم۔“

عباس بھائی کی آنکھوں میں سوچیں اور گری ہو گئیں۔

روحی اور شمع نے بھی موضوع کی سنجیدگی کو محسوس کیا، لیکن انہوں نے سوچا، ان سب باتوں پر غور و فکر کرنا بیکار ہے کچھ حاصل نہ ہوگا، بل جل کر ہتھی خوشی میں جتنے لمحے بھی گزر جائیں۔

وہی غنیمت ہیں۔

”ان باتوں میں کیا رکھا ہے، کوئی اور ڈھنگ کی بات کیجئے آپ لوگ۔“
شمع نے کہا۔

بنخورانی نے سوچا کہ شمع باجی ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ایسی باتوں کے لئے اپنا ذہن خراب کرنے کا کیا فائدہ؟ فوراً اپنا موڈ خوشگوار کرتے ہوئے بولیں۔

”ڈھنگ کی بات یہ ہے کہ کھانے کو کیا لے گا آج؟“

”جو بھی پکا ہو گا بل جائے گا۔“

”وہی تو پوچھ رہی ہوں، کیا پکا ہے؟“

”یہ تو امی سے پوچھ کر بتا سکتی ہوں۔“

”آپ کو گھر داری سے کوئی مطلب نہیں ہے؟“

”امتحان ہونے والے ہیں بھی، آج کل تو ہم باورچی خانے میں جھانکتے بھی نہیں۔“

”امتحان تو ہم بھی دے کر آ رہے ہیں۔“

”ہاں تو کیا ہوا؟“

”ہم بھی تو آخر کام کرتے ہیں؟“

”کیا کام کرتی ہو تم؟“

شمع مسکرائی۔

”بیٹے، آپ کو کچھ خبر ہی نہیں۔“

”تو متی کچھ بتاؤ۔“

”گھر داری کی کل ذمہ داری ہم دونوں کے سر پہ ہے۔“

شبنو نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

”اچھا!“

شمع نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”ہاں اور کیا، صبح پانچ بجے سے اٹھ کر ہم دونوں ناشتہ تیار کرتے ہیں پورے

گھر کا۔“

”ہوں۔“

شمع نے اپنی مسکڑھٹ ضبط کرتے ہوئے گردن ہلاتی۔

”گھر میں افراد بھی تو ایک بنا لیں برابر ہیں۔“

شبنو نے سنجیدگی سے کہا۔

انشاء اللہ، نظر نہ لگے۔

روحی نے جلدی سے کہا۔ وہ گھر کے افراد کی گنتی کرنا بہت برا سمجھتی تھی۔

”اچھا اور سنئے!“

شبنو عباس بھائی کے بستر کے پائنٹی پرسنیل کر بیٹھ گئیں۔

”ہاں، سنائیے۔“

روحی نے کہا۔

”دوپہر کو تھکے ہمارے واپس آتے ہیں کالج سے تو سارے گھر کا کھانا پکاتے ہیں۔“

”کیوں؟ وہ خاندان، شیراز بنو.....“

”ارے سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں، ہمارے انتظار میں!“

شبنو رانی نے بڑے غصے والا منہ بنایا۔

”تو پھر ان لوگوں کو بیکار ہی رکھ بھڑا ہے۔“

شمع نے کہا۔

”ہاں بالکل، میں تو کہتی ہوں نکال باہر کرنا چاہیے ان لوگوں کو مفت کی روٹیاں توڑ رہے ہیں۔“

شبنو نے کہا۔

”اچھا اور ملت کا کھانا کون پکاتا ہے؟“

روحی نے اس کی بات سے لطف اندوز ہو کر کہا۔

”وہ بھی ہم ہی پکاتے ہیں اور کون پکائے گا۔ دو گھڑی کو کر ٹکسنے کی بھی فرصت نہیں ملتی یا

”تو پھر وہ پھر بھی جان اور بڑی ماں وغیرہ کیا کرتی ہیں؟“

شمع نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ان لوگوں کو باتیں بدلنے سے ہی فرصت نہیں ملتی اور پھر ویسے بھی میں سوچتی ہوں کہ

اب ان لوگوں کی عمر آرام کرنے کی ہے۔“

”ہاں، یہ تو ٹھیک ہے، لیکن شمعہ اور عمرانہ بھی کچھ نہیں کرتیں؟“

”وہ دونوں یونیورسٹی جاتی ہیں، یونیورسٹی ہے بھی تو کالے کوسوں، وہاں سے اگر

نکل جاتی ہیں اور پھر سچی بات تو یہ ہے کہ میری اور شمعہ باجی کی عادت ہی نہیں کہ ہم

اپنے ہوتے ہوئے کسی کو تکلیف دیں۔“

”ہاں، یہ تو بڑی اچھی بات ہے، مگر آج تم لوگ ادھر آگئی ہو تو وہاں کیا ہوگا؟“

”ہوگا کیا؟ تو بڑی بڑی ہوئی ہوگی وہاں۔“

شبنو نے کہا۔

اس کے بعد تو شمعہ اور روحی سے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو گیا انہیں اچھی طرح معلوم

تھا کہ شجر کو دھنگ سے چائے تک بنانی نہیں آتی ہے۔

شبیخ نے اسے ایک دھپ لگاتے ہوئے کہا۔
”شبو، جھوٹ بولا کرو مگر اتنا زیادہ نہیں۔“

”اگر میں جھوٹ بول رہی ہوں تو بنفشہ باجی سے پوچھ لیجئے۔“
شبیخ نے کہا۔

”بہت بکواس ہو چکی شبیخ۔“

عباس بھائی نے ہنس کر کہا۔

”اچھا تو بنفشہ باجی سے تصدیق کرو لیجئے، ان تمام باتوں کی۔“

”اس سے کیا پوچھ لوں، وہ بھی تو تمہاری صحبت میں رہتی ہے فدا ہاں میں ہاں ملے۔“

”پوچھ کے تو دیکھ لیجئے۔“

شبیخ بیگم مٹھتی ہیں۔

عباس بھائی نے بنفشہ کی طرف دیکھا، جو اپنی ہنسی روکے بیٹھی تھی۔

”ہاں، اب آپ کچھ فرمائیے۔“

عباس بھائی نے کہا۔

”کیا فرمائیں؟“

”یہ بکواسی لوڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے اس میں کتنی صداقت ہے۔“

”ایک پائی کی بھی نہیں۔“

بنفشہ نے کہا۔

”حد ہو گئی بنفشہ باجی، آپ سے تو مجھے ایسی امید بالکل نہیں تھی۔“

شبیخ نے اپنا سر پیٹ کر کہا۔

”اب بکو تم۔“

عباس بھائی نے شبیخ کی طرف دیکھا۔

”سوائے اس کے ادھر کیا کہہ سکتی ہوں کہ اپنی عمر عزیز کے اتنے سارے پیش قیمت

لالہ کے ساتھ ناحق گوائے۔“

شبیخ نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیوں؟ خیریت؟“

”جی نہ پوچھا۔“

”میری ٹریننگ کارتی برابر بھی تو اثر قبول نہیں کیا انہوں نے۔“

”اچھا ہی ہوا، ورنہ بالکل چوسٹ ہو کر رہ جاتی۔“

مردن ہائیں۔ اسی وقت ممانی جان کھانے کے لئے بلائے آگئیں۔ شعیبہ بیگم تو
 لانا مانتے ہی پھلا ہنگ لگا کر کمرے سے باہر نکل گئیں۔ راجی اور شمع بھی ہنسنے
 لگے۔ کچھ پچھل گئیں۔ ہنسنے اپنی جگہ گم مسم میٹھی رہ گئی۔ سچی بات یہ تھی کہ
 اسے شجھو کی بات سے بڑا دکھ پہنچا تھا وہ سوچ رہی تھی کہ شعیبہ کو قبل از وقت
 لے کر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ پتہ نہیں کیوں اسے اپنے ہاتھ پیرے جان سے
 ہوتے۔ اسے ایسے لگا جیسے رماغ سن ہو کر رہ گیا ہو۔ اسے اس بات کا بھی خیال
 نہ تھا کہ ممانی جان کھانے کے لئے کہہ کر گئی ہیں اور نہ ہی اسے اس بات کا احساس
 تھا کہ اپنے کمرے میں نہیں بلکہ عباس بھائی کے کمرے میں بیٹھی ہے عباس بھائی
 مازہ سے بیٹھے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک بات ہے ہنسنے؟

عباس بھائی نے پوچھا تو اس نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور اسی لمحے اس
 کی آنسوؤں سے وعدہ لگائیں۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو پینے کی بڑی کوشش کی،
 اور نالوں پر پھسل ہی پڑے۔

تم — رو کیوں رہی ہو؟

ہاں بھائی نے پوچھا۔

راجی، نہیں تو۔

ہنسنے نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لئے۔

اسی وقت شمع اسے دوبارہ بلائے آگئی، لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ
 لٹ کر رہ گئی۔

”غفریب ہی ہنسنے باجی کی سنگتی رنگتی قسم کی کوئی چیز ہونے والی ہے“

”اچھا، کب؟ کس سے؟“

سب نے پوچھا۔

”غالباً سلمان بھائی سے“

شجھو اپنی رو میں کسے گئی۔ یہ نہیں دیکھا کہ ہنسنے کے چہرے کا رنگ ایک
 اس کی آنکھوں سے چلتے ہوئے دکھا اور پریشانی کو کسی نے نہیں دیکھا۔ سب
 دے رہے تھے۔ اور وہ پلکیں جھکاتے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ جانا
 بھائی کو کیا ایک اس کی کیفیت کا احساس ہوا — وہ پلکیں جھپکاتے یا
 اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے، مگر پھر دوسروں کی موجودگی کا احساس

اور ذہن مسلسل اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔ اسی کے متعلق سنی سنائی باتیں۔

بہت پرانی!

بہگم بنفشہ کے بار بار ٹوکے پر بھی شام سے پہلے ماموں جان کے گھر سے نہیں
بڑا ذہن ایک تو ویسے ہی پریشان تھا، اوپر سے اس ڈر کے مارے اور بھی
وہ انکو کہہ گیا کہ گھر پہنچنے پر اماں بہگم اچھی طرح خبر لیں گی۔ مگر بنجھو کو ناراض کرنا بھی
وہ نہیں تھا۔ اندر ہی اندر گھٹتی رہی۔

دھردھی ہوا جو ہونا چاہئے تھا جب وہ دونوں گھر پہنچیں تو اس وقت تو اماں بیگم
پر نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر وصی کی بہن امدان کی اماں آئی ہوئی تھیں۔ شاید آپا جان سے
پہن کر وانی تھیں۔ دونوں دم دبا کر اپنے کمرے میں گھس گئیں۔ بنجھو نے امدان
پارلوکھ دیر کے لئے تو مصیبت ملی رہے گی، لیکن بنفشہ یہ سوچ رہی تھی کہ آخر
اماں کب تک بیٹھنا لگیں گی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھاڑ پڑے گی۔
وہاں اس وقت ان لوگوں کو سلام کے لئے جانا خطرے سے خالی نہ ہوگا، لہذا
گراہا بیٹے، گرام سے بستر پر پڑ گئیں۔ بنفشہ سہمی ہوئی کسی کمرے پر بیٹھ گئی۔
بی بی نہیں گزرے تھے کہ چھٹا باجی کو اماں نے قاصد بنا کر دوڑایا وہ اپنی بیٹی

رہے میں داخل ہو گئیں۔

اماں کو اماں بیگم بلا رہی ہیں۔

ہاں؟

نہیں! انجان بن کر پوچھا۔

معلوم نہیں۔

”کیا بات ہے عباس بھائی؟“

شمع نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”بنفشہ؟“

شمع نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”کچھ نہیں! کچھ بھی تو نہیں شمع باجی۔“

بنفشہ نے گہرا کر کہا اور جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”آپ سے کوئی بات ہوئی عباس بھائی؟“

”نہیں شمو، وہ جتنی بات کرتی ہے تمہیں معلوم ہی ہے۔“

”تو پھر کیا قصہ ہے؟“

”میں نے تو یہ غس کیا ہے کہ جس وقت سے بنجھو نے ان کی منگائی

اسی وقت سے....“

”اچھا، میں نے غور نہیں کیا۔“

شمع نے کہا اور روجی کے آواز دیتے پر چلی گئی۔

عباس بھائی اتنی دیر سے محض شرماء حضوری میں بیٹھے ہوئے تھے

حالت غیر ہر ہی تھی۔ شمع کے جاتے ہی وہ لیٹ گئے، مگر بنفشہ کی کیفی

کا ذہن ایک دم پریشان ہو کر رہ گیا تھا۔

”معلوم نہیں وہ کیوں روئی تھی؟“

انہوں نے آنکھیں بند کر کے سوچا۔

چھٹ باجی کو اسے تنگ کرنے میں خاصا لطف آ رہا تھا۔
 دلوں جان کے یہاں گئے تھے اور کہاں جاتے؟

”نچو نے ڈھٹائی سے کہا۔

”لوں شامت اُٹی ہے نچو تمہاری؟“

”شامت کی کیا بات ہے؟“

”ابھی اچھی طرح خبر لیں گی اماں بیگم، پھر تپہ چلے گا“

”اس میں خبر لینے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے“

”نچو نے ڈپر واہی سے کہا۔

”جب وہ ناراض ہوتی ہیں.....“

”ہوتی ہیں تو ہو کر ہیں۔ اب تو میں ڈنکے کی چوڑ پہ جایا کروں گی ان کے یہاں“

”نچو کا پارہ پھر مٹی ہو گیا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں بدتمیزی پر کمر باندھی ہے تم نے؟“

”چھٹ باجی نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

”آپ ہی لوگ مجھے بدتمیزی پر اکساتے ہیں“

”کیوں؟ ہم نے کیا کیا؟“

”ظاہر ہے آپ آبا جان، سجاد بھائی اور سکیل بھتیجا مجھ سے بڑے ہیں۔ یہ آپ

لاکڑی ہے کہ ان اختلافات کو ختم کریں۔ جب آپ لوگ کوئی قدم نہیں اٹھاتے

برا بڑے.....“

”مجھے ہمیں تو اتنی ہمت نہیں ہے۔“

”آپا جان کی ساس اور نند کو سلام کرنے کے لئے بلارہی ہوں گی؟“
 ”نچو نے ناک چڑھائی۔

”ممکن ہے“

”چھٹ باجی نے نقشہ کے اندر سے ہونٹے چہرے کی طرف دیکھا۔

”بھئی ہمیں ضرورت نہیں ہے ان کی دعاؤں کی“

”نچو نے چہرے پر یں کا مظاہرہ کیا۔

”یہ بات اماں بیگم سے ہی جا کر کہو۔“

”چھٹ باجی بولیں۔

”فرصت نہیں ہے ہمیں“

”نچو نے لاپرواہی سے کہا۔

”اور یہ تو بتاؤ تھیں کہاں صبح سے؟“

”امتحان دینے گئے تھے۔“

”ابھی تک امتحان ہی ہو رہا تھا۔

”چھٹ باجی معنی خیز انداز سے مسکرائیں۔

”نہیں، امتحان تو دوپہر کو ہی ختم ہو گیا تھا۔“

”پھر؟“

”پھر کیا؟ آپ تو دوسری اماں بیگم بن گئی ہیں۔“

”نچو نے جھنجھلا کر کہا۔

”سب بدتمی طرح تباہ و کھاں گئی تھیں۔“

”کیوں نہیں ہے ہمت، اماں بیگم کوئی خزانہ نہیں ہیں۔“
 ”اونہ، تم جانو، تمہارا کام جانے، جب سب کے سامنے خبر لی جائے گا
 آپ دماغ ٹھکانے آجائے گا۔“
 ”یہ بھی ایک ہی رہی۔“

”ایک اور دو تو مجھے معلوم نہیں، یہ مزدور معلوم ہے کہ تم ہمیشہ ہی ڈانٹ
 بغیر دلی رستی ہو۔“

”شجر بیگم کوئی جلا جھینا ہوا اساجواب دینے ہی والی تھیں۔ کہ اماں بیگم کا
 فتوہ آگیا۔“

”بیگم صاحب! بلا رہی ہیں آپ لوگوں کو۔“
 ”اچھا بابا، آ رہے ہیں، پورا گھر دوڑا چلا آئے گا بلانے کے لئے۔“
 ”شجر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔“

”اونہ، اس بدترین کے منہ کون لگے؟“

”چھٹ باجی منہ بنا کر چلی گئیں۔“

”آئیے، انہیں سلام پیش کر آئیں۔“

”شجر نے طنز بہ انداز میں ہنسنے سے کہا۔“

دونوں آگے پیچھے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ ہنسنے عزیب تو ہے
 سہمی ہوئی تھی، لیکن شجر رانی کا انداز وہی دبیر نہ تھا۔ سلام بھی کیا تو لٹھا مارا
 کو بھی مسکراہٹ نہ تھی بلکہ ماتھے پر تیوریاں ہی پڑی ہوئی تھیں۔ اس بات
 کیا کہ بہن کی سسرال کا معاملہ ہے۔ بس، ان کا موڈ ہی ایسا تھا، خراب ہوا

ت بن جاتی تھیں۔ اماں بیگم نے انہیں خشمگین نگاہوں سے گھورا، انداز بالکل ایسا ہی تھا
 کہ رہی ہوں ڈران لوگوں کو چلا جانے دو۔ پھر میں تمہارے مزاج پوچھوں گی۔ مگر شجر
 اوج کسی بھی بات کی پرواہ نہ کرنے کا تہیہ کئے بیٹھی تھیں۔ آپا جان کی ہونے والی
 بڑی پیاری سی مسکراہٹ ہونٹوں پر بکھر کر نرم اور میٹھے لمبے میں اپنے پاس بیٹھنے
 پر کشش کی تو میں بھر کا تو بیڑا سجا کر بیٹھ گئیں۔ وہ بے چاری امتحان اور پرچوں کے بارے
 پوچھنے لگی۔ شجر رانی نے جواب تو خیر مجبوراً ہر بات کا دیا، لیکن انداز تمام وقت وہی لٹھ
 بنے دار رہا۔ بلکہ اس کی خوش مزاجی پر کچھ چڑسی گئیں۔ دل ہی دل میں کہہ رہی ہیں۔

”ہذا سب بناوٹ ہے، ابھی آپا جان کو یہاں کہہ نہیں گئیں نا، دینا زمانے کی
 نرہ اپنی آواز میں سمور کھی ہے۔ بعد میں جیب لمبے میں زہر گھولیں گی جب پوچھوں گی
 آپا جان جاؤں گی اگر آپا جان کے ساتھ بڑا سلوک کیا۔“

اس مندرجہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ یہ دل ہی دل میں ٹھیک کیا کہہ رہی ہے
 لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ اس وقت شجر کا زیادہ قصور تھا ہی نہیں۔ اب اس کا موڈ ہی
 اوقات خراب تھا وہ کیا کرتی؟ ورنہ وہ کبھی کسی کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں سچتی
 گا اور پھر آپا جان کے سسرال والے تو اسے پہلی ہی نظر میں بہت بھانگے تھے اب
 زمانہ لوگوں کی قسمت تھی کہ وہ ایسے دن آکر اس سے ٹکرائے تھے جب وہ ایک دم
 غارتی ہو رہی تھی۔

شجر رانی کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ کر ہنسنے کے ساتھ اپنے کمرے میں واپس آگئیں۔
 وہی بڑبڑا کر اپنی لمبی لمبی ٹانگیں بستر پر پھیلا دیں۔ ڈانسٹر آن کر دیا اور انکھیں بند
 کر کے گانے سننے لگیں۔ ہنسنے بستر پر ایک طرف سکر سمٹ کر بیٹھ گئی وقت گزاری کے لئے

ایک رسالہ اٹھا کر اس کے اوراق اٹٹنے لگی۔ اماں بیگم ان لوگوں کو رخصت کر کے نیکار
ان لوگوں کے کمرے میں آئیں۔ شجورانی نے ان کے قدموں کی آہٹ سُن کر پہچان کر
لی تھی، مگر پھر بھی اسی طرح آنکھیں بند کئے بیٹھی رہیں۔

”شجورانی!“

اماں بیگم نے ان کے سامنے پہنچ کر کہا۔

شجورانی نے چونکنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور ان کی طرف
اور پاؤں نیچے ٹٹکا کر سنبھل کر دیکھ گئیں۔

”جی اماں بیگم!“

”صبح سے کہاں غائب تھیں؟“

اماں بیگم کا لہجہ زیادہ سخت نہیں تھا۔

”صبح سے دوپہر تک تو امتحان ہی ہوتا رہا۔“

شجورانی نے اطمینان سے کہا۔

”پھر؟ اس کے بعد؟“

”اس کے بعد ماموں جان کے ہاں چلی گئی تھی۔“

”کیوں؟ کس سے پوچھ کر گئی تھیں؟“

”اماں بیگم، آپ کے سوال کے پہلے حصے کا جواب تو یہ ہے کہ دل چاہ رہا۔“

اور دوسرے.....

”شجورانی!“

اماں بیگم نے انتہائی غصے سے کہا۔

”جی۔“

شجورانی نے بڑی سعادت مندی سے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے میں ان لوگوں کے یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتی۔“

”زیادہ کہاں جاتی ہوں، ایک مہینہ ہو گیا.....“

”اچھا، تو تم اس سے پہلے بھی جا چکی ہو مجھ سے پوچھے بغیر۔“

اماں بیگم کو اور غصہ آ گیا۔

”جی ہاں، آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا ورنہ بتا دیتا۔“

شجورانی بغیر کسی ڈر خوف کے کہا۔

”تم بہت بدلتیزی ہو گئی ہو۔“

اماں بیگم نے اپنا عضو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے تو کوئی بدلتیزی نہیں کی۔“

شجورانی معصومیت سے کہا۔

”یہ بدلتیزی نہیں تو اور کیا ہے؟ تمہیں وہاں جانے کو منع کیا جاتا ہے اور تم بغیر

پرچہ وہاں چلی جاتی ہو۔“

”تو آپ منع بھی کیوں کرتی ہیں؟“

شجورانی نے کہا۔

اماں بیگم چند لمحے حیرت زدہ سی اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ شجورانی سے اتنی بدلتیزی کی توقع
انہیں ہرگز نہیں تھی۔ مانا کہ وہ بدلتیزی اور ہمیشہ سے تھی، لیکن یہ آج والا روپ انہوں
نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنے لہجے پر قابو پایا اور لہجے کو

قدر سے نرم بناتے ہوئے بولیں۔

”جو کچھ کہا کروں، سن لیں۔“

”آپ کی ہر بات سن لیں، لیکن یہ بات نہیں مان سکتی۔“

شیخو نے آہستہ سے کہا۔

”کیا مطلب؟ یعنی تم وہاں جاؤ؟“

”جی۔“

”میں منع کروں، جب بھی؟“

اماں بیگم نے غصے سے پوچھا۔

”منع کریں گی تو اور زیادہ جاؤں گی۔“

شیخو زانی کا انداز کسی ضدی بچے کا سا تھا۔

”کیوں تمہاری شامت آئی ہے شیخو؟“

اماں بیگم زور سے چیخیں۔

شیخو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”معلوم نہیں کیا جا دو کہ وہاں ہے ان لوگوں نے تمہارے اوپر؟ آخر اور بھی تو

بچے ہیں۔“

”وہ تو سب بزدل ہیں۔“

شیخو نے اطمینان سے کہا۔

”یا میرے خدا؟ کیا ہو گیا ہے اس لڑکی کو؟“

اماں بیگم نے اپنا سر پیٹ لیا۔

”گھر بھر کے لاڈ پیار نے تمہیں بالکل چوڑے کر کے رکھ دیا ہے نہیں، دوکڑی

لہجی ضرور ہیں تم تو۔“

اماں بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے شیخو کو گھورا۔

”اماں بیگم، میں تو آپ کے سامنے ایک تجویز بھی پیش کرنے والی تھی۔“

شیخو نے اس طرح کہا جیسے بڑے خوشگوار ماحول میں ان دونوں کی گفتگو ہو رہی تھی۔

”جہنم میں جا لئے تمہاری تجویز۔“

اماں بیگم جل کر بولیں۔

”سن تو لیجئے، میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر سجاد بھائی اور شمع بھائی کی شادی ہو جائے تو۔“

”تم کہاں کی بڑی بوڑھی لکھیں سب کے رشتے طے کرنے والی؟“

اماں بیگم نے ڈپٹ کر کہا۔

”کیسی ہے تجویز؟ میرا خیال ہے کہ کوئی حرج نہیں ہے اس میں۔“

شیخو نے ان کی بات کو نظر انداز کر کے کہا۔

”ہوش کے ناخن لو شیخو، تم تو بالکل ہی ہاتھوں سے بھگ گئی ہو۔“

اماں بیگم نے دل پیلی آنکھیں کر کے کہا۔

”پھر اس بات کا بھی امکان ہو سکتا ہے کہ عباس بھائی اور چٹ باجی بارشترہ.....“

”میں کبھی ہوں چپ ہو جاؤ، مجھے اس گھر میں رشتے جوڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔“

اماں بیگم مارے غصے کے اتنی زور سے چلائیں کہ ہنسنے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے لاپ گئی۔

”کمال ہے اماں بیگم، آپ کو یہ بھی خیال نہیں کہ میں آپ کی سب سے چھوٹی اولاد ہوں

آپ کو مجھ سے فراسی بھی محبت نہیں ہے، ورنہ اور لوگ تو.....“

”ہاں محبت نہیں ہے، جیجی تو پال پوس کے اتنا بڑا کیا ہے“
اماں بیگم بولیں۔

اتنے میں وادی اماں جواب تک خاموش تماشا ٹی کی طرح ایک طرف کھڑی تھیں، کھسکھس کرتی آگے بڑھیں اور شجورانی کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔
”بڑے افسوس کی بات ہے بیٹا، تم اتنی بدتمیزی کرو ہواں سے“
”میں سچی بات کہتی ہوں تو سب کو بدتمیزی نظر آتی ہے، سب کو میں بڑی گنتی ہوں، کسی کو مجھ سے محبت نہیں ہے۔“

شجودونوں ہاتھوں میں نہ چھپا کہہ کسی کے ہاتھ پر ٹھک گئی، لیکن روئی نہیں اس کی آنکھوں میں بہت کم آنسو آتے تھے۔

شجو کا یہ روپ دیکھ کر تو سبھی گھبرائے۔ بڑی اماں، چھوٹی جیجی، آبا جان اور بیٹا باجی سبھی آگے بڑھ آئے۔ اماں بیگم تو اس کا جملہ سننے سے پہلے ہی کمرے سے جا بھاگی تھیں۔ سب لوگ شجو کو چمکانے پر پارے میں لگ گئے، مگر وہ کسی سے کوئی بات نہ کہنے بغیر اٹھ کر باہر چلی گئی اور برائے کی ٹھنڈی سیڑھیوں پر کھجے سے سر ٹکا کر پڑ گئی۔
مختصر سی دین تک فضول قسم کی باتیں سوچنے کے بعد اپنے آپ ہی اس کا موڈ ٹھیک کیا۔ رات کو کھانے کی میز پر وہ اسی طرح چمک رہی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔
اگلے دن — اماں بیگم نے شجورانی کے یہ کام سپرد کیا کہ وہ بنفشہ سے سالانہ کے رشتے کے سلسلے میں اس کی مرضی معلوم کریں۔ شجورانی کی توجہ سن کر ہاتھیں مل گئیں۔
کمرے میں پہنچ کر جو اس کا چھپا پکڑا ہے تو دو گھنٹے تک اس کا مغر کھاتی بیٹھ اپنا کیا کرتی رہیں۔ اس میں ان کا قصور نہیں تھا۔ غلطی ساری بنفشہ کی تھی جو اپنے

انہیں بتا رہی تھی۔

تھک ہار کر شجورانی نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ کام بڑھتیا کے سپرد کر دوں گی، مگر بڑھتیا رات بھر نہیں اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان سے کب ملاقات ہو سکے گی، لیکن ان کا غدار کرے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا پھر — بڑھتیا سے رات کے نو بجے لے لہدی ملاقات ہوئی۔ شجورانی نے ساری بات ان کے گوش کش گزار کر کے اپنی بالائے سر ڈالی اور بنفشہ کو ان کے پاس بھیج دیا۔

بنفشہ کو بھی معلوم تھا کہ بڑھتیا نے اس وقت کیوں بلایا ہے، لیکن جاتی نہ تو کیا کرے، سسے سے قدم رکھتی ان کے کمرے میں پہنچی۔ بڑھتیا اس وقت دھچکے کے قریب آگے بڑھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بنفشہ نے چوں چر اس کے کمرے کی قید کی، بڑھتیا اس کے سامنے آکر بیٹھنے لگی۔ بنفشہ نے بڑی بے بسی سے ان کی باتیں سنی۔ بڑھتیا اس کے چہرے پر نظریں جاتے جاتے کیا سوچنے لگی، کچھ دیر بعد ان کا سر جھٹک کر بغیر کسی تنہید کے بولے۔
”میلان کے متعلق کیا فیصلہ کیا تم نے؟“

بنفشہ ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر نہ شرانی نہ لچائی۔ اصل میں بڑھتیا کو اس نے شروع سے اپنے دل و دماغ میں ایک غلط دوست کی حیثیت سے جگہ دی تھی، ان سے لڑائی بات کہنے یا سننے میں اسے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔ بالکل یہی حال شجورانی کا تھا حالانکہ ان کی اور بڑھتیا کی عمروں میں اچھا خاصا فرق تھا، لیکن پھر بھی بڑھتیا کی حیثیت میں جانے کیا بات تھی؟ کیا چیز تھی؟ جو سجاد بھائی اور کبیل بھائی میں نہ تھی۔ بنفشہ نے بڑھتیا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموش بیٹھیں ان کی طرف مکتی رہی۔

بڑھیا نے جب دوبارہ اپنا سوال دہرایا، تو اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ انہوں نے
سہ بارہ پوچھا، تو اس نے بڑی باقا مدگی سے رونا شروع کر دیا۔

بڑھیا اس کے سامنے بیٹھے چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے انہوں نے
اس سے نہ تو یہ پوچھا کہ تم کیوں روتی ہو؟ اللہ ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس نے چند منٹ بعد
نے اپنے آنسو پونچھے تو انہوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

”مجھے کچھ نہیں معلوم شعیب بھائی میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“
بنفشہ کی آواز مدہم تھی۔

”سیلان تمہیں پسند نہیں؟“

”میں نہ انہیں پسند کرتی ہوں نہ ناپسند کرتی ہوں۔“

”اتنے عرصے میں اس نے کوئی جگہ نہیں بتائی تمہارے دل میں؟“

”شاید نہیں۔“

”ممکن ہے شادی کے بعد خود بخود جگہ بن جائے۔“

بڑھیا نے کہا۔

”ہاں۔ ہو سکتا ہے ایسا ہو۔“

”تو پھر تمہاری طرف سے اثبات میں جواب دے دیا جائے؟“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

”بعد میں خدا نخواستہ کوئی بات ہوئی تو سارا الزام مجھ پر ہی دھرو گی اگر وہ“

”ٹھیک ہے نا؟“

”نہیں، میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی۔“

”اچھا، یہ بات تو ختم ہو گئی۔ اب ایک اہم بات ملو۔“
”سنائیے۔“

”میری بات پر عمل کرو گی؟“

”جی۔ ضرور۔“

”تمہیں زندگی میں کسی وقت بھی کوئی تکلیف ہو، سیلان کی طرف سے یا کسی اور“

”ان سے تم مجھ سے نہیں چھپاؤ گی۔“

”جی!“

بنفشہ نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں میرا یہ حکم ہے۔“

بڑھیا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔“

بنفشہ نے حامی بھر لی۔

”ہاں، اب تم جاسکتی ہو۔“

”جی۔ وہ ————— شعیب بھائی، مجھے بھی ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔“

”پوچھو۔“

”آپ ناراض تو نہیں ہوں گے۔“

”میں سب سے ناراض ہو سکتا ہوں، لیکن تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا۔“

”میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟“

بنفشہ کا انداز قدر سے سہا ہوا تھا۔

بڑھیا نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، پھر سر جھکا لیا۔ کئی لمحے گزر گئے اور
جلنے کیا سوچتے رہے؟

”میں بھی کمروں کو شادی، مگر ابھی نہیں۔“
بڑھتی کی آواز — یوں لگتا تھا جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔
”دکب کریں گے؟“

”اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔“
بڑھیا اٹھ کر در پیچے میں کھڑے ہو گئے۔
بنفشتہ نے پٹ کر ان کی طرف دیکھا وہ باہر تاریکی میں دیکھ رہے تھے۔
”اب تم جاؤ، آرام کرو۔“
بڑھیا نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

بنفشتہ کمرے سے اٹھ کر دوا ایک لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی پھر آہستہ دروازے
سے باہر نکل گئی۔

سچا دھبائی کو جب اماں یکم نے بنفشتہ اور سلیمان دھبائی کے رشتے کے بارے میں
بتایا تو دو مین منٹ تک وہ سکتے کے عالم میں ان کی طرف تکتے رہ گئے پھر آہستہ
”بنفشتہ سے پوچھ لیا آپ لوگوں نے؟ وہ کیا کہتی ہے؟“

”ہاں، پوچھ لیا، راضی ہے۔“

”راضی ہے!“

سچا دھبائی نے ایک بار پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔
”ہاں ہاں، تمہیں حیرت کیوں ہو رہی ہے؟“

میں اچھے قطعی حیرت نہیں۔ بس پھر ٹھیک ہے، اسب ٹھیک ہے۔“
سچا دھبائی نے جلدی سے کہا اور اٹھ کر سیٹی بجاتے ہوئے کمرے سے باہر چلے گئے۔
اسی شام — دادا جان کے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے سلیمان دھبائی کی ڈویٹر
رہ گئی۔ بنفشتہ کے سلسلے میں گھر کے سارے بزرگوں کی رضامندی حاصل ہو جانے
اور ان دنوں وہ مارنال ہوئے جا رہے تھے شیخو کو دیکھتے ہی باپ بچیں کھل گئیں۔ اس کے
رک کر آہستہ سے بولے۔

”بچہ مبارک! وہ نہیں دو گی؟“

”کبات کی؟“ شیخو نے انجان بن کر پوچھا۔

”بہت زیادہ، ورنہ ایک، دھبیا رسید کروں گا۔“

”بہت زیادہ نہ اتنا ایسے، ابھی شادی تو نہیں ہوئی نا!“

”پر مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اگر میرے اوپر رعب جایا، تو سارا معاملہ اٹھا کر دوں گی۔“

”اچھا بابا، معاف کر دو، غلطی ہو گئی۔“

”بائیے، ابد مدت نے معاف کیا، شیخو کا انداز شاہانہ تھا۔“

”اچھا اب یہ تو بتا دو، بنفشتہ کہاں ہے؟“

”دکب میں ہیں۔“

”اچھی بات ہے پھر خدا حافظ۔“

سلیمان دھبائی نے جلدی سے کہا اور سامنے والی راہداری کی طرف مڑ گئے۔

بنفشتہ اسی وقت عصر کی ناز پڑھ کر اٹھی تھی اور جاننا نہ تہہ کر رہی تھی اس نے حسب

بنفشہ کا انداز سادہ تھا۔

عادت آہستہ سے سلام کیا۔ سلیمان بھائی نے سر کے خیف سے اشارے سے ہوا اور والہانہ انداز سے اس کے قریب آگئے۔

”بنفشہ، میں جیت گیا۔“

سلیمان بھائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بنفشہ کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

”تم — خوش ہونا؟“

”جی — جی ہاں۔“

بنفشہ کی جھکی پلکیں آہستہ سے لرز کر رہ گئیں۔

”اُد، باہر چلیں، یہاں تو گھٹن ہو رہی ہے۔“

”باہر کس؟“

”ظاہر ہے کہ لان میں، اور کہیں تو تم جاؤ گی نہیں میرے ساتھ فی الحال۔“

”چلے۔“

بنفشہ نے کہا اور ان کے ساتھ کمرے سے باہر آگئی۔

”ویسے — میرا خیال ہے کہ اگر کبھی کبھی ہم دونوں گھومنے چلے جاؤ۔“

اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔“

بنفشہ نے چلتے چلتے ایک لمحے کے لئے رک کر ان کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے فلم دیکھنے، یا پھر کسی بانی ہاؤس اور کبھی پائینز ریڈیو۔“

سلیمان بھائی نے جلدی سے وضاحت کی۔

”جیسے آپ کی مرضی — لیکن اجازت لینا ضروری ہے۔“

بنفشہ کا انداز سادہ تھا۔

کس سے اجازت لینا ضروری ہے۔“

لان یگم اور واوی اماں سے۔“

ان کی تم فکر مست کرو، وہ میں سے لوں گا۔“

سلیمان بھائی نے لان چپڑ کھسکاتے ہوئے لاپرواہی سے کہا۔

بنفشہ نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے ایک دبی ہوئی سانس لی۔ معلوم نہیں

اسے اپنا دم گھٹنا ہوا عسوس ہو چکا تھا۔ سلیمان بھائی نے ادھر ادھر کی باتیں شروع

لانے اپنے آپ کو ان کی باتوں میں دلچسپی لینے پر پوری طرح آمادہ کر لیا۔

ان رات بنفشہ کو بالکل غنیمت نہیں آئی اس کی زندگی میں اچانک جو ایک نیا

عہد ہوا تھا، اس کے صفات پڑھتے پڑھتے صبح ہو گئی، کوشتش کے باوجود

گھر دیوں کو بھی دہرانے سے باز نہ رہ سکی وہ گھڑیاں — وہ لمحے — جو

پہن کی معصوم یادوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھے۔ اس رات اس نے

یہ باتیں سوچیں اور آنکھوں سے چپ چاپ بہتے ہوئے آنسوؤں کو روک دیا

کہ اپنی زندگی کو وقت اور حالات کے دھارے کے ساتھ بہنے کے لئے

ان کے غمات رک رک کر سرکتے رہے۔ نتیجے دھندلوں میں گم ہوتے رہے

کہ لاتائیں اسے سلیمان بھائی کے قریب سے قریب نہ کر کرتی گئیں۔ اسی ہنگام

میں آپا جان کی شادی کا دن بھی آگیا۔ آپا جان کے ہاتھوں اور پاؤں میں مندی

رک پھاپ پڑی، سہیلیوں نے بابل گایا اور آپا جان سرخ زرتار جوڑا پہنے

ہاں بات ٹاننا سیکھا ہی نہیں تھا اور پھر بڑ بھیا کا نام سن کر تو اس کے دل کو چپکا گیا تھا۔

بے چارے شعیب بھائی اب تک بھوکے بیٹھے ہیں۔ اس نے باورچی خانے ان جاتے ہوئے سوچا۔

اور جب وہ بڑ بھیا کا کھانا لے کر ان کے کمرے میں گئی تو ان کے بجائے ان بھائی بیٹھے نظر آئے۔ بڑ بھیا باغداد میں تھے۔

بنفشتہ نے سوچا۔ چلو اچھا ہے، اس وقت عباس بھائی کو مبارکباد بھی دے دوں گی۔ اٹنی اڑتی یہ خبر اس کے کانوں تک بھی پہنچی تھی۔ مگر ماموں جان کے کسی دوست لڑکے سے ان کی شگنی ہونے والی ہے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اس نے اپنے مخصوص انداز میں آہستہ سے سلام کیا۔ ان بھائی نے بھی حسبِ عادت سر کے خیف سے اشارے سے جواب دیا بنفشتہ ہلکا مار کھنے کے لئے جھکی تو عباس بھائی کمرے کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے بے چارے کا بغور جائزہ لیا۔ بنفشتہ نے سر اُپر اٹھایا تو عباس بھائی کو اپنی طرف اس دیکھنے پر لکھ کر گئی۔

”اب خیر نہیں۔ عباس بھائی پھر اپنا سوال دہرائیں گے“ بنفشتہ نے سوچا اور فوراً ہی اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اگر وہ خوب بات کرنا شروع کرے تو عباس بھائی کو اپنی بات کہنے کا موقع ہی نہ مل سکے گا۔ وہ جلدی سے بولی۔

”اُپ کو مبارکباد دوں عباس بھائی؟“

”کسی بات کی؟“

آنسوؤں کی برسات میں بھیگی ہوئی وعادوں کی کلیاں منبتی ہو جھل اور تھتھتے تھے تو اس رخصت ہو گئیں۔

آپا جان چلی گئیں۔ ان سے وابستہ باتیں اور ان کے بچپن اور جوانی باقی رہ گئیں کہنے کو گھر میں سب تھے، لیکن پھر بھی کھالی خالی سا لگتا تھا۔ قفسے پر مسکراہٹیں بھی تھیں لیکن پھر بھی ایک عجیب سی دیوانی اور مرنے پر ان کا احساس بڑا شادی کے شگاموں میں شاید امان بیگم نے پھیلی باتیں بھلا دی تھیں۔ شادی کے بعد انہوں نے شادی سے ڈیڑھ ہفتہ پہلے ہی بلا کر رکھا۔ ممانی جان کے پھر روزانہ ہی لگتے تھے۔ ہر کام اور ہر چیز کے بارے میں امان بیگم ان سے بھی مشورہ اسی طرح ماموں جان اور عباس بھائی بھی باہر کے کاموں میں پیشینہ پیش تھے۔ لڑکے کی کمینڈر سے بچنے کے اور کچھ نہیں آتا تھا اس کی عمر بھی ابھی کچی تھی اس دوران اور عباس بھائی کا جب بھی سامنا ہوا۔ انہوں نے اس کے سامنے وہی سوال دہرایا۔

”تم اس دن کیوں روئی تھیں۔“

لیکن بنفشتہ کے پاس یا تو اس سوال کا جواب تھا ہی نہیں یا پھر وہ جواب نہیں چاہتی تھیں۔

آپا جان کی شادی سے ایک روز پہلے ہنگامے اور شور و غل میں کسی کو نہیں رہا کہ بڑ بھیا بے چارے بھوکے بیٹھے ہیں۔ وہ تو امان بیگم کا دھیلا کیسے ان کی طرف چلا گیا؟ انہوں نے بنو کو آواز دے کر فوراً ان کے لئے کھانا کا حکم صادر کیا، گندہ بنو بھلا ایسے میں کس کی منتی تھیں؟ ان دنوں گھر میں ان کے معرفت کوئی تھا ہی نہیں، انہوں نے جھٹ سے اپنا کام بنفشتہ کے پر دے

عباس بھائی کی نگاہوں کا انداز نہیں بدلا۔

”وہ — آپ کی تنگنی ہونے والی ہے نا؟“

”تم سے کس نے کہا؟“

”کئی لوگوں سے سنا؟“

”سنی سنائی باتوں پر یقین مت کیا کرو۔“

عباس بھائی مسکرائے۔

”تو پھر آپ ہی سچ سچ بتا دیجئے۔“

”اوسنہ، کوئی کام کی بات کرو، یہ قطعی غیر ضروری بات ہے۔“

عباس بھائی لاپرواہی سے بولے۔

”تو پھر ضروری بات کونسی ہے؟“

”تم اس دن کیوں روٹی نہیں؟“

عباس بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

”آپ تو ایک بات کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔“

”میں تو اس وقت تک اس بات کے پیچھے پڑا ہوں گا جب تک تم مجھے بتائیں گے۔“

”فرض کیجئے میں اس بات کو بہت برسوں بعد بتاؤں تو؟“

”میں اس وقت تک انتظار کروں گا۔“

عباس بھائی نے بڑے عزم سے کہا۔

”اچھا تو پھر ٹھیک ہے، انتظار کیجئے۔“

”لیکن اس کے ساتھ میری بھی ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”پہلے وعدہ کرو۔ بالو کی ضرورت۔“

”پہلے وعدہ کرتی ہوں۔“

”اچھا کچھ نہیں، بس تم یہ ضرور کرنا کہ بتا دینا۔“

”منقولہ ہے۔“

بنفشہ نے جانے کن سوچوں میں ڈوب کر کہا۔

اسی وقت بڑھیا آگئے۔

”جنت تک میں کھانا کھاؤں تم یہیں بیٹھی رہو۔“

بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔

”اچھا۔“

بنفشہ نے ان کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔

”بہت مزے لگ گئے ہیں تمہیں، ہر وقت کانے بجانے میں مصروف رہتی ہو۔“

”جی مجھے تو کانا آتا ہی نہیں۔“

”بجانتا ہوں۔“

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بستر پر پڑا طرف سٹراٹھا کر آن کر دیا۔

جب وہ کھانے کے خالی برتن لے کر باورچی خانے کی طرف جا رہی تھی تو اس نے سوچا

آخر میں نے عباس بھائی سے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟ جب کوئی بات ہی نہیں ہے

یہ انہیں کیا بتاؤں گی؟ اور پھر ان کو اس بات کا یقین کیوں نہیں آتا کہ میں جو اس دن روٹی تھی تو

نہ اس لئے کہ نتیجہ نے اس بات کا بالکل بے وقت اور بے موقع ذکر کیا تھا۔

بنفشہ اور شیخو کا نہ لٹ آیا تو سلیمان بھائی نے ان دونوں کے پاس ہونے کی خوشی میں ہڈ
میں کھانا کھانے کا پروگرام بنایا۔ ان دونوں کے طفیل میں باقی لوگوں کے بھی مزے آگئے۔
سلیمان بھائی سستے ہی چھوٹ گئے کیونکہ اس دن سباد بھائی کی ہاسپٹل میں ناشٹل ڈا
بھئی۔ اچانک اپنی سسرال میں بیٹھی تھیں۔ بڑھیا کو اس دن کوئی بہت ضروری کام یاد آیا۔
بھیا، چھٹ باجی اور صوفیہ رہ گئیں، لیکن سچی بات تو یہ تھی کہ سوائے بنفشہ کے بھی طفیل
شیخو نے توصیف کہہ دیا کہ سلیمان بھائی بنفشہ باجی کو اپنے ساتھ ہوٹلوں اور کلبوں میں لگا
کے لئے راہ ہموار کر رہے ہیں۔

اس وقت تو سلیمان بھائی نے نہیں، انہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ کہہ کر بات
لیکن کچھ دنوں بعد جب سلیمان بھائی وادی ہلال اور اماں بیگم کی بہت منت سماجت کی
بنفشہ کو اپنے ساتھ فلم دکھانے گئے تو شیخو کی بات سچ ہی ثابت ہوئی اور بنفشہ
یہ بھی کہ مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ دل ہی دا
دعا کر رہی تھی کہ کوئی صورت ایسی نکلی آئے۔

بنفشہ کی حالت یہ تھی کہ مارے گھبراہٹ اور پریشانی کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ
گئے دعا کر رہی تھی کہ کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ فلم کا پروگرام کینسل ہو جائے۔
اس کی زندگی میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ لوگوں کے ساتھ تنہا گھومنا پھرنا اسے سخت ناپسند
علاج ہے وہ رشتے کے بھائی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سلسلے میں اس نے شیخو سے مدد کی
درخواست کی تو اس نے لمبی چوڑی تقریر کے بعد یہ فیصلہ سنایا کہ آپ کو سلیمان بھائی
کے ساتھ ضرور جانا چاہیے اس میں کوئی حرج نہیں ہے ایک آدھ سال بعد آپ کی
ناری ان ہی کے ساتھ ہوتی ہے۔

بنفشہ جب تیار ہو کر وادی ہلال کو خدا حافظ کہنے کے لئے آئی تو اس نے بہت
دم آواز سے کہا۔

داوی اماں! اگر آپ اجازت نہ دیتیں تو اچھا تھا۔

اجازت نہ دیتی تو کیا کہتی بیٹا! وہ تو اس بری طرح پیچھے پڑ گیا تھا۔

ہاں! اسے بھی تو اس قدر ضدی۔

قربیب بیٹی ہوئی اماں بیگم بولیں۔

مجھے اکیلے جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے اماں بیگم!

بنفشہ دل کی بات زبان پر سے آئی۔

وہ اگر دل کی بات نہ بتاتی تب بھی کوئی فرق نہ پڑتا، اس کا چہرہ تو اس کے

دل کا آئینہ دار بنا ہوا تھا۔

تم تو انشاء اللہ بڑھی لکھی اور سمجھدار ہو، تمہیں اس قدر بزدل نہیں ہونا چاہیے!

اماں بیگم نے اس کو تسلی دی۔

حالانکہ انہیں بھی نہ بہ بات پسند تھی اور نہ ہی وہ سیماں کے اس انداز سے

مطمئن تھیں۔

بنفشہ داوی اماں کو سوچوں میں گم چھوڑ کر کہنہ قدموں سے باہر نکل گئی۔

گاڑی میں سیماں بھائی کے برابر بیٹھے ہوئے اس کا دل بڑی زور سے دھڑکا۔

تو اتنا بھی ہوش نہیں تھا کہ گردن موڑ کر ایک نظر سیماں بھائی کے چہرے پر ڈال لیتی؟

بے پناہ ترست سے چپک رہا تھا گھر سے سینما ہاؤس تک کا آدھا راستہ گزر گیا۔

لیکن بنفشہ نے ان کی طرف دیکھا بھی نہیں وہ تو بس دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکے

کھڑکی سے باہر دیکھے جا رہی تھی اس کا پریشان چہرہ دیکھ کر سیماں بھائی غور سے

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور گہری ہو گئی تھی۔ ایماں کی بات تو یہ تھی کہ سیماں بھائی

رادت بہت پیارے لگ رہے تھے بنفشہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس پر جانے

بکریست لگی ہوتی۔ ہر لڑکی بنفشہ کی طرح بزدل تو نہیں ہوتی۔

سیماں بھائی جب بنفشہ کے بولنے کا انتظار کر کے تھک گئے تو مجبوراً انہیں

بات شروع کرنے پر پڑی۔ انہوں نے گھبراہٹ سے ہونے کے باوجود کھنکھا کر صاف

بالا دھیر سے بولے۔

کیوں بیوی؟ آخر یہ ناراضگی کس بات کی ہے؟

ناراضگی تو کسی بات کی نہیں۔

پھر یہ چپ تباہ کاروں کیوں رکھ چھوڑا ہے۔

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

کچھ تو بولو؟ کچھ تو کہو۔

سیماں بھائی نے کہا۔

دیکھئے سیماں بھائی۔

جی ہاں! دکھائے، لیکن یہ بات آپ نوٹ کر لیجئے بلکہ میں آپ کا بھائی نہیں ہوں۔

بنفشہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

ہاں! کیا دکھا رہی تھیں آپ مجھے؟

کچھ نہیں۔

یہ کیا بات ہوئی؟

سیماں بھائی مسکرائے۔

بنفشہ نے سوچا کہ میری غایت اسی میں ہے کہ میں چپ چاپ بیٹھی رہوں۔

نہیں بالکل نہیں۔

اُب نہیں جانتے تھے سخت گھبراہٹ ہوتی ہے ہٹلوں میں جاتے ہوئے۔
بالکل غلط بات ہے، آخر اس دن بھی تو آئی تھیں۔
اس دن تو اور لوگ بھی تھے۔

اچھا تو یہ وجہ ہے۔

سیمان بھائی نے معنی خیز انداز سے اس کی طرف دکھیا۔

بنفشہ نے سر جھکا لیا۔

اب چاہے تم ڈٹو یا کچھ کرو۔ میں ہر دفعہ تو کباب میں پڑیاں برداشت نہیں
مکتہ۔

سیمان بھائی نے کچھ اتنی بے ساختگی سے یہ جملہ کہا کہ بنفشہ باوجود ڈری سہی
کے ایک دم سکڑا دی۔

مکہ ہے خدا کا اسکڑا ہٹ تو نظر آئی تمہارے چہرے پر۔

سیمان بھائی خوش ہو گئے۔

بس اسی بات پہ گھر چلے۔

جی نہیں۔ بس اسی بات پہ آپ نیچے اترے اور اندر چلے۔

سیمان بھائی اس کی طرف اکہڑا گاڑی کا دروازہ کھولنے لگے۔

اُپ میری بات مان کیوں نہیں جانتے؟ کتنا بڑا لگ رہا ہے۔ سب لوگ کیا

ہے ہوں گے؟

یہ بات میں تم سے کہنے والا تھا، آخر تمہاں کیوں دکھا رہی ہو سب کو؟

پھر پچھراؤ کس پہنچے تک سیمان بھائی نے اپنی سی پوری کوشش کر ڈالا۔
لیکن بنفشہ نے سوائے ”ہوں“ ”ہاں“ کے اور کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔
جب فلم شروع ہوئی تو بنفشہ کی جان میں جان آئی اس نے اپنے آپ کو
یوری فلم کی طرف متوجہ کر دیا۔ فلم دیکھتے تک تو خیر غنیمت تھا لیکن جب واپس
پہ سیمان بھائی نے ایک ہٹل کے سامنے گاڑی روکی تو بنفشہ کا مہر و ضبط جواب
دے گیا۔

سیمان بھائی! بس اب گھر چلے، بہت تفریح ہو چکی۔

اس نے مدہم لیکن قدر سے تیغ لہجے میں کہا۔

نہیں خباب! بیوک لگی ہے، کھانا کھائیں گے۔

سیمان بھائی اطمینان سے بولے۔

کھانا تو گھر میں بھی مل جائے گا۔

لیکن تمہارے ساتھ بیٹھ کے کھانے کو تو نہیں ملے گا۔

آج آپ ہماری طرف کھانا کھالیجے گا اور میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ

جائے گا۔

بنفشہ کا لہجہ بالکل سادہ تھا لیکن سیمان بھائی بہت غصہ ہو گئے۔

خوب! باتیں تو بڑی تنگنہ تھیں کہ لیتی ہو۔

سیمان بھائی نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔

خدا کے لئے سیمان بھائی! میں ہاتھ جوڑتی ہوں، بس اب گھر چلے۔

بنفشہ رو مالنسی ہو گئی۔

میں آخری بار آپ سے کہہ رہی ہوں.....
میں کچھ سننا نہیں چاہتا تم فوراً اترو۔
سیمان بھائی کا اندازہ محکمانہ تھا۔
بنفشتہ کچھ بچھلا کر نیچے اترا آئی۔

اسے ہوشوں میں جانے کی بالکل عادت نہیں تھی اس کے لئے راستہ
دستور ہو گیا۔ جب سیمان بھائی نے کونے والی میز منتخب کر کے اسے بیٹھا
اشارہ کیا تو اس کی کچھ جان میں جان آئی۔ بیرے کو آؤر دینے کے بعد سیمان
اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ چند سیکنڈ اس کے چہرے پر نظر میں جائے کچھ سو
رہے پھر آہستہ سے بولے آج تم نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے بنفشتہ۔
میں نے!!؟

بنفشتہ نے حیرانگی سے ان کی طرف دیکھا۔
تم مجھ سے ڈرتی ہو؟
بنفشتہ خاموش رہی۔

اس کا مطلب ہے کہ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے۔
بنفشتہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔

میں اس بات کا دعویٰ نہیں کرنا کہ میں بہت نیک اور پارسا آدمی ہوں
تمہاری عزت اور میری عزت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں۔
سیمان بھائی نے بڑی بخیدگی سے کہا۔
بنفشتہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

بہن بڑا تو وہ پلکیں ہی جھپکاکر رہ گئی۔

نہن ہے کہ دوسرے لوگوں کا یہ خیال درست ہو کہ میں ٹوکیوں سے فلرٹ کرتا ہوں
لیکن باقی تمام ٹوکیوں میں اور تم میں جو فرق ہے اسے تو میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔
بنفشتہ نے اپنی توجہ سامنے والی میز پر بیٹھے ہوئے جوڑے پر مبذول کر دی۔
کیا بات ہے؟ میری باتیں تمہیں اچھی نہیں لگ رہیں؟

کسی اور موضوع پر بات کیجئے۔

بنفشتہ مسکرائی۔

تم بتاؤ اور کس موضوع پر بات کروں؟

چھوڑیے، اب تو کھانا آنے والا ہوگا، اتنی دیر ہم لوگ خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔
خاموش بیٹھنا تمہیں بہت اچھا لگتا ہے۔

جی۔ اور وہ اس لئے کہ مجھے باتیں کرنے کی نہیں آتیں۔

باتیں کرنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔

موقع محل کے لحاظ سے باتیں کرنا یقیناً مشکل کام ہے۔

سیمان بھائی چپ چاپ بیٹھے اس کی پلکوں کی گہرائی اچھی چلن کی طرف دیکھتے

ہے بیرے کے آنے تک وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

جب دونوں گھر پہنچے تو بنفشتہ نے ایک لمحے کے لئے رک کر سیمان بھائی کی طرف

دیکھا اور حیرت سے بولی۔

سیمان بھائی!

سیمان بھائی مجسم شوق بنے اس کی طرف بڑھ آئے۔

ایک درخواست کروں؟

درخواست؟ تم حکم دو۔

سیلان بھائی اس کی طرف والمانہ انداز سے دیکھ کر مسکرائے۔

آپ۔ آپ مجھے تنہا کہیں نہ لے جایا کریں۔

بنفشتہ کے بچے میں جھجک تھی۔

کیوں؟

سیلان بھائی سنجیدہ ہو گئے۔

وہ۔ بات یہ ہے تاکہ مجھے گھر والوں سے شرم آتی ہے۔

بنفشتہ کی جھجکی پلکیں اس کے رخساروں پر کانپ کر رہ گئیں۔

فی الحال میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

سیلان بھائی شیخو کو آتے دیکھ کر دوسری طرف مڑ گئے۔

پھر شیخو نے بنفشتہ کا انٹرویو لے ڈالا۔ وہ اس کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے

تنگ آگئی۔ جب شیخو نے اسے باقاعدہ چھیڑنا شروع کیا تو وہ روٹا ہوا ہو کر لاپا۔

تم نے خود ہی تو بھیجا تھا مجھے۔

ہاں! تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنی مرضی سے گئی تھیں۔

تو پھر تم غصے تنگ کیوں کر رہی ہو؟

یہ لیجئے۔ یعنی آپ تو اپنے ان کے ساتھ گھوم پھر کے لطف اندوز ہوں اور ہر کام

کو تنگ کرنے کا لطف بھی نہ اٹھا سکیں۔

بس! اب میں کبھی نہیں جاؤں گی ان کے ساتھ۔

ایسا غضب بھی مت کیجئے گا، ان کی حالت ویسے ہی قابلِ رحم ہے۔

بنفشتہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ چھٹ باجی کمرے میں داخل ہوئیں۔

ہالان کی شادی ہو جانے کے بعد سے وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں

برکات کی تو آپا جان کے ساتھ ہی گھٹتی تھی۔ شیخو نے اندازہ مہر دی انہیں اپنی

ہال میں شامل کر لیا تھا۔ شیخو کے بعد چھٹ باجی نے بنفشتہ کا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔

لیڈی فالان کمرے میں نہ آجائیں تو اس کی جان چھوٹنی مشکل تھی۔

اس رات بنفشتہ نہ چاہتے کے باوجود بڑی دیر تک سیلان بھائی کے متعلق سوچتی

تھی۔ اس نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ آئندہ چاہے سیلان بھائی اس سے ناراض ہی ہو جائیں

وہ ان کے ساتھ تنہا کہیں نہیں جائے گی۔ لیکن جب وقت آیا تو اس کا ہر ارادہ اور ہر

فیصلہ ریت کی دیوار ثابت ہوا۔ وہ ہر دفعہ سیلان بھائی کے ساتھ جانے پر مجبور ہو گئی۔

اس کے سارے بزرگ بھی سیلان بھائی کے آگے جاتے کیوں ہار مان جاتے تھے ماں بیگم

نہ تو یہ کہہ کر بات ہی ختم کر دی تھی کہ جب لڑکی کو آگے چل کر ایسے ماحول میں زندگی

گزرانی ہے تو پھر ابھی سے اسے اس کا عادی ہونا چاہیے۔ باقی لوگوں کو بھی ماں بیگم

کی بات عقلمندی پر مبنی معلوم ہوئی۔ لہذا سب نے اس سلسلے میں روک ٹوک کر فی

جھڑ دی۔ اب یہ سیلان بھائی کی سعادت مندی تھی کہ وہ بنفشتہ کو کہیں بھی لے جانے

سے پہلے وادی اماں سے اجازت ضرور لے لیتے تھے۔ ویسے یہ بھی غنیمت ہی تھا۔ کہ

سیلان بھائی نے اب تک بنفشتہ کو کلب لے جانے کی پیشکش نہیں کی تھی۔ لیکن

ایک دفعہ جب سیلان بھائی بنفشتہ اور صوفیہ کو اپنی بیٹی کو کھٹی دکھانے سے جا رہے تھے

جاری پیر تھی تو رستے میں انہوں نے کہا۔

تو ایک دفعہ میرے ساتھ چلو، اگر دل گھبراتے تو مت جانا۔
یلمان بھائی نے کہا۔

اچھا۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔
بنفشہ نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

لیکن جب وقت آیا تو بھی وہ کسی طرح اپنی جان نہ چھڑا سکی۔

سلطان بھائی اور صوفیہ اس بری طرح اس کے پیچھے پڑے کہ تنگ آکر وہ
ہڈا بے ہوش انداز میں جانے کے لئے کپڑے استری کرنے لگی اسی بھینچلا ہٹ
ہاں نے اپنا ہاتھ بھی جلا لیا۔

جب چھٹ باجی اور شیخ نے اس سے یہ کہا کہ واپسی پر پوری رپورٹ پیش کرنا
اپنی بے بسی پر صرف پلکیں جھپکا کر رہ گئی۔

گلاب جاتے ہوئے اس کا ذرا بھی دل نہیں چاہا کہ وہ صوفیہ اور سلیمان بھائی سے
برے۔

لیکن اس کے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا۔ وہ لوگ تو مستقل بولے جا رہے
ہوئے اسے بھی زبان بانی بیڑی۔ سلیمان بھائی نے گاڑی پارکنگ ٹیڈ میں روک کر
بنفشہ کو دل چاہا وہ دروازہ کھول کر ایک دم گھر کی طرف بھاگ جائے وہ سسے
نے انداز میں گاڑی سے نیچے آئی اور پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔
اس طرح مت دیکھو احمق لڑکی۔

یلمان بھائی اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے
بنفشہ کچھ چینپ گئی۔

غیر مزہ! آپ کو میری ایک درخواست قبول کرنی پڑے گی۔

کیسی درخواست؟

بنفشہ نے پوچھا۔

وہ درخواست یہ ہے کہ کل آپ کو میرے ساتھ گلاب چننا پڑے گا۔

گلاب!!!

بنفشہ کی مدہم آواز اور بھی مدہم ہو گئی۔

جی۔

سلیمان بھائی اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہو کر بولے۔

نہیں بھئی! میں ایسی کوئی درخواست قبول نہیں کر سکتی۔

بنفشہ نے کہا۔

آخر کیوں؟

جھے وہاں کے نام سے ہی وحشت ہوتی ہے۔

ایک دفعہ چل کر تو دیکھو، وحشت زدہ ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔

سلیمان بھائی زیر لب مسکراتے۔

بنفشہ خاموش رہی تو سلیمان بھائی نے صوفیہ سے تاکید چاہی جواب تک

کچھ نہیں بتائی لیکن بنفشہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے جا رہی تھی۔

میں بھی تو جاتی ہوں بنفشہ! پھر تمہارے جانے میں کیا حرج ہے؟

بس! اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔

بنفشہ نے پلکیں جھپکا کر کہا۔

بھر لگا دیا۔ لیکن اسے کافی بھی حلق سے آتا نہ دھجھو گیا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات کل نہیں آ سکی کہ سیلمان بھائی نے اتنی بہت ساری چیزوں کا آرڈر کس خوشی میں کیا تھا۔ وہ اس بات کا فیصلہ نہیں کر سکی کہ آیا سیلمان بھائی کا ارادہ سچ یا یہ ساری بڑی کھانے کا تھا یا پھر عرض رعب ڈانٹ مقصود تھا؟

یہ ساری چیزیں کون کھائے گا سیلمان بھائی؟

اس نے سیلمان بھائی سے پوچھا۔

تم کھاؤ گی اور کون کھائے گا؟

سیلمان بھائی نے اس کی طرف کچھ اتنی پیار بھری نگاہوں سے دیکھا کہ وہ منہ پر رہ گئی۔

آپ کو تو اچھی طرح معلوم ہے میں کتنا کھاتی ہوں؟

بنفشہ کی جھکی ٹپکیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔

سیلمان بھائی دوسرے لوگوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر اس کی طرف تکیے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد حسبِ ناچ گانے کا پروگرام شروع ہوا تو بنفشہ کو اور بھی زیادہ گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے بڑی ہمت کر کے سیلمان بھائی سے کہا۔

سیلمان بھائی! میرا خیال ہے اب گھر چلنا چاہیے۔

ابھی سے !!؟

سیلمان بھائی بولے۔

تو پھر کب؟

جب وہ سیلمان بھائی اور صوفیہ کے ساتھ کلب کے صدر دروازے کے دروازے پر تھیں تو اسے ایسا لگا جیسے اس کے پاؤں من میں بھر کے ہو گئے ہوں۔ وہ بڑی مشکو اپنے آپ کو سنبھالے آہستہ قدموں سے چلتی رہی۔ باوجود کوشش کے وہ آپ میں ذرا بھی خود اعتمادی پیدا نہ کر سکی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سارے لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوئی ہوں اور یہ حقیقت تھی کہ بے شمار نگاہیں پر بھی ہوئی تھیں کچھ نگاہوں کا اندازہ بیٹریوں کا سا تھا، کچھ کا شکریہ کٹوں کا اور کچھ نگاہیں بالکل نمدیدی بیٹیوں کے انداز میں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ کچھ یہ بریدگی کے جذبات تھے اور کچھ تنگ و حسد کا انداز لٹے ہوئے تھیں سیلمان نے جب اپنی مخصوص نشست کے قریب پہنچ کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا کی جان میں جان آئی۔ اس نے اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے اطمینان کا سا اشارہ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کر کے آئی ہو۔

ان لوگوں کو بیٹھتے ہوئے مشکل تمام چند منٹ گزرے ہوں گے کہ سیلمان اور صوفیہ کی سیلیوں اور دو سٹون کا ناتنا بندھ گیا۔ وہ تمام لوگ جنہوں نے نشست پر بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ ہلا دیا تھا اب شرفِ ملاقات کی خاطر کر آنے لگے سیلمان بھائی بڑے فخر سے بنفشہ کا تعارف ہر ایک سے کر رہے تھے۔ بالکل یہی کیفیت صوفیہ کی بھی تھی، غنیمت تھا کہ ان دونوں نے مائی کو کہہ ہی تعارف کر دیا تھا "منگیتز" یا "بھابھی" کے الفاظ نہیں استعمال کیے بنفشہ کو تو ان لوگوں کے سوالوں کے جواب دینا بھی مشکل لگ رہا تھا گوشتش میں تھی کہ کم سے کم بولے۔ میرے نے ان کی ٹیبل پر کھانے پینے

دو گھنٹے سے پہلے تو میرا کوئی ارادہ نہیں جانے کا۔ یہ آپ کی زیادتی ہے۔ کیوں؟

میں یہاں بالکل نہیں بیٹھ سکتی، مجھے سخت وحشت ہو رہی ہے۔

آخر کس بات کی وحشت؟

یہ میں نہیں جانتی لیکن.....

اتنے سارے لوگ اور بھی تو بیٹھے ہیں۔

وہ عادی ہو گئے ہیں ان سب باتوں کے۔

یہی تو میرا مطلب ہے کہ تم بھی چار چھ دفعہ یہاں آؤ گی تو تم بھی عادی جاؤ گی۔

مجھے قطعی ضرورت نہیں ان باتوں کا عادی ہونے کی۔

سیمان بھائی اس کے چڑچڑے پن سے لطف اندوز ہو کر مسکرائے۔
بنفشتہ رو ہانسی ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر کچھ اتنی بے بسی تھی۔
سیمان بھائی کو اس پر ترس آ گیا۔ جب چند منٹ ہمک بنفشتہ بالکل خاموش رہی تو سیمان بھائی سے رہنا نہ گیا۔ اس کی طرف قدرے جھکتے ہوئے بولے۔
گھر چلنا ہے؟

جی۔

بنفشتہ نے منہ سے کہنے کے ساتھ ساتھ سر بھی ہلایا۔

چلو اٹھو۔

سیمان بھائی کھڑے ہو گئے۔ صوفیہ کا بھی شابہ آج یہاں دل نہیں

عاجی وہ بھی چلنے کے لئے فوراً تیار ہو گئی۔ گھر واپس جاتے ہوئے بنفشتہ نے
بالادہ کر لیا کہ وہ آئندہ کبھی اتنی وابستات جبکہ نہیں جائے گی۔ اگلی دفعہ جب
ان بھائی نے اس سے جانے کے لئے کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن
ایمان بھائی کے چہرے پر ناراضگی کے آثار نظر آئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی
لے کے لئے تیار ہو گئی وہاں پر بنفشتہ نے جس بیزار سی کا مظاہرہ کیا اس پر سیمان
بھائی نے گئے واسطی میں سارے راستے انہوں نے اس سے کوئی بات نہیں کی۔
انک کہ گھر پہنچ کر بھی وہ بڑی خاموشی سے دوسری طرف ٹکرائے۔

بنفشتہ کے دل پر جانے کیوں چوٹ سی لگی۔

حالانکہ اب تک اس کے دل نے سیمان بھائی کو ایک محبوب کی جگہ نہیں
پائی لیکن اتنے عرصے تک ساتھ رہنے سے اس نے اپنے دل کے انداز کچھ بدلے
رہے گئے تھے۔ جب سے اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ سیمان بھائی اس سے شادی
بنا کے خواہشمند ہیں اس نے اپنے دل و دماغ کو مسلسل سمجھانا شروع کر دیا تھا۔
اب اسے اس بات کا علم ہوا تھا کہ گھر کے بزرگوں نے سیمان بھائی کے ساتھ
ایک طرح سے کچھ کر دی ہے تو اس کی طبیعت میں ایک قسم کا ٹھنڈ
اٹھا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب جب کہ مجھے اپنی زندگی کے بے شمار طویل
عرصے کے ساتھ گزارنے میں تو پھر دل و دماغ کے درمیان ایک سمجھوتہ بھی
پڑے گا وقت گزرنے کے ساتھ اس سمجھوتے میں ایک تنگی آچکی تھی۔

بنفشتہ تو ایسی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کو ناراض ہونے کا موقع نہیں
دیا لیکن اب سیمان بھائی اس سے ناراض ہوئے تو اسے بڑا عجیب سا احساس ہوا۔

اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ روٹھے ہوئے لوگوں کو کس طرح منایا جاتا ہے اور

کایہ شتر حصہ اس نے الجھن پریشانی اور سوچوں میں گزار دیا۔ دوسرا روز بھی ایسے ہی گزرا
کالچ گئی تو کالج میں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ واپس آکر بھی وہ زیادہ ترقی نہ
پائیے پڑی رہی۔ باوجود کوشش کے وہ اپنے آپ میں اتنی ہمت نہ پاسکے کہ سما

بھائی کے پاس جا کر ان سے معافی مانگ سکتی۔ حالانکہ یہ معافی بلاوجہ کی ہی ہوا
سچی بات تو یہ تھی کہ سیما بھائی خواہ مخواہ ہی ناراض ہو گئے تھے۔

اور اس وقت تو اس کا دل دکھ کر رہ گیا جب شام کو سیما بھائی منزل
مطابق وادی اماں، دادا جان اور باقی بزرگوں کو سلام کرنے کے لئے آئے۔ شجرہ
بات کی، چھٹ باجی سے بھی کی۔ لیکن اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔

کیا مجھ سے اتنا بڑا قصور سرزد ہو گیا ہے؟

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور درتپے میں جھکی ہوئی دیر تک اداس اداس
سے خیالات کا بوجھ اپنے ذہن پر لئے رہی۔

اس کے بعد جب دور روز اور اسی انداز سے گزر گئے تو صبر و ضبط کا

اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ ضرور سیما بھائی کے پاس جائے
گی۔ لگے روز کا انتظار اس نے بڑی بے چینی سے کیا لیکن وہ شام ہونے کا انتظار

نہ کر سکی۔ دیر کو جب سیما بھائی آفس سے واپس آئے تو ان کی گاڑی کا وارنر کہ

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک نگاہ شجرہ پر ڈالی جو بات تو سچ پر سورہی تھی یا پھر سزا

کی ایک سنگ کردہ ہی تھی۔ سر ہانے سے دوپٹہ اٹھا کر نشانوں پر پھیلاتے ہوئے

وہ کھڑی ہو گئی۔ اپنے کمرے سے سیما بھائی کے کمرے تک کا فاصلہ اس نے

نواب کے سے عالم میں طے کیا۔

پہلی اچھا ہی ہوا کہ راستے میں اس کی کسی سے بھی ٹکرائی نہ ہوئی ورنہ کسی کے
پچہ پر وہ کیا کتنی، کیا بتاتی۔

سیما بھائی نے ابھی کپڑے بھی نہیں تبدیل کئے تھے۔ جوتوں اور کپڑوں سمیت
اپنے بستر پہ آڑے ترچھے لیٹے بلا مقصد پیر پلاٹے جارہے تھے۔ کمرے میں اس کے

دو دروازے تھے۔ ایک کمرے کی طرف کھلتا تھا، اور سگرٹ کا سمری دھواں باریک کیمبر کی
انہیں چھت کی طرف بلند ہو رہا تھا، ان کی خوبصورت آنکھیں سوچوں میں ڈوبی ہوئی

الذہن میں سوائے غمشہ کے اور کسی کا تصور نہیں رہتا۔ کمرے کا پردہ ہوا سے
ہلچل رہا تھا۔ انہیں چپ چاپ لیٹے دیکھا اس نے آہستہ سے دروازے پر

دکھائی۔ سیما بھائی چونک کر اٹھے۔ دھنک کا یہ انداز ان کے سامنے نیا تھا۔ وہ
کوئی دیکھ گئے۔

کون ہے؟ انداز آؤ۔

غمشہ اپنے دھڑکتے دل کو منجھائے اندر داخل ہو گئی۔

سیما بھائی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا، انہیں ایسا لگا جیسے وہ
اب دیکھ رہے ہوں۔ غمشہ ان کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی اور وہ ایک ٹک

ہار کھینچ گئے۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ اس سے بیٹھ جانے کو کہہ دیتے۔
کیسے آئی ہو غمشہ؟

ہندوؤں بعد انہوں نے پوچھا۔

غمشہ خاموش رہی۔ جھکی ٹپکیں اور پتہ اٹھ سکیں۔

کچھ تو بولو نقشہ بیگم!
سیلان بھائی اس کے بالکل قریب آکر کھڑے ہو گئے۔
سیلان بھائی!
نقشہ نے بشکل تمام یہ دو لفظ زبان سے ادا کئے۔
ہاں۔ ہاں۔ کمو۔

سیلان بھائی نے اس کے خبہ سے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر نقشہ نے بس ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا۔ اور پھر — دل طوفان آنکھوں تک آیا اور ساحل کو بھی پار کر گیا سداہ دونوں ہاتھوں میں منہ پٹی رو پڑی۔

سیلان بھائی گھبرا گئے انہیں توقع نہیں تھی کہ وہ یوں رو پڑے گی اسے دیکھ کر ان کا دل دکھ سا گیا۔ انہوں نے اسے چپ کرانے کی بہت کوشش کی۔ نقشہ کے بستے آنسو کسی حرج غصے میں ہی نہیں آ رہے تھے۔ اس کی آنکھوں پر پوری شبنمی آنسوؤں سے بھگتی رہیں اور آنسو اس کی کھٹیوں میں پڑی ہوئی کھٹیوں پر سرخ چوڑیوں سے دکھ کر نیلے آنچل میں جذب ہوتے رہے۔

سیلان بھائی کے دل کا سارا پیار مسکندہ کی آنکھوں میں آ گیا۔ انہیں یاد ہو کہ نقشہ اتنی اچھی تو انہیں کبھی بھی نہیں لگی تھی انہوں نے سگرٹ قریب ہی میز پر اینٹھنے میں ڈال کر بڑی آہستگی سے اس کی ہتھیلیاں چہرے سے ہٹا دیں۔

تم رونے کیوں لگیں؟
سیلان بھائی نے پوچھا۔

نقشہ نے جھپکی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔

میں نے آپ سے کیا کہا تھا جو آپ نے مجھ سے بات کرنا فی جھوڑ دی۔
ہوں۔ تم نے مجھ سے کیا کہا؟

سیلان بھائی نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔
نقشہ خاموش رہی۔

تم مجھے جو بہت کمرہ تھی ہو۔ ہر بات میں تمہاری طرف سے انکار میرے دل کو تکلیف پہنچاتا ہے؟

نقشہ ان کے جملے کا مطلب سمجھ گئی تھی اس نے خاموش رہنے میں ہی بتری بھیجی۔
میں تم سے کسی غلط کام کے لئے نہیں کہتا پھر بھی تمہارا یہ انداز ہے۔

اچھا۔ اب آپ جیسے کہیں گے میں ویسے ہی کروں گی۔
نقشہ کی آواز بہت دھیمی تھی۔

تم نے خوا خواہ ہی مجھے تین چار دن پریشان رکھا۔
سیلان بھائی مسکرائے۔

میں خود بھی تو خوش نہیں رہی ان چار دنوں میں۔

نقشہ نے دل میں سوچا سیلان بھائی سے نہیں کہا۔ لیکن سیلان بھائی نے خود اس کے دل کی بات کہہ دی۔

الہ مجھے معلوم ہے کہ تم خود بھی اس طوفان پر سکون نہیں رہیں۔

آپ کو کیسے معلوم؟
جھپ کر مسکرائی۔

مجھے سب معلوم ہو جاتا ہے۔

سیلان بھائی کی لگا ہوں میں شوخی تھی۔

بنفشتہ نے نظریں جھکا لیں۔

تو پھر آج شام کو کہاں چلنا ہے؟

سیلان بھائی نے پوچھا۔

جہاں آپ لگیں۔

بنفشتہ نے کہا۔

ایسی ہی فرمانبرداری کا ثبوت دیا کرو نا ہمیشہ!

سیلان بھائی ہنسے۔

بنفشتہ نیم باز آنکھوں سے ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔

اچھا جاؤ تم بھی کیا یاد کرو گی؟ آج شام سب کو کافی ہاؤس سے چلوں گا۔

بنفشتہ نے ان کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

تم میرے ساتھ تنہا جاتے ہوئے ڈرتی ہو نا!

سیلان بھائی نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔

اگر ہمیشہ سب کو بے چلیں تو ایک بات بھی ہے۔

بنفشتہ نے کہا۔

یہ تو نا ممکن ہے۔ کباب میں کبھی کبھی بڑی برداشت کی جاسکتی ہے لیکن

روز روز والی بات.....

بنفشتہ کو ہنسی آگئی۔

ہنسی ہوا، دل بھر کے مجھے پریشان کیا ہے تم نے۔

سیلان بھائی نے کہا۔

میں نے کب پریشان کیا؟

اور پھر کس نے کیا؟ تمہیں کچھ اندازہ ہے تم مجھے کتنی اچھی گنتی ہو؟

سیلان بھائی نے والہانہ انداز سے اس کی طرف دیکھا۔

بنفشتہ نے انکار میں گروں ہلائی۔

پھر تمہیں دنیا میں کسی بات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

سیلان بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

اچھا۔ تو اب میں جاؤں؟

بنفشتہ نے پوچھا۔

کیوں؟ بس اتنی سی دیر میں بیزار ہو گئیں؟

نہیں، مجھے نیند آ رہی ہے۔

پھر ضرور جاؤ۔ شام کو تیار رہنا۔

سیلان بھائی نے کہا اور بنفشتہ پر سکون ہو کر چلی گئی۔

تین چار دن سے دل و دماغ پر جو بوجھ تھا وہ اتر گیا تو اس نے اپنے آپ کو

تھکا چلا محسوس کیا۔

پھر اس کے بعد بنفشتہ نے اپنے آپ کو سیلان بھائی کے رحم و کرم پر چھوڑ

دادہاں بھی جانے کے لئے کہتے وہ بیزار ہی کا احساس کئے بغیر ان کے ساتھ

لاٹا ہوا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ بنفشتہ کے اس حد تک بدل جانے میں پھٹ باجی کا

بھی بڑا ہاتھ تھا۔ ایک دن جانے کس موقع پر چھٹ باجی نے کہا تھا۔

آج کل اچھے رشتے ملے کہاں ہیں، یہ تو ہم سب کی خوش قسمتی ہے کہ میلاد بھائی نے تمہیں پسند کیا ہے۔

لوگوں کو تو ایک ہی بیٹی پہاڑ معلوم ہوتی ہے ہم تو تین ہیں، ذرا سوچنا بیگم اور بامیاں کتنے فکر مند ہوتے ہوں گے؟

بنفشہ کے دل پر جانے کیوں یہ باتیں نقش ہو کر رہ گئی تھیں؟

اس نے سوچا۔ وہ تو زبردستی کا بوجھ بن گئی ہے ان لوگوں کے اوپر۔

اس کے بعد سے اس کے دل میں سیلمان بھائی کیلئے خاصی قدر پیدا ہو گئی۔ ان کا

مرضی پر چلنا جیسے اس نے اپنا فرض سمجھ لیا سیلمان بھائی نے بھی اس کے معاملہ

میں اپنا رویہ خاصا غلط رکھا تھا۔ وہ اسے روز روز اپنے ساتھ نہیں لے جاتے تھے

بلکہ خود بھی زیادہ تر شاہیں گھر پہ ہی گزارتے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ بنفشہ اور سیلمان بھائی کے درمیان فاصلے خود بخود

ہونے لگے۔

جس روز بنفشہ اور بنجھو کے بی۔ اے (فائنل) کے امتحانات شروع ہوئے،

روز چھوٹے چچا اپنی نئی کوٹھی میں شیفٹ ہو گئے۔ دادی اماں بے چاریوں نے تڑپ

بڑھاپے کا سارا زور صرف کر ڈالا لیکن وہ ان لوگوں کو روکنے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

دادا جان نے ان لوگوں کو جی بھر کے برا بھلا کہا مگر بنجھو نے سوچا کہ دادا جان بک بک

کر بلا وجہ ہی اپنی امر جی ویسٹ کر رہے ہیں ان کے برا بھلا کہنے سے چچا جان کا

تھوڑی جا بٹیں گے۔

اپنی کوٹھی میں منتقل ہو جانے کے بعد سیلمان بھائی کچھ دنوں تک تو بڑی باتا دنگ

تہ نام کو سامری دیتے رہے۔ آئے تو کسی طرح جانے کا نام ہی نہ لیتے۔ رات گئے

تک بیٹھے رہتے۔ یہ بنفشہ ہی کی کشش تھی جو انہیں دہاں کھینچ لاتی تھی۔ اکثر و بیشتر

بنفشہ کو ساتھ لے کر گھومنے بھی چلے جاتے کبھی کلب، کبھی ہوٹل، کبھی پکچر اور کبھی صرف

مرد کوں پر مرکوز کرنے پر نکل جاتے۔ پھر ان کی آمد و رفت میں تبدیلی کی آتی تھی۔ آہستہ

آہستہ انہوں نے بنفشہ کو کلب سے جانا بالکل چھوڑ دیا۔ صرف گھر پر آکر مل لیتے۔ بنفشہ

کے ساتھ دوسری تقریریں گاموں پر جانا بھی کم کر دیا۔ اس غیر معمولی تبدیلی کو ہر شخص

نے غور کیا۔ بنفشہ بھی بے حس تو نہیں تھی لیکن اس نے صرف شکایت زبان پر لانا

مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنے دوسروں اور اندیشوں کو دل ہی میں چھپائے چپ چاپ

آنے والی شام و سحر کا انتظار کرتی رہی۔

دادی اماں، اماں بیگم اور گھر کے دوسرے بزرگ اس انتظار میں ہی رہے کہ

کب چچا جان دوبارہ رشتے کی بات چھٹیں کیونکہ چچا جان نے کہا تھا کہ صوفیہ کا رشتہ

طے ہو جائے تو سیلمان بھائی کے لئے بھی کچھ سوچا جائے۔ صوفیہ کا رشتہ تقریباً طے ہی

ہو چکا تھا لیکن چچا جان نے پھر بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

ایک طرف چچا جان کی طویل خاموشی تھی اور دوسری طرف سیلمان بھائی کے

انداز بدل گئے تھے۔ بنفشہ کے خیالات پریشان ہو گئے وہ سارا دن خاموش خاموش سی

اپنے آپ کو کاموں میں مصروف رکھنے کی کوشش کرتی لیکن اس کا دل جیسے ایک بھاری

اچھٹلے دب کر رہ گیا تھا۔

پھر — ایک شام — جب سیلمان بھائی کافی دنوں کے بعد گھر آئے

تو درختوں کے سائے حویل ہو چکے تھے۔ بنفشہ ڈوبتے سورج کی سیلی پیلی دھوپ میں
نہائی بڑھیا کے کمرے کے سامنے والے کورڈور میں کھڑی تھی۔
سیلان بھائی نے اس کے قریب رک کر چند رسمی سی باتیں کیں اور اندر چلے
بنفشہ کے سینے میں جیسے کوئی چیز ٹوٹ کر کھڑکی سے اس نے پلکیں بھیچ کر انکھوں
اندھرتے ہوئے آنسوؤں کو پی لیا اور لان میں چلی گئی۔

سیلان بھائی اندر بھی بہت زیادہ دیر نہیں رکے۔ جب وہ دوبارہ باہر آئے
تو بنفشہ کو لان میں کھڑا دیکھ کر کسی سوچ میں پڑ گئے۔ پھر چند لمحوں بعد ان کے قدم
کی طرف اٹھ گئے۔

اکیلی کیوں کھڑی ہو؟

انہوں نے اس کے قریب رک کر پوچھا۔

بنفشہ ان کے اس بے تکے سوال پر دل ہی دل میں منہی۔

کیا بات ہے؟ بڑی چپ چاپ ہو۔

سیلان بھائی نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

بنفشہ خاموش رہی۔

اچھا ابھی! تم تو بات ہی نہیں کرنا چاہتیں، پھر ہم چلتے ہیں۔

بہت جلدی ہے آپ کو جانے کی۔

ہاں۔ کچھ کام ہے۔

بڑے مصروف رہنے لگے ہیں آپ۔

ہوں۔ آج کل کام بہت بڑھ گیا ہے۔

سیلان بھائی کچھ جھینپ کر بوئے۔

اچھا پھر جائیے۔

بنفشہ نے دبی ہوئی سانس لی۔

خدا حافظ۔

سیلان بھائی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ گاڑی کیسٹ اس سے باہر نکل گئی تو بنفشہ

نے شہنشاہیوں سے دور جاتی ہوئی گاڑی کی طرف دیکھا اور بوجھل قدموں سے

بے کمرے میں آگئی۔

رات — اس کے پریشان خیالات سے اتنا سا باک وہ گھر کر

پنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی راسخہ والے بستر پر شتو بے خبر سو رہی تھی۔ بنفشہ پر نے

دہچے میں ٹکڑے کھڑی ہو گئی۔ کچھ دیر یونہی کھڑی اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتی

ہی پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

کتنی اواس رات ہے؟

اس نے بآواز کی میٹر جیوں کے قریب کھڑے ہو کر سوچا۔

یہ جیسے کیا ہو گیا ہے؟ میرے یہ انداز تو کبھی نہ تھے۔

اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

مذرات کی رانی اور چنبیلی کی خوشبوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹے اس کے

زرب سے کزری قوس کا دل دکھ کر رہ گیا۔ اس نے جیگئی آنکھوں سے نیلگوں آسمان

کو آستین پر اڑتے ہوئے بادلوں کے سفید گڑوں کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے بڑھتی

سکرت سے ان کے کھانسنے کی آواز آئی تو وہ سم گئی۔ مگر دن گھا کر اس نے

ابھی تک؟
 بڑھتی فکر مند ہوئے۔ وادی اماں اور اماں بیگم کو بھی تشویش ہوئی۔

اس کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟

اماں بیگم نے پوچھا۔

معلوم نہیں۔

بچو نے لٹو مار دیا۔

تو کبھی بات ہوئی تھی۔

اماں بیگم نے پوچھا۔

معاذ اللہ، تو اس کے ساتھ رہا کہ سے اور چہرہ بھی کچھ کچھ نہیں ملازم۔

وادی اماں بولیں۔

ایک کمرے میں رہنے سے کیا ہوتا ہے؟ وہ اپنے کمرے میں منہ دفن کرتی

تھا میں اپنے ہاتھوں میں۔

بچو نے اندر اچھینتے ہوئے کہا۔

وادی اماں سے جب اکہن حیر ہو سکتا تھا۔ ذرا سا سنتے چھوڑ کر لے کر کھڑی ہو جی

اللہ پناہ وارہ سنبھا لوتے ہوئی ہفتہ کے کمرے کی طرف چل دیں۔ چھوٹی دیر بعد جب

انہوں نے اکہن یہ بتایا کہ راستہ دیر سے سوئی تھی اس لئے نیند پوری نہیں ہوئی تو بڑھتی

لے دل کو اٹھینا ہوا۔ ورنہ وہ تو بیویچ کر فکر مند تھے کہ کہیں اس کی طبیعت نہ خراب

ہو۔ لیکن بجائی کے بدلتے ہوئے انداز ان کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھے۔

انہوں نے بچو سے پوچھا۔

سود ہی ہیں۔

بڑھتی کے کمرے کی طرف ڈری ڈری نگاہوں سے دیکھا اور ذرا سا سرکہ کہ ملوں گا
 آڑ میں ہو گئی دادا جان کے کمرے کی سامنے والی دیوار پر چپا کی سوکھی ہوئی نشانوں کا
 سایہ پڑ رہا تھا، چاند با دام کے درخت سے بہت اوپر کافی بلند ی پر چمک رہا تھا
 چاندنی کا دم ہم ساغبانہ زمین پر بہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ درختوں میں سرسراہٹیں تھیں
 اور سرگوشیاں نیم کے گھنے درخت کی پتیاں بہت دھیرے دھیرے سرسراہٹیں تھیں
 اور باہر سڑک پر جلتے ہوئے بلوں کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اتنی خاموشی
 تھی اور اتنا سا نا اگہ ہفتہ کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

اس نے سوچا۔

میں یہاں کیوں کھڑی ہوں؟ اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا سمجھے گا؟

لیکن اندر جا کر بھی کیا کروں؟ نیند بھی تو نہیں آتی۔

اس کا دل کمرے میں جانے کو بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔

لیکن وہ اپنے دل کے چاہنے یا نہ چاہنے کی پرواہ کے بغیر کمرے میں

آگئی اور بستر پر بیٹھ کر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

دوسرے روز انوار تھا۔ رات کو دینک جاگنے کی وجہ سے صبح ہفتہ کی آگ

جلدی نہ کھل سکی۔ بچو نے اسے دھوئیں آوازیں دیں لیکن وہ بے سدھ پڑی سو رہی

تھی۔ ناشتے کی میز پر اس کی غیر موجودگی کو سب سے پہلے بڑھتی نے محسوس کیا۔

ہفتہ کہاں ہے؟

انہوں نے بچو سے پوچھا۔

سود ہی ہیں۔

پاس بیٹھے ملک کے سیاسی حالات پر تبصرہ کرتے رہے پھر اخبار اٹھا کر اپنے
 ہیں آگے اخبار پڑھتے ہوئے انہیں ایک دم بغفشتہ کا خیال آگیا۔ انہوں نے
 دست دپار کی طرف دیکھتے ہوئے بغفشتہ کو اپنے کمرے میں بلوانے کا فیصلہ کر
 اپنے کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ان کی نگاہ بن میاں پر پڑی انہوں نے
 یاں کو آواز دے کہ بغفشتہ کو بلانے کے لئے کہنا اور اپنے کمرے میں آکر گرٹ
 پلٹ تلاش کرنے لگے بن میاں نے اگر اطلاع دی کہ بغفشتہ باجی منسل کر رہی
 اچھا کہہ کر بڑ بھتیانے ایک طویل سانس لی اور اخبار لے کر صوفے پر نیم دراز

کے متعلق یہ خبر اڑتی اڑتی ان تک بھی پہنچی تھی کہ آج کل وہ کلب کی ایک نئی لڑکائی
 میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں وہ نئی لڑکائی نیلا رستم تھی۔ سیٹھ رستم کی حسین ذمیل اللہ
 اڈلی بیٹی۔ جو ہر روز پیش قبیت اور نت نئے ڈیزائن کے لباسوں میں کلب
 آتی تھی اور اس کی شاہین سلیمان بھائی کے ساتھ گزرتی تھیں خبر پہنچانے والوں نے
 یہ بات بہت زور دے کر بتائی تھی کہ ابتدا نیلا رستم کی طرف سے ہوئی تھی۔ سلیمان
 بھائی نے کافی عرصے تک اسے بالکل لفٹ نہیں دی تھی لیکن نیلا کے پاس ایک
 تو حسن بے پناہ تھا دوسرے اس کے پاس نیکھی اداؤں کا سفر ناک جال بھی موجود تھا
 پھر سلیمان بھائی کو بچا اسنے میں کیا دیر لگتی؟ اور پھر سلیمان بھائی تو میدان حسن و عشق کے
 پرانے کھنڈر ہی تھے وہ تو محض کچھ عرصے کے لئے ان کے قدم سیدھی راہوں کی طرف
 ہٹ کر گئے تھے۔ رفقہ کا سادہ حسن نیلا کے چکا چونڈ کر دینے والے حسن کا مقابلہ
 کہاں کر سکتا تھا۔

بڑ بھتیانے کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ بغفشتہ کتنی حساس طبیعت کی مالک ہے سلیمان
 بھائی کے دن بدن بدلتے ہوئے رویے نے اس کے دل کو متاثر نہیں کیا ہوگا
 وہ یہ سوچ کر پریشان تھے۔ ان دنوں ان کی اپنی الجھنیں، پریشانیوں اور مردانہ
 اتنی زیادہ تھیں کہ وہ باوجود کوشش کے بغفشتہ سے بات کرنے کا وقت ہی نہیں
 نکال سکے تھے صبح و عصری چلے جاتے تھے اور رات کو اکثر اتنی دیر سے آتے تھے
 کہ بغفشتہ سو چکی ہوتی تھی۔

ناشتے کے بعد بڑ بھتیانے کچھ دیر اپنی اتنی کے پاس بیٹھے ان تصویروں اور خط و
 تبصرہ کرتے رہے جو ان کی بہن نے لندن سے بھجوائی تھیں۔ گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ ڈیرہ

نے کہے تو دادی اماں نے صاف صاف بات کی۔

سیلمان اور بنفشہ کی شادی کب تک کرنے کا ارادہ ہے؟
پہلے تو چچی جان کے چہرے کا رنگ بدلا پھر فوراً ہی اپنے آپ کو سنبھالتے ہو بولیں۔
ابھی تو سیلمان کا کوئی ارادہ ہی نہیں معلوم ہوتا۔
آخر کیوں؟ کوئی وجہ بھی ہو؟ دادی اماں بولیں۔
معلوم نہیں۔

چچی جان دبی زبان سے بولیں۔

اب تو غیر سے صوفیہ کا رشتہ بھی طے ہو گیا ہے۔

دادی اماں بولیں۔

چچی جان خاموش رہیں۔

کہاں تو اتنی جلدی تھی اور اب یہ عالم ہے کہ بالکل خاموشی اختیار کر رکھی ہے
دادی اماں نے کہا۔

بس، آجکل کے رٹکوں کا تو یہی ہے۔

چچی جان مسکرائیں۔

اب تو وہ کئی کئی دنوں تک صورت ہی نہیں دکھاتا۔

دادی اماں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

آجکل کام زیادہ ہے، معروف رہتا ہے۔

چچی ماں نے یہاں بنایا۔

ایسا کون سا کام ہو گیا کہ دس منٹ کے لئے صورت دکھانے نہیں آسکتا۔

نہ رشتہ سرشتیں کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ سیلمان بھائی کی مہر و نیتیں آجکل
مزدور ہیں۔ سیلمان بھائی اب وہ پہلے سے سیلمان بھائی نہیں رہے۔ یہ بات
بات کرنے کے بعد سمجھنے والے ڈھونڈ کر تے بیٹھے اور اس کے ساتھ سیر و تفریح کر کے
نئے دادی اماں اور اماں بیکم کی خوش بیدیں کہا کرتے تھے۔ دادی اماں کو
یہ معلوم ہو گئی تھی کہ سیلمان بھائی آجکل کسی اور لڑکی میں دلچسپی سے رہا
اس کے باوجود خاندان کی بزرگ ہونے کے طے انہوں نے اس بات کا
تک کہ اب کے چھوٹی بوس کے آنے پر وہ مزدور سیلمان اور بنفشہ کی شادی
جیتے رہیں گی۔

اور ہوا بھی یہی۔ ایک اتوار کو جب چچی جان اور چھوٹے چچا دادی

چچی جان اس بات کا بھلا کیا جواب دیتیں!
نظر میں جھکائے خاموش بیٹھی رہیں۔

تم اس سے بات کر کے صاف صاف بتاؤ، اگر اس کی مرضی نہیں ہے تو کم
لڑکی کا رشتہ کہیں ملے کر دیں۔

دادی اماں نے کہا۔

اچھا۔ میں اس سے بات کروں گی۔

چچی جان بولیں اور دل میں سوچا۔

سیمان سے بات کرنا یا نہ کرنا برابر ہے، اس کا جواب مجھے اچھی طرح معلوم ہے
اہم بات تو یہ ہے کہ یہ جواب امی جان تک کس منہ سے پہنچاؤں گی؟ خیر اللہ
مالک ہے۔

انہوں نے اپنے دل کو تسلی دی۔

اس بات چیت کے تقریباً ایک ہفتے بعد چچی جان نے بڑی ہمت کر کے دادی
اماں کو بتا دیا کہ سیمان یہاں شادی کرنے کے لئے راضی نہیں۔

دادی جان نے خشکیوں نگاہوں سے اپنی بہو کی طرف دیکھا اور بولیں۔

نہیں راضی ہے تو نہ سہی۔ ہفتہ کے لئے رشتوں کی کمی نہیں ہے لیکن.....

دادی اماں ایک لمحے کے لئے رکھیں چچی جان نے ان کی طرف استغما میر نظر دل
سے دیکھا۔

یہ کوئی اچھے لچھن نہیں ہیں۔

دادی اماں نے اپنا جملہ مکمل کر تے ہوئے اماں بیگم کی طرف ایسی نگاہوں سے

بایسے پوچھ رہی ہوں کیوں زلیخا! میں ٹھیک کموں ہوں نا!
اماں بیگم چچی بیٹھی رہیں۔

ٹھیک ہے، جہاں اس لڑکے کا دل چاہے شادی کرے، کوئی ذمہ داری تو
ہے نہیں۔

دادی اماں۔ چچی جان سے کہہ کر اپنے پانڈان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

سیمان بھائی کے انکار کی خبر گھر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شجورانی نے اپنے
ٹاٹے سے دانتوں کو پیس پیس کر سیمان بھائی کو خوب ہلا بھلا کہا، دادا جان گرجے برے

اپنے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی موٹی سی کتاب کو ایک طرف رکھتے ہوئے
بائے غصے کے عالم میں پھوٹے چچا اور سیمان کی خبر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ سجاد بھائی نے

بہت پردوں ہاتھ باندھ کر برآمدے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹہلتے
رہے جانے کیا کچھ سوچ ڈالا اور بڑھتیانے اپنے کمرے کے درپے میں کھڑے ہو کر

بڑے کے منقلب سوچتے ہوئے دو تین سگریٹ پھونک ڈالے۔ بڑی اماں اور پھوٹی چچی
بوجھ کر پریشان بیٹھی تھیں کہ اب ہفتہ کا کیا بنے گا؟ وہ تو ویسے ہی اس قدر حساس

اس کے دل پر کیا بیتے گی؟ وہ تو کسی سے کچھ کستی سنتی بھی نہیں کہ اسی طرح دل
تھوڑا مو جہاں ہے۔

لیکن بات کوئی چھپنے والی تو بنتی نہیں ہفتہ سے بھی آخر کب تک چھپی رہتی جانے
ہے؟ ہائے کس حزن؟ اس کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ گئی کہ سیمان بھائی اب اس

بے باخ شادی کرنے پر رضامند نہیں ہیں۔ ہفتہ کو زندگی میں پہلی بار اپنے دل پر بڑی
بے بسی چوٹ کا احساس ہوا اور بڑے انوکھے درو کا احساس ہوا۔ داغ پر ہتھوڑے سے

برہمنے لگے لیکن اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ بڑی خاموشی سے اپنے آپ کو بالکل بالکل
 قسم کے کاموں میں مصروف کر دیا۔ جب وہ بیکار قسم کے کام بھی ختم ہو گئے۔ تو ٹیکسوں پر
 منہ چھپا کر لیٹ گئی۔ شام آئی اور آکر ڈھلنے بھی لگی، درختوں کے سائے طویل ہو گئے
 سورج کی کرنیں مدہم مدہم گئیں۔ درہمبار دھوپ مکانوں کے آخری سروں کو چھوتے چھوتا
 غائب ہو گئی، آسمان لالہ گوں ہو گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد سڑکوں پر لگے ہوئے بلب ہل
 اٹھے لیکن نقشہ نے کدو تک نہ بدلی۔ شجورانی تو اسے اس طرح بیٹھے دیکھ کر کہتی
 گئی تھیں کہ اسے اٹھانے کی ہمت بھی اپنے میں نہ پاسکیں۔ شام کی چائے کے دن
 جب ”بنفشہ“ ”بنفشہ“ کی پکار بلند ہوئی اور دادی اماں نے اپنا غرارہ سنبھال کر کونڈ
 کے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کیا تو شجورانی جانے کیا سوچ کر جھوٹ بول دیں۔
 رہنے دیجئے دادی اماں! وہ چائے پی چکی ہیں۔

اے کب پی چکی؟

دادی اماں نے جبران ہو کر پوچھا۔

ابھی پندرہ منٹ پہلے ہی پی ہے، میں نے بنا کر دی تھی۔

شجورنے دوسرا جھوٹ بولا۔

کیا حرج ہے؟ اس وقت اور پی لے گی۔

دادی اماں نے پھر جانے کے لئے پرتو لے۔

ان کے سر پر دودھ تھا، وہ چائے پی کر سو گئی ہیں۔

اپنے جھوٹ کو نبھانے کے لئے شجورنے ایک اور جھوٹ بولا۔

یہ سن کر کہ بنفشہ ذرا ہی دیر پہلے سوئی ہے۔ دادی اماں نے اسے اٹھانے

توئی کر دیا لیکن مغرب کی نماز کے بعد دادی اماں کو پھر تشویش ہوئی۔ کیا وجہ ہے؟
 ابھی تک نہیں اٹھی، کہیں شجورنے اسے سیما کے انکار کے بارے میں نہ بتا دیا
 جو کہ بلا کر پوچھا۔ تو شجورنے صاف انکار کر دیا اور بولی۔
 انوں نے خود ہی سن لیا۔

کیسے سن لیا؟

دادی اماں کے چہرے کی بھڑیاں اور گہری ہو گئیں۔

”پر کر بڑی اماں اور اماں بیگم باتیں کر رہی تھیں۔ تو بنفشہ باجی نے ادھر سے
 تے ہوئے سن لیا۔

شجورنے آہستہ سے کہا۔

تجھے کیسے معلوم؟

دادی اماں نے جرح کی۔

میں اس وقت بیکارے میں بیٹھی ہوئی تھی، میں نے غصہ دیکھا وہ کھڑکی کے

اگل کمرے میں رہی تھیں۔

شجورنے کہا۔

یہ تو برا ہوا۔

دادی اماں فکر مند سی ہو کر اماں بیگم کے کمرے کی طرف چل دیں۔

شجور کے میں واپس آئی تو بنفشہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ دونوں ہاتھ گود میں رکھے چپ چاپ

گواہ بن کر گھوم رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا اور کچھ کہے

اٹھ کر باغیچہ کی طرف چلی گئی۔ شجورانی ہولنق بنی کر سی پڑ بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر بعد

بنفشہ آئی تو شجوت نے بڑی ہمت کر کے چائے کے لئے پوچھا۔

اگر بنی ہوئی ہو تو لا دو۔

بنفشہ کی آواز بہت نرم تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب شجوت رانی چائے لے کر آئیں تو بنفشہ نے چائے کی پال

تھامتے ہوئے کہا۔

تم نے بھی مجھے یہ بات نہیں بتائی شجوت!

کون سی بات؟

شجوت نے انجان بن کر پوچھا لیکن دل سینے میں بڑی زور سے دھڑک اٹھا تھا۔

کہ سیلان بھائی نے.....

بنفشہ نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

میری ہمت ہی نہیں پڑی۔

شجوت نے کہا۔

یہ بات کہنے کے لئے ہمت کی کیا ضرورت تھی؟

بنفشہ نے کہا۔

شجوت چور بنی کھڑی رہی۔

بنفشہ کو شجوت کا یہ روپ دیکھ کر دکھ بھی ہوا اور حیرت بھی۔

اس نے تو شجوت کو کبھی بھی اس قدر سہا ہوا نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے اوپر کوا

عصہ آیا۔

یہ ایک اور نئی پریشانی کھڑی کر دی جس نے سب کے لئے۔

اب اگر میں نے چپ شاہ کا روزہ رکھا تو یہ لوگ اور پریشان ہوں گے۔ مجھے

بالکینیت کو کسی پرچار ہر ہی نہیں کہنا چاہیے اگرچہ یہ کام آسان نہیں لیکن اسکے

ادرو کوئی چارہ بھی نہیں۔

بنفشہ نے سوچا اور چائے پیئے لگی۔

چائے پی کر وہ شجوت کے ساتھ باہر لان میں نکل گئی۔

رات کو کھانے کے وقت باوجود اس کے کہ اسے ہر شخص کی نگاہیں اپنے چہرے

پر اٹھی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اس نے اپنے آپ کو نارمل رکھا۔

جان بھائی اس کی رگ جاں کے قریب تھے۔ اس نے جاگتی آنکھوں سے اپنے اور
 جان بھائی کے مستقبل کے بارے میں بہت سے خواب دیکھ ڈالے۔ قنوطیت پسند
 نے کہا وجود مستقبل کے کسی برے لمحے کے بارے میں اس نے کبھی نہیں سوچا تھا جانے
 دل؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی لیکن — اگلے لمحے کی خبر کسے ہوتی ہے؟ کوئی
 جاننا، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ زندگی میں اب جو دوسرا لمحہ آئے گا وہ اپنے دامن
 خوشیاں سمیٹ کر لائے گا یا غم؟ غنظر آنکھوں میں آنسوؤں کے چراغ جلائے گا یا
 بے لیں پر مسکراہٹوں کی کمرہ میں بکھیرے گا؟ غموں اور آنسوؤں کی تینا تو کوئی بھی
 نہ کہتا لیکن تقدیر کا پتھی ہواؤں کے دوش پہ اڑتے اڑتے انسان کے پھیلے ہوئے
 نایں جو کچھ بھی ڈال دے اسے سمیٹنا ہی پڑتا ہے۔ دامن میں گرسے ہوئے آنسوؤں
 ، تاروں کو دھرتی کا بوجھ بنا کر پھینک دینا انسان کے بس کی بات نہیں اور
 نزل کی آگ کے شعلوں سے اپنے وجود کو بچا لینا اپنے اختیار کی بات ہے۔ پھر
 نہ کیسے اپنا آپ بچا کر اس آگ سے دور بیٹ جاتی؟ وہ تو ایک بہت کمزور
 بزدل سی لڑکی تھی۔ وقت کے ان لمحوں کو اس نے اپنی زندگی کا ایک جزو سمجھ کر
 دل کر لیا۔ اس نے سوچا تو یہ تھا کہ دل پر یہ جو ایک بوجھ سا آگرا ہے اس کی خبر
 کو کبھی نہ ہونے دوں گی۔ بسنے میں یہ جو ایک آگ سی بھڑک اٹھی ہے اس کے شعلوں
 کی لگی لگا ہیں نہ پڑنے دوں گی لیکن شعلے جب بھڑکتے ہیں تو زمین سے آسمان تک
 روشنی ہی روشنی ہو جاتی ہے اور روشنی پر کس کی لگا ہیں نہیں پڑتیں؟ آگ لگتی ہے۔
 ہواں بھی اٹھتا ہے اور دھوئیں کے پھول کسے نظر نہیں آتے؟ جو پڑ پڑتی ہے تو
 زم بھی لگتا ہے، زخم سے ٹیسس اٹھتی ہیں تو آنکھوں میں پانی آ ہی جایا کرتا ہے ضبط

دو تین دن اسی کیفیت میں گزر گئے۔ یونیورسٹی جاتی تو وہاں دل نہ لگتا مگر
 ہوتی تو بیزار میرا سی رہتی۔ دل پر ہر لمحے ایک بھاری بوجھ سا محسوس ہوتا تھا اور دماغ بوجھ
 سوچتے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ نیند کا یہ عالم تھا کہ جیسے کبھی اس نے آنکھوں کا رخ کیا ہی
 نہیں تھا۔ زبردستی آنکھیں بند کئے بیٹے رہتی کسی وقت بھولے جیسے آنکھ لگ بھی جاتی
 تو ذرا ہی دیر بعد وہ چونک کر اُٹھ بیٹھتی۔ وہ اپنی اس حالت پر خود بھی حیران تھی بلکہ
 بھائی نے اس کی چاہت تھی نہ محبت! اس نے تو مہینوں کی کاوشوں کے بعد اپنے دل
 دماغ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ سیلان بھائی کو اپنی آئندہ زندگی کے ہمسفر کی
 حیثیت سے قبول کرے۔ دل و دماغ نے اس سمجھوتے کے سلسلے میں سر جھکا دیا تو زندگی
 میں ایک ٹھٹھا سا آگیا۔ لمحے گزر کر تھپے دھند کون میں گم ہوئے تو نیشنلہ کو اس کا

کرنے کی کوشش کون نہیں کرتا؟ لیکن زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آجاتا ہے جب ہر
منبط کا یا رانہیں رہتا۔ بغض نے بھی صبر و ضبط کی ہر کوشش کر ڈالی لیکن جب دل
سے آنکھوں تک طوفان ہی طوفان ہو تو ہمت خود بخود جواب دے جاتی ہے۔

جب وہ دل و دماغ کو سمجھا سمجھا کر تنہا گئی تو اس نے اپنے آپ کو اپنے
والے لمحوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا۔ تین روز اسی بے کلی ادبِ چینی میں گزر گئے
چوتھے روز یونیورسٹی سے آکر کھانا کھاتے ہی بستر پہ پڑ گئی۔ جانے کیسے؟ جلد تک
اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ اتنی گہری نیند سوئی کہ اسے دین و دنیا کی خبر نہ رہی۔
یہ تین راتوں تک جاگنے کا اثر مختار شام کو ایک دفعہ شجوت نے اسے جگانے کی کوشش
کی۔ دوسری چھٹ باجی آکر بھینچوڑ گئیں۔ مگر وہ کدوٹ بدل کر پھر سو گئی۔ پھر وادی امان
نے آکر اٹھانے کی کوشش کی بغض نے ذرا سی آنکھیں کھول کر وادی امان کی طرف
دیکھا اندر یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کر لیں۔

ابھی میری نیند پوری نہیں ہوئی وادی امان! ابھی میں اور سوؤں گی۔

مغرب کی آذان کے وقت امان بیگم کے پکارنے پر وہ بڑی مشکل سے ادب
نخواستہ ہی اٹھی۔

شام کو بھر پور نیند لینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات کو پھر اس کی آنکھیں بے خواب ہو کر
رات کو کھانا کھانے کے بعد وہ ٹیکسیل بھیا کے چور کر کے پران لوگوں کے ساتھ ان
کھیلنے بیٹھ گئی کھیلنے کے معاملے میں وہ ہمیشہ سے ہی انارٹی رہی تھی۔ شجوت اس کی بار
تھی۔ تاش کھیلنے میں اسے مہارت بھی حاصل تھی۔ لیکن وہ کہاں تک کھیل کو سنبھال پاتی
کی غلط سلط چالوں کی وجہ سے وہ دونوں مسلسل ہارتی رہیں۔ شجوت نے بور ہو کر پتے پھینکا

بے ادب تک شیف میں سے گوسٹے کی ٹاؤسٹ نکال کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔
ٹاؤسٹ باجی ریکارڈ سننے لگیں۔ ٹیکسیل بھیا بھی سگریٹ سگاتے ہوئے باہر چلے گئے، بغض
کاٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور ٹاؤسٹ کی کاپی کھول کر زبردستی پڑھنے کی کوشش کرنے
پڑی مشکل سے ہی بغض کا دل پڑھنے میں لگا۔ شجوت تو "ٹاؤسٹ" کا مطالعہ کرتے
رہے ہی سو گئی۔ کچھ دیر بعد بغض نے بھی کاپی بند کر کے بے دلی سے ایک طرف
راہی اور اٹھ کر درپچھے میں کھڑی ہو گئی۔ سب کے کمروں کی روشنیاں گل ہو گئیں تھیں۔
ابھی بتی بجھا کر اپنے بستر پہ لیٹ گئی۔ بڑی دیر تک کدوٹ بدل بدل کر سونے کی
کوشش کرتی رہی مگر سونے کا کیا سوال تھا؟ ایک تو ویسے ہی ان دنوں اسے
دل کو بے خوابی کی شکایت تھی اور آج تو سونے پر سما گئے یہ ہوا تھا کہ وہ دن میں خوب
سوتی تھی۔ جب آنکھیں میچ کر بھی سونے کی کوششوں میں ناکام رہی تو بھینچا کر بستر
پر اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ چند لمحوں تک سوئی ہوئی شجوتانی کی طرف رشک بھری نگاہوں
سے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ براہِ کمرے میں آکر اسے ہتہ چلا کہ
انفاس اس کا خیال تھا کہ سب سو چکے ہیں۔ ٹیکسیل بھیا کے کمرے میں اب تک روشنی ہو
رہی تھی۔ چھٹ، باجی کے کمرے کی بتی بھی جل رہی تھی۔ بڑی امان کے کمرے کی نہ صرف
بتی جل رہی تھی بلکہ وہ اپنے کمرے کے سامنے والے برائے کی ریٹنگ کے قریب
کھڑی سڑک کی طرف، دیکھ رہی تھی۔ ان بے چاریوں کو بڑھ بھیا کے سوا اور کس کا انتظار
رہتا تھا؟ بڑھ بھیا ادھر چند دنوں سے پھر بڑی دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ بڑی امان کو
دیکھ کر بغض گھبرا گئی کہ اب وہ سوال جواب شروع کر دے گی۔ نیند نہ آنے کا سبب پوچھیں
اس نے سوچا وہ اندر واپس چلی جائے لیکن اب وہ اندر جانے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔

بڑی اماں کی نگاہ اس پر پڑ چکی تھی۔ بنفشہ ابھی اسی شش و پنج میں تھی کہ کمرے میں واپس جاسے یا باہر ہی کھڑی رہے کہ بڑی اماں نے اسے آواز دی۔
بنفشہ!

جی۔ بڑی اماں!

بنفشہ نے گردن اٹھا کر اوپر دیکھا کیونکہ بڑی اماں اوپر والی منزل پر تھیں۔

تم سوئیں نہیں ابھی نیک؟

بڑی اماں نے پوچھا۔

تیند نہیں آ رہی مجھے۔

بنفشہ نے کہا اور اس خیال سے کہ بڑی اماں کہیں مزید سوالات نہ شروع کر دیں۔
اس نے خود ہی بڑی اماں سے سوال کر دیا۔

تغیب بھائی ابھی تک نہیں آئے؟

ابھی کہاں آیا؟ اسی کے انتظار میں تو کھڑی ہوں۔

بڑی اماں کی آواز میں جھنجھلاہٹ اور پریشان تھی۔

اسی وقت باہر ٹیکسی رکنے کی آواز آئی۔ بنفشہ کی نگاہیں گیٹ کی طرف اٹھ گئیں۔

چند لمحوں بعد بڑھیا گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے نظر آئے بڑھیا کو دیکھتے ہی

بڑی اماں بھی اپنے بھاری بھر کم جسم کو سنبھالتی ہوئی زینے سے نیچے اترنے لگیں بڑھیا

بنفشہ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔

تم ابھی نیک نہیں سوئیں؟

بڑھیا نے پوچھا۔

نہیں۔

بنفشہ نے دھیرے سے کہا۔

کیوں؟

تیند نہیں آ رہی۔

ابکل تمہیں بے خوابی کی شکایت کیوں ہو گئی ہے؟

اے؟ نہیں تو؟

بنفشہ نے گہرائی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

اسی وقت بڑی اماں وہاں پہنچ گئیں۔ دو چار سوالوں میں بڑھیا کی اچھی طرح گوش

رکنے کے بعد بنفشہ کو ان کے لئے کھانا لانے کا حکم دے کر بڑھیا کے ساتھ کمرے

داخل ہو گئیں بنفشہ کی عدم موجودگی میں انہوں نے بڑھیا کو اور دو چار باتیں سنا کہ

بال کی بھڑاس نکالی۔ بنفشہ جب کھانا لے کر آئی تو بڑی اماں کمرے سے باہر نکل

گئیں۔

بیٹی اگر تمہاری کچھ سنتا ہوں تو تم ہی سمجھاؤ۔

بڑی اماں نے بنفشہ سے کہا اور بنفشہ کا جواب سے بغیر آگے بڑھ گئیں۔

بنفشہ کمرے میں داخل ہوئی تو بڑھیا صوفے کی پشت سے سڑکائے بڑی گہری

ذہن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بنفشہ نے کھانا ان کے سامنے رکھا تو بھی وہ اسی طرح

بٹ رہے۔ بس ایک بار خوابیدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

کیا بات ہے تغیب بھائی؟

بنفشہ نے پوچھا۔

نہالہ روکھ سے وہ واقف تھے۔ بنفشہ کا دل چاہا۔ وہ بڑھتیا کے دونوں مضبوط
دایں اپنا چہرہ چھپا کر اتنا روئے کہ دل کا سا رادرو آنسوؤں کی راہ بہہ جائے۔

تم نے اس نالائق کی بدتمیزی کا بہت اثر لیا ہے؟

برہتیا نے اس کے سر کو شفقت سے پھینچتے ہوئے پوچھا۔

بنفشہ کے لئے یہ ایک جملہ ہی کافی تھا۔ سینے کی گراہیوں میں سوئے ہوئے طوفان

ٹپے کر جاگ اٹھے۔ لہروں میں پھلجلی اودھ سرکش انداز میں آگے بڑھیں۔ اور

کچھ اور آگے۔ اور پھر وہ آنکھوں کے ساحل کو بھی پار کر گئیں۔ آنسوؤں کا

امندر سا تاجو امند اچلا آتا تھا۔ بنفشہ کے آنسو دیکھ کر بڑھتیا اپنی بھوک پیاس

بھول گئے انہوں نے پریشان اور افسردہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا، کچھ

کے لئے لبوں کو جنبش دی لیکن پھر جانے کیا کہتے کہنے رک گئے۔ چند لمحوں کے

لے لکوت رہا۔ بنفشہ آنسوؤں کی رم جھم میں بھیگتی رہی اور بڑھتیا اس کے چہرے

پر ہلنے لگی سوچوں میں ڈوبے رہے۔ پھر بنفشہ کو جانے کیا سوچھی وہ ایک دم

راہ سے باہر جانے لگی۔

واپس آؤ بنفشہ!

بڑھتیا نے اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہا۔

بنفشہ کے بڑھتے قدم رک ضرور گئے لیکن وہ واپس نہیں پلٹی۔ بڑھتیا نے چند لمحوں

کے پلٹ آنے کا انتظار کیا۔ لیکن جب بنفشہ وہیں کھڑی ایستے ہاتھوں میں چہرہ

اگلانے لگی تو بڑھتیا ایک طویل اور گہری سانس لے کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے

ہوں! کچھ نہیں۔

بڑھتیا سنبھل کر بیٹھ گئے۔

کیا سوچ رہے تھے آپ؟

بنفشہ میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر آگے کی طرف جھک گئی۔

تمہارے متعلق سوچ رہا تھا۔

بڑھتیا مسکرائے۔

میرے متعلق؟

بنفشہ نے گھیر کر نظر میں جھکا لیں۔

ہاں! تمہارا چہرہ اتنا ندر کیوں ہو رہا ہے؟

بڑھتیا اس کے چہرے کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔

نہیں تو۔ آپ کو وہم ہو گیا ہے۔

بنفشہ کی نیچی نگاہیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔

اگر یہ میرا وہم ہے تو پھر تم مجھ سے نظریں ملا کر بات کیوں نہیں کرتے ہیں؟

بڑھتیا نے بے حد سفیدگی سے کہا۔

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی پلکوں کی چلنیوں کا پتہ

رہیں۔ سچ تو یہ تھا کہ بڑھتیا کے پاس آتے ہی اس کا دل بھرا یا تھا خود اس کا دل

رہا تھا کہ بڑھتیا اس سے اس کی اداسی کا سبب پوچھیں۔ حالانکہ اسے یہ بات

طرح معلوم تھی کہ بڑھتیا کے پوچھنے یا نہ پوچھنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اس قدر بے نیاز رہنے کے باوجود بنفشہ کے متعلق انہیں ہر بات کا علم تھا۔ اس کا

کچھ پاگل ہو گئی ہو؟

وہ اس کے قریب رک کر پیار سے بولے۔

بنفشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

چہرے پر سے ہاتھ ہٹاؤ۔

بڑ بھتیجا کا انداز حکمانہ تھا۔

بنفشہ اسی طرح کھڑی رہی۔

بڑ بھتیجا نے اگلے لمحوں کا انتظار کئے بغیر بڑی آہستگی سے اس کی دونوں تھپا

تھام کر چہرے سے الگ کر دیں اور اس کے رخساروں پر چمکتے ہوئے شبنم کے

نظروں کو انگلیوں میں جذب کریتے ہوئے دکھ سے مسکرائے۔

چلو، بیٹھو۔

بڑ بھتیجا نے کہا۔

بنفشہ نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔

احق لڑکی۔

انہوں نے آہستہ سے کہا۔

بنفشہ نے شبنمی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا۔

اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ میں نے کوئی غلط بات تو نہیں کہی۔

بڑ بھتیجا کے خوبصورت ہونٹوں پر کبھری ہوئی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

بنفشہ کی آنکھوں میں پھر آنسو اُمٹ اُٹے۔

بھئی، اگر اس بیوقوف آدمی نے انکار کر دیا تو اس میں رونے کی کیا بات

بڑ بھتیجا نے کہا۔

بچے تو بہت پہلے ہی اس بات کا یقین تھا اس بد تمیز کو تمہاری قدر کیا معلوم؟

ان کے ساتھ رہ کر تو تمہاری زندگی برباد ہی ہونی تھی۔

بڑ بھتیجا کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

تمہیں تو سیماں سے محبت بھی نہیں تھی۔ پھر تمہیں اس کے انکار پر انشاد کھ کھول ہوا

بڑ بھتیجا نے پوچھا۔

بنفشہ نے سوچا وہ بڑ بھتیجا کی اس بات کا کیا جواب دے؟

تمہارے اندر کس بات کی کمی ہے؟ پھر تمہیں اس قدر پریشان ہونے کی کیا

زبردستی ہے؟

بڑ بھتیجا نے کہا۔

اور بنفشہ آنکھوں میں آنسو لئے بڑ بھتیجا کے جھلے پر غور کرتی رہ گئی۔

اب ایک آنسو نہ نکلے تمہاری آنکھ سے ورنہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔

بڑ بھتیجا زیر لب مسکرائے۔

لیکن آنسو اس وقت بنفشہ کے اختیار میں کب تھے۔ وہ تو پھر بند توڑ کر

بہ نکلے۔

بہادر بن کر زندہ رہنا سیکھو بنفشہ! معلوم نہیں زندگی میں کب کتنے بڑے

لڑناں کا مقابلہ کرنا پڑ جائے؟

بڑ بھتیجا نے نصیحت آمیز لہجے میں کہا۔

بنفشہ خاموش کھڑی آنسو بہاتی رہی۔

خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے، یہ سوچ کر اپنے دل کو مطمئن رکھو۔
 بڑ بھتیانے اس کے آنچل کا ایک سراقہام کر اس کے آنسو پونچھے ہوئے کہا۔
 ہر شخص کے اپنے غم اور اپنی پریشانی ہوتی ہیں لیکن انہیں عام کرنا تو اچھی بات نہیں ہے۔

بڑ بھتیانے کے چہرے پر ایک کمرناک سایہ لرز کر رہ گیا۔ بے نشہ کی جھکی آنکھیں اڑ پڑ
 اٹھیں تو بڑ بھتیانے کے چہرے پر نرم کر رہ گئیں۔

کتنی درد اور کتنا سوز بھانک رہا تھا ان کی آنکھوں سے؟
 آپ کو۔ آپ کو بھی کوئی غم ہے شعیب بھائی؟

بے نشہ اپنا درد بھول کر پوچھ بیٹھی۔

کیوں؟ کیا میں انسان نہیں ہوں؟

بڑ بھتیانے مسکرائے۔

آپ کو کیا غم ہے؟

بے نشہ نے پوچھا۔

مجھے جناب کا غم کھائے جاتا ہے۔

بڑ بھتیانے شہ رخ ہو کر بولے۔

جی !!؟

بے نشہ نے حیرت زدہ ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

جس دن تم خوش رہنا سیکھ لو گی اس دن میرے غم بھی دور ہو جائیں گے۔

بڑ بھتیانے کے لبے میں بے پناہ محبت تھی۔

ایک بے نشہ کا ذہن تو اس وقت صرف اسی الجھن میں تھا کہ شعیب بھائی کو کیا غم ہے؟
 دیکھ، تمہیں تکلیف میں دیکھ کر میں کھانا پینا سب بھول جاتا ہوں۔
 بڑ بھتیانے پر رکھے ہوئے کھانے کی طرف دیکھ کر بولے۔
 بارہ بارہ گرم کر لاتی ہوں۔

بے نشہ نے کہا۔

گرم لای لانا۔

بڑ بھتیانے کہا۔

بے نشہ کھانے کی مڑے اٹھا کر باہر نکل گئی۔ چند منٹ بعد جب وہ لوٹ کر
 واپس آئی تو بڑ بھتیانے کے چہرے پر پھر وہی کیفیت دیکھی۔

لیکن اس وقت اس نے بڑ بھتیانے سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔

لانا میز پر رکھ کر وہ چپ چاپ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

اس سے شادی بھی کر لی۔ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی، سب کا
ادب شریک بھی ہوئے اور کیوں نہ ہوتے؟ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں
نہ داری تو ختم نہیں ہو جاتی۔ البتہ شجورانی نے شرکت نہیں کی۔ منقشہ نے
شرکت کرنے کا پکا ارادہ کیا تھا لیکن اس کے سارے ارادوں پر بڑھانے
دیا۔ انہوں نے اسے بڑی سختی سے شادی میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔
لہذا سارا دن شجور اور منقشہ کے ساتھ ساحل سمندر پر گزرا دیا۔

بلان بھائی کی شادی کا ہنگامہ بھی گزر گیا۔ منقشہ کی زندگی میں جیسے ایک ٹھہرو
تا اس نے اپنے آپ کو ہر وقت کی مصروفیتوں میں گم کر دیا۔ پڑھنے لکھنے میں
کبھی بھی زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔ لیکن اب اس نے بڑی بنجیدگی سے کتابوں
تاجر دینی شروع کر دی۔ یونیورسٹی سے واپس آکر کچھ دیر آرام کرنے کے
آگے آئے والے لمحے چھپے گزر جانے والے لمحوں کے احساسات کو دھندلا دینے

گزر تے ہوئے وقت کی اڑتی ہوئی گرد کی تھوں کے نیچے بیٹی باتیں اور بیٹی یادیں
کر رہ جاتی ہیں اور جب وقت گزر کر دیکھیں دھندلوں میں گم ہو جائے تو دیکھیں
شدت باقی رہتی ہے اور نہ تکلیف میں دل میں چاہے زخموں کے انبار لگے ہوں
یٹسوں میں خود بخود کمی آ جاتی ہے۔ ہمیشہ سے یونہی ہوتا چلا آیا ہے اور شاید۔
یونہی ہوتا رہے گا۔ سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر منقشہ بھی دنیا کے بار
سے کوئی مختلف تو نہیں تھی۔ لمحے آئے اور گزر گئے۔ اور پھیلی باتیں مرنے
اور ایک سایہ سا بن کر رہ گئیں۔

سیلان بھائی اس دفعہ سچ کلب کی تسلی نیلا کے بارے میں بنجیدہ ہو گئے۔

ہے، کبھی کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کا اور کبھی صرف کافی پینے کا۔

یہ سب کچھ تو ایک طرف تھا لیکن دوسری طرف شجورانی نے واضح طور پر بات محسوس کی تھی کہ بنفسہ کے لیے سجاد بھائی کی نگاہوں کے انداز بدلے ہوئے یہ بات محسوس تو چھٹ باجی نے بھی کی تھی۔ مگر کیونکہ شجورانی اس قسم کے تمام کاموں بازی لے جایا کرتی تھیں لہذا اس دفعہ بھی پہلا نمبران ہی کا تھا۔ ایمان کی بات تو تھی کہ دونوں ہی سجاد بھائی کا یہ انداز دیکھ کر خوشی سے چھوٹے نہیں سما رہے تھے لیکن زبان دونوں نے بند کر رکھی تھی۔

اور بنفسہ غریب اللہ میاں کی گاتے — اس کا دل و دماغ اتنی دور کوٹری کیسے لاسکتا تھا؟ اس کے توفرشوں کے بھی وہم و گمان میں یہ بات نہ کہ سجاد بھائی اس کے متعلق کسی اور انداز سے بھی سوچ سکتے ہیں۔ وہ تو اپنے خیالوں میں کھوتی ہوئی، جھٹکی ہوئی روح کی طرح منڈلایا کرتی تھی۔ سجاد بھائی کو موٹی خوبصورت آنکھیں اب لے کر اس انداز سے دیکھنے لگی تھیں؟ اس نے ہی نہیں کیا۔ لیکن جب شجور اوچھٹ باجی کے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹیں دن بدن طویل ہوتی گئیں اور ان کی نگاہوں میں دن بدن شرمناک گئی تو بنفسہ نے حیرت زدہ نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا ضرور لیکن اس کی تہہ نہ نک پھر بھی نہ پہنچ سکی۔

شجورانی — جو ہر معاملے میں بہت بے صبری کا مظاہرہ کیا کرتی تھیں اس موقع پر یہ بات کیسے برداشت کر سکتی تھیں کہ سجاد بھائی اتنے عرصے تک میں گھٹنیاں ڈالے بیٹھے رہیں۔ وہ جھنجھلا کر سوچیں کہ آخر سجاد بھائی اس

بھی نہ کبھی تو اگلیں گے۔ ابھی اگلے دینے میں کیا سوچ ہے؟ تنگ اگر ایک روز ان کے فیصلہ کر لیا کہ آج تو سجاد بھائی سے اس معاملے پر صاف صاف بات ہو جائی چاہیے۔ شام کی چائے پی کر جب سجاد بھائی اپنے کمرے میں گئے تو وہ ان کا پیچھا کرتی ہوئی وہیں پہنچ گئیں۔

سجاد بھائی شاید اس وقت کہیں جانے کے موڈ میں تھے۔ الماری کھولے پڑوں کا انتخاب کر رہے تھے۔ قدموں کی آہٹ پر انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ ہینا ڈلی دلا رہی بہن کو دیکھ کر ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا۔

کیا بات ہے رانی؟

انہوں نے انتہائی پیار سے پوچھا۔

آپ کہیں جا رہے ہیں؟

شجور نے اٹھا انہی سے سوال کر دیا۔

ہاں! کوئی کام ہے تمہیں؟

سجاد بھائی نے الماری بند کرتے ہوئے کہا۔

کام تو کوئی ایسا خاص نہیں۔

چلو عام ہی سہی۔ اب بتا بھی دو۔

سجاد بھائی مسکراتے۔

ایک بات پوچھنی تھی آپ سے۔

ضرور پوچھو، ایک نہیں دو پوچھو۔

ڈر لگتا ہے آپ کہیں ناراض نہ ہو جائیں۔

اے اب تجھے مجھ سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ناراض ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو تو میری ننھی مٹی سی گڑ یا ہے۔
 شجر کے لیے سجاد بھائی کے دل کی ساری محبت، ساری چاہت سمٹ کر آنکھوں میں آگئی۔ انہوں نے اس کی پیٹھ پیچھا پاتے ہوئے بڑے پیار سے اس کی طرف دیکھا۔

یہی تو شکل ہے سجاد بھائی! کہ آپ مجھے ننھی مٹی سی گڑ یا سمجھتے ہیں اور جوابات میں پوچھنا چاہتی ہوں وہ کافی بڑی ہے۔
 شجر نے سنجیدگی سے کہا۔

سجاد بھائی اس کی بات سن کر ہنس پڑے اور بولے۔
 چاہے جتنی بڑی بات بھی ہو تم ضرور پوچھو۔
 اچھا۔ اب آپ اجازت دے رہے ہیں تو پوچھ لیتی ہوں۔
 شجر نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

ہاں! ذرا جلدی۔

یہ وہ سجاد بھائی! بات یہ ہے کہ — یہ جو اپنی بنفشہ باجی ہیں نا! یہ آپ کو اچھی لگنے لگی ہیں؟
 شجر رانی کا انداز معصومانہ تھا اور سجاد بھائی کی نگاہوں میں حیرت ہی حیرت تھی۔

تم سے کس نے کہا؟
 کسی نے بھی نہیں۔

پھر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟
 بس میں خود ہی سمجھ گئی۔
 خود ہی سمجھ گئیں؟
 سجاد بھائی زیر لب بولے۔

شجر رانی بڑی دیدہ دلیری سے سجاد بھائی کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔
 اس کا مطلب ہے کہ تم بہت سمجھدار ہو۔

جی ہاں! دراصل! میں تو بچپن سے ہی بہت سمجھدار ہوں،
 آپ نے اپنی پڑھائی میں کم ہو کر کبھی میری سمجھداری کی طرف توجہ ہی
 دی۔

شجر نے یہ بات کچھ اتنی بے ساختگی سے کہی کہ سجاد بھائی مسکرائے بغیر
 اڑکے۔

اور کس کس کو معلوم ہے یہ بات؟
 مجھے یقین ہے کہ چھٹ باجی کو بھی معلوم ہے۔

بہت خوب!

سجاد بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔
 لیکن بنفشہ باجی کے فرشتوں کو بھی علم نہیں۔
 ہاں! وہ تو بہت سادہ اور معصوم لڑکی ہے۔
 سجاد بھائی نے کہا۔

تو پھر آپ ان سے کہہ کیوں نہیں دیتے؟

کہیں گے گڑیا! اصل میں جلدی کا کام اچھا نہیں ہوتا۔

سجاد بھائی بولے۔

لیکن اب تو کافی دیر ہو چکی ہے۔

شجورانی مسکرائیں۔

اچھی بات ہے بس پھر اب نیک کام میں دیر نہیں کریں گے۔

سجاد بھائی ہنس کر بولے۔

اچھا! تو پھر اب میں جا کر چھٹ باجی کا شبہ بھی یقین میں بدل دوں۔

جو تہارا دل چاہے کرو۔

سجاد بھائی نے کہا اور شجورانی شہر پر کرتی چھٹ باجی کے کمرے کی طرف

چل دیں۔

اگلے روز بھی سجاد بھائی کو بنفشہ سے بات کرنے کا موقع نہ مل سکا!

وہ جانے کس کام سے چلے گئے تھے۔ بنفشہ بھی یونیورسٹی میں تھی۔ دن میں

سوئے رہے کیونکہ رات کو ہاسٹل میں ڈیوٹی تھی۔ اس سے اگلے روز بھی دن

بنفشہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ہاں! شام کو جب بنفشہ چائے پی کر اپنے کمرے

آئی اور اگلے دن کیے کپڑوں کا انتخاب کرنے لگی تو شجورانی نے کمرے میں داخل

ہوتے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

بنفشہ باجی! آپ کو سجاد بھائی بلا رہے ہیں۔

اچھا۔ کہاں ہیں وہ؟

بنفشہ نے الماری بند کرتے ہوئے کہا۔

اپنے کمرے میں۔

شجورانی لاپرواہی سے کہا۔

بنفشہ نے ہاتھ میں کپڑے ہوئے کپڑے بستر پر ڈال دیئے اور سجاد بھائی

لکڑے کی طرف چل دی۔

سجاد بھائی بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھے ہوتے ٹرانسٹرن رہے تھے

اور بنفشہ!

سجاد بھائی اسے دیکھتے ہی مسکرائے۔

بنفشہ چپ چاپ ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی لیکن اس نے

دیر نہ سوچا۔

کہ یقیناً کوئی خاص بات ہے ورنہ سجاد بھائی نے تو کبھی اسے اس انداز

سے نہیں بلوایا۔

بے شمار لمحے گزر گئے۔ نہ سجاد بھائی نے اس سے کچھ کہا۔ نہ اس نے پوچھا۔

دو تیس حیرت زدہ سی بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ آج سجاد بھائی کو کیا ہو گیا ہے؟

جب کچھ لمحے اور گزر گئے تو بنفشہ نے آہستہ سے پوچھا۔

سجاد بھائی! آپ نے مجھے بلایا تھا؟

ہاں!

کوئی کام ہے؟

ایک بات پوچھنی تھی تم سے؟

جی! مجھ سے!! بنفشہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

ہاں جھٹی باتم ہی سے۔ تم پریشان کیوں ہو رہی ہو اس قدر،
سجاد بھائی مسکراتے۔

معلوم نہیں آپ کون سی بات پوچھنے والے ہیں؟
بنفشہ نے سہمی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

کوئی ایسی بات نہیں ہے تمہیں ڈرنے یا خوفزدہ ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔
سجاد بھائی نے انتہائی نرمی سے کہا۔

پوچھتے۔

بنفشہ کی جھکی ہوئی پلکیں ایک لمحے کے لیے اٹھیں۔

دیکھو بنفشہ! تمہیں تو معلوم ہے نا کہ میں امریکہ جانے والا ہوں۔

جی۔

تو تم سے اس سلسلے میں یہ پوچھنا ہے کہ آیا تم میرے ساتھ چلو گی؟ یا پھر میری
والہی تک میرا انتظار کرو گی؟

جی !!!

بنفشہ نے نظریں اٹھا کر سجاد بھائی کی طرف دیکھا اور مارے حیرت کے

وہ پلکیں تک جھپکنا بھول گئی۔

اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ میری بات کا مطلب نہیں سمجھیں؟

سجاد بھائی مسکراتے۔

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

دیکھو بنفشہ! میں زندگی میں کسی قسم کی بناوٹ اور تصنع کا قائل نہیں ہوں۔

بدی سادی باتیں، سیدھے سادھے انداز اور سیدھے سادھے لوگ مجھے پسند ہیں۔
سجاد بھائی ایک لمحے کے لیے ٹھہرے۔

میری دلی خواہش ہے کہ اپنی آئندہ زندگی تمہارے ساتھ گزاروں اور دل افلاہر
ہے کہ میری اس بات کا مطلب سوا ہے اس کے اور کچھ نہیں کہ میں تمہارے ساتھ
نادی کرنا چاہتا ہوں۔

سجاد بھائی بنفشہ کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہتے رہے۔ اور بنفشہ کی
حالت یہ تھی کہ اس کے چہرے کا رنگ ہر لمحہ بدل رہا تھا۔

اپنے معاملے میں تم خود مختار ہو، آزاد ہو، جو چاہو فیصلہ کرو، اگر تمہارا جواب انکار
ہی ہے تو بھی میں اسے مان لینے پر مجبور ہوں کیونکہ میں زبردستی کا بالکل قائل نہیں۔
سجاد بھائی نے کہا۔

بنفشہ میں تو اتنی بھی تاب نہیں تھی کہ وہ سجاد بھائی سے نظریں ملا سکتی۔ ان
کی بات کا جواب دینا تو بہت دور کی بات تھی۔ یہ سب کچھ اس قدر اچانک ہوا
تھا کہ اسے اپنا دل اور دماغ سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیتوں سے بالکل
محرور نظر آتے تھے۔

جب کئی منٹ خاموشی کی نظر ہو گئے تو سجاد بھائی نے ٹرانسٹرینڈ کر دیا۔
اور میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر بنفشہ کے سامنے قدرے جھکتے ہوئے بولے۔

میری باتیں برسی یگیں تمہیں؟

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

بہت پریشان ہو گئیں میری باتیں سن کر؟

بنفشہ پھر بھی چپ رہی۔

یقیناً میری باتیں سن کر تم حیرت زدہ رہ گئی ہو۔

سجاد بھائی مسکرائے:

میں نے بھی تو بہت زیادتی کی ہے۔ تمہارے ساتھ، ایکدم ہی ایٹم بم چھوڑ

دیا۔ ہیں نا!

سجاد بھائی مستقل اس کے چہرے پر نظر میں جاتے ہوئے تھے۔

بنفشہ کی سوچیں، اس کے خیالات جانے اسے کہاں لے گئے تھے کہ اس کے

دل کا دودھ آنکھوں میں سمٹ کر آنسوؤں کی راہ لینے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ سجاد

بھائی ایکدم نیدھ ہو کر بیٹھ گئے۔ دو ایک سیکنڈ خاموش بیٹھے سوچتے رہے پھر

بہت آہستہ سے بولے۔

میرا خیال ہے بنفشہ کہ میں نے ایسی تو کوئی بات نہیں کہی جو تمہارے

رونے کا سبب بن گئی۔

بنفشہ نے بڑی بے دردی سے اپنی آنکھوں کو رگڑ ڈالا اور بہت مدھم آواز

میں کہا۔

میں نے آپ کو کوئی الزام بھی تو نہیں دیا۔

پھر رونے کا سبب؟

بس! ویسے ہی دل بھر آیا۔

سجاد بھائی جانے کس سوچ میں کھو گئے؟

اب میں جاؤں؟

بنفشہ نے پوچھا۔

اور میری بات کا جواب؟

سجاد بھائی نے کہا۔

میرے پاس کسی کی بات کا کوئی جواب نہیں۔

بنفشہ نے بڑے بے بس انداز سے کہا۔

میں تو اس وقت صرف اپنی بات کہہ رہا ہوں۔

آپ! سجاد بھائی —!

بنفشہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

ہاں کہو! رک کیوں گئیں؟

آپ سے مجھے صرف یہ پوچھنا ہے کہ —

بنفشہ نے پھر بات ادھوری چھوڑ دی۔

آپ نے میرے بارے میں ایکدم اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا؟

سجاد بھائی اس کی بات سن کر بڑے عجیب انداز سے مسکرائے لیکن خاموش

—

بنفشہ اپنی بات کے جواب کی منتظر سجاد بھائی کی طرف دیکھتی رہی۔

مجھے نہیں معلوم بنفشہ! میری اس بات کو تم جھوٹ سمجھو گی یا سچ! کہ بہت

ہلپ میں نے اپنے دل میں جو مقام تمہیں دیا تھا اس کا اظہار کرنے کا موقع

آج ملا ہے۔

سجاد بھائی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

اور بنفشہ ایک بار پھر حیرتوں کے بوجھ تلے دب گئی۔
یہ سجاد بھائی آج کتنی عجیب عجیب باتوں کا اظہار کر رہے ہیں؟ اس
دل میں سوچا۔

بنفشہ! میں زندگی میں کچھ اصولوں اور کچھ اقدار کو پسند کرتا ہوں۔
میں نے پہلی بار تمہارے بارے میں ایک نئے انداز سے سوچا تھا اس وقت
سے یا گھر کے کسی بھی فرد سے اس سلسلے میں کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ کیونکہ ایک
ایک تو تم اس وقت بہت چھوٹی تھیں۔ دوسرے مجھے اپنے مستقبل اور
کیرئیر کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

یادوں کہہ لو کہ صحیح اندازہ نہیں تھا اور جب میں اپنے کیریئر کی طرف
مطین ہوا تو مجھے محسوس ہوا کہ شعیب بھائی کے قدم تمہاری طرف بڑھ
ہیں۔ میں شعیب بھائی کی بہت عزت کرتا ہوں اور ان سے مجھے محبت
بے حد ہے اور اس وقت مجھے یہ غلط فہمی بھی تھی کہ تم بھی ان میں...

سجاد بھائی نے بات ادھوری چھوڑ کر ایک لمحے کے لیے بڑے غور
بنفشہ کے چہرے کا جائزہ لیا جو پلکیں جھپکاتے بنا ان کی باتیں سن
دوسروں کی راہ میں رکاوٹ بننا میرا اصول نہیں اور نہ میری اف

اقدار مجھے اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ میں اپنی ذات سے دور
کو دکھ پہنچا کر اپنا دامن خوشیوں سے بھریوں۔ میں نے شعیب بھائی یا
کسی بھی فرد کے سامنے اس بات کا اظہار کرنے کی ضرورت نہیں محسوس
کہ بنفشہ تو میری پسند ہے۔

سجاد بھائی آخری جملہ کہتے ہوئے بنفشہ کی طرف دیکھ کر قدمے مسکرائے
اور بنفشہ کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔

لیکن۔۔۔ سلیمان کے آنے کے بعد جب میں نے تصویر کے بدلتے ہوئے
دیکھے تو یقین جانو بنفشہ! میں بہت حیران ہوا لیکن ان دنوں میں اپنی
حالی میں اتنا مصروف تھا کہ کسی بھی بات کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے

سجاد بھائی نے تھکے تھکے انداز میں اپنے بالوں کو انگلیوں سے
راتے ہوتے کہا۔

ایک دن۔۔۔ جب امی نے مجھے بتایا کہ سلیمان کے ساتھ تمہارا رشتہ
لے ہو گیا ہے تو اس دن سے زیادہ حیرت مجھے اپنی زندگی میں کبھی نہیں
ہوئی۔

مجھے شبہ ہوا کہ کہیں تمہارے ساتھ کوئی زبردستی تو نہیں ہوتی اسی
لیے میں نے امی سے پوچھا کہ بنفشہ راضی ہے؟

اور امی کا جواب اثبات میں سن کر میں خاموشی سے اپنے کمرے میں
بٹایا اور اسی رات جب شعیب بھائی سے میری بات ہوئی تو میرے

پس سواتے پچھتاوے کے اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ اس روز مجھے پہلی
بار احساس ہوا کہ شعیب بھائی کا انداز نکلہ ہم سب سے جداگانہ، اچھوتا،
البدلتہ ہے۔ میں، یا کوئی دوسرا شخص ان کے کردار کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

لیکن۔۔۔ بہر حال! وقت گزر چکا تھا اور میں تمہیں کھو چکا تھا۔ اس

کے بعد اس بات کی کوئی امید نہیں تھی کہ میری زندگی میں کبھی آج کا دن بھی آئے گا جس کے گزرتے ہوئے لمحوں میں میں اور تم۔۔۔۔۔

سجاد بھائی نے بات ادھر وہی چھوڑ کر ایک طویل سانس لی۔

بنفشہ سوچ رہی تھی۔ سجاد بھائی نے یہ کیسا خول اپنی خوبصورت سی شخصیت پر چڑھا رکھا تھا؟ یوں دیکھو تو سطح سمندر کی طرح خاموشی اور پرسکون! اور پرسکون سطح کے نیچے طوفانِ بلاخیز۔! سچ تو ہے۔ سمندر کی گہرائیوں تک جھلاکتے لوگ پہنچ سکے ہیں؟

اب بنفشہ بیگم!

سجاد بھائی اس کے سامنے قدمے جھکتے ہوئے بولے۔

جیکہ زندگی میں ایک بار تمہیں کھوکھو دوبارہ پالنے کی آس بندھی ہے

تو میں تمہارا جواب سننے کا منتظر ہوں۔

بنفشہ کسی کے دونوں بازوؤں پر ہاتھ رکھے بہت تھکی تھکی سی بیٹھی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ میلوں کی مسافت طے کرتے کرتے تھک چکی ہو۔ سورج ڈوب چکا تھا اور مدھم سے اندھیرے اجالوں کا تعاقب کرتے ہوئے کمرے میں سمٹ آئے تھے۔ باہر۔۔۔ نومبر کی شام لمحہ بھر

گہرا لود ہوتی جا رہی تھی۔ کمرے میں بڑی پرسکون سی خاموشی تھی اور خوشگوار سی نرم آواز تھکی۔

سجاد بھائی نے اٹھ کر لائٹ جلا دی اور درپے کے قریب کھڑے ہو کر

بنفشہ کی طرف دیکھا۔ بنفشہ کا سر جھکا ہوا تھا اور رخساروں پر کانپتی لڑکتا

کا عکس تھر تھرا رہا تھا۔ سجاد بھائی کے دیکھنے کا اندازہ وہاں نہ تھا اور

ایت سے پڑ۔ لیکن بنفشہ ان کی نگاہوں کے انداز سے بالکل بے خبر

بیٹھی سوچ رہی تھی۔ زندگی کے یہ ہر لحظہ بدلتے ہوئے رنگ و روپ

نئے عجیب ہیں؟ کچھ پتہ نہیں چلتا۔۔۔ کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اب جو

ہر لمحہ زندگی میں آئے گا وہ تصویر کا کون سا رخ دکھائے گا؟ ادھر

پچھلے ساڑھے تین برسوں میں۔۔۔ میں نے وقت کے بہتے ہوئے

دھارے میں حادثات کو جہنم لینے اور دم توڑتے ہوئے کس قدر

زیب سے دیکھا ہے؟ اور۔۔۔ اور ان اچانک سامنے آ جانے

والے حادثات نے میرے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں بھی تو

کتنی تبدیلی پیدا کر دی ہے؟

سجاد بھائی اس کی اتنی گہری سوچوں سے کچھ پریشان سے ہو گئے

اور آہستہ قدموں سے اس کے قریب آئے، ایک لمحے کے لیے ٹھہرے

اور پھر اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

بنفشہ!

انہوں نے قدرے اونچی آواز سے کہا۔

جی!

بنفشہ ایک دم چونک گئی۔

مجھے اپنی بات کا جواب چاہیے ضرور۔ لیکن۔۔۔ ابھی۔ اسی

وقت تو نہیں۔

میں واپس اپنی جگہ بیٹھ گئے۔

تم اتنی زبردستیوں ہو رہی ہو؟

سجاد بھائی نے بے حد نرمی سے پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں؟ میرا دل دن بدن کمزور ہوتا جا رہا ہے۔

بنفشہ نے دھیرے سے کہا۔

تم نے مجھ سے کہا ہوتا، میں تمہارے لیے کوئی دوا، کوئی ٹانک تجویز

دیتا۔

اور اس وقت تو — مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرا دماغ بھی بالکل

ناہو کر رہ گیا ہو۔

بنفشہ نے ان کی بات کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی۔

سجاد بھائی نے بھینرنگا بھوں سے اس کی طرف دیکھ کر کرسی کی لپٹ

سے ٹکایا، دوا کے لمحے خاموش بیٹھے سوچتے رہے۔

پھر مدھم آواز سے بولے۔

میری باتوں سے تمہیں بہت تکلیف پہنچی ہے؟

نہیں تو۔

بنفشہ کی نگاہوں میں حیرت تھی۔

پھر اتنا ہی اس کیفیت سے یہ کیا نتیجہ اخذ کروں؟

معلوم نہیں، مجھے — مجھے کچھ نہیں معلوم۔

تمہیں معلوم ہو یا نہ معلوم ہو لیکن مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے؟

سجاد بھائی مسکراتے۔

بنفشہ کرسی کی لپٹ سے سرٹکاتے چپ چاپ سجاد بھائی کی طرف دیکھتے

رہتے۔

تمہیں طبیعت میں ٹھیک ہے؟

سجاد بھائی نے ہلکے پوچھا۔

سجاد بھائی!

بنفشہ کی آواز بہت مدھم تھی۔

بنفشہ!

سجاد بھائی کچھ اور پریشان ہو کر اس کی طرف بھک گئے۔

میں — اس وقت اپنے آپ کو بے جان سا محسوس کر رہی ہوں۔

بنفشہ نے دھیمی آواز میں کہا۔

میرا خیال ہے تم غصوڑا سا لگو کوڑی لو۔

سجاد بھائی اُٹھتے ہوئے بولے۔

نہیں نہیں۔ آپ بیٹھے رہیے۔ مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

بنفشہ نے کہا۔

سجاد بھائی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تو بنفشہ قدم سے اُپچی آواز

میں بولی۔

آپ یہیں بیٹھے رہیے۔ سجاد بھائی اکہیں مت جائے۔

سجاد بھائی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے مکمل

کیا؟

بنفشہ ایک دم پوچھ بیٹھی۔

کہ تمہیں اس وقت نہ صرف میری باتیں بُری لگی ہیں بلکہ میں بھی بُرا لگ رہا ہوں۔

سجاد بھائی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

اتنا بڑا الزام تو مت لگا جیسے میرے اُپر۔

بنفشہ کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

اگر اسے الزام سمجھتی ہو تو پھر سوچو کہ تمہارے دل میں ہے۔ وہ بتا دو۔

میرے دل میں کیا ہے؟

بنفشہ نے زیر لب کہا۔

سجاد بھائی کرسی کی پشت سے سڑکائے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

مجھے اپنے دل سے کوئی آواز ہی نہیں سنائی دے رہی۔

بنفشہ کی آواز بہت مدھم تھی۔

اچھا اتم جاؤ، میری باتوں پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنا، پھر تمہارا

دل اور دماغ جس فیصلے پر بھی متفق ہو جائیں اس سے مجھے آگاہ کر دینا۔

سجاد بھائی مسکراتے۔

اچھا!

بنفشہ آہستہ سے کرسی کھسکا کر کھڑی ہو گئی اور سجاد بھائی سے نگاہیں ملانا

بغیر باہر نکل گئی۔

باہر تاراجی گہری ہو گئی تھی اور رات کے پہلے پہر کا سا نا دھیرے دھیرے پھیلتا

نچا چاند کی روشنی پھیل چکی، مدھم، نر داؤد بیمار سی تھی، اور چنبیلی کے پھولوں کی

نہو مدھم ہواؤں کی بانہوں میں سمٹی ہوئی آنجنابی سمتوں کی طرف اڑی جا رہی تھی

رات کو کھانے کے وقت جب سجاد بھائی اس کے سامنے آکر بیٹھے تو بنفشہ کے

پیرایک ہلکا سا رنگ چھا کر رہ گیا۔ جھکی پلکوں کی چلن اٹھا کر اس کی بار بھی سجاد بھائی

نہیں دیکھا۔ سجاد بھائی اس کی گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زیر لب

نے رہے۔

اس روز بنفشہ کو کھینچ پڑھنے کا بہت کام تھا لیکن سجاد بھائی نے اگر اس کا

نامی قابل چوڑا ہوتا تو وہ کتاب کھولتی شکل یہ تھی کہ وہ شہو یا کسی دوسرے

لپا پنی کیفیت ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جب کچھ بن نہ پڑا تو وہ منہ سرلیٹ

لپائی شہو لکھیوں سے مستقل اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ بھی حیرت کی بات

و اس نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔ حالانکہ دل بیتاب تھا کہ کس طرح بنفشہ سے

انام کی مصروفیت کے بارے میں پوچھے۔

شہو کافی رات تک پڑھتی رہی۔ جب آنکھیں نیند سے بالکل ہی بو جھل ہونے

لپائی بھیا کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ بنفشہ کی آنکھیں نیند کا پسینا دیکھتے دیکھتے

لپائی بھیا تھیں۔ اس کی سوچوں اور اس کے خیالات پر سجاد بھائی مستقل پہرے دار

بیٹھے تھے۔ جب دل اور دماغ کسی فیصلے پر متفق ہی نہ ہو سکے تو وہ تنگ آکر رودی

پپ چاپ اس کی آنکھوں کے کناروں سے بہتے ہوئے، کانوں کی دود سے

نہرے تکتے اور بالوں میں جذب ہوتے رہے۔ ان گنت لمحے، ساٹھے، خاموشی

ساری زندگی تو ان لوگوں کے اوپر بوجھ بن کر بیٹھنا نہیں ہے۔ آخر کبھی نہ کبھی تو ان بگم اور تباہیوں کے کاغذوں کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔ کسی نہ کسی کا ہاتھ تو تھا مٹا دیا جائے گا۔ تو پھر سجاد بھائی — لیکن میں سجاد بھائی کے قابل کب ہوں؟ اس نے سوچا اور کوئی فیصلہ کئے بغیر وہ اپنے بستر پر آگئی۔

دوسرا تمام دن بھی سوچوں کی الجھی ہوئی راہوں پر چلتے چلتے گزر گیا لیکن دل داغ کسی ایک بات پر متفق ہی نہ ہو سکے۔

رات کو سجاد کا بیویوں اور کتابوں کا ڈھیر اپنے سامنے رکھ کر بیٹھی تو ہنسنے لگی۔ اہل خواستہ زبردستی کتاب کھول کر بیٹھ گئی۔ ایک صفحے کو جانے کتنی دفعہ پڑھ لی۔ داغ میں ایک لفظ بھی نہ بیٹھا۔ سجاد تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کا جائزہ لے کر زیر لب مسکرا رہی تھی۔ تنگ آکر ہنسنے لگا۔ کتاب بند کر دی اور کرسی کی پشت سے سرکا کر سامنے والی دیوار کو گھورنے لگی۔

پڑھنے کا موڈ نہیں ہے تو نوٹس ہی اتار دیجئے۔

سجاد نے کہا۔

لاؤ دیدو۔

ہنسنے والی حامی بھری اور بڑی دل جمعی کے ساتھ نوٹس اتارنے کی کوشش کرنے لگی۔ چار چھ ہی صفحے اتارے ہوں گے کہ سجاد نے فلم اس جگہ اڑنے لے لیا۔

آپ کا داغ اس وقت حاضر ہے یا غائب؟

سجاد مسکرائی۔

اور دھیرے دھیرے گزرتی ہوئی رات کی نذر ہو گئے۔ باہر — سڑک پر کتوں کے بھونکنا اور چوکیدار کے قدموں کی بھاری آواز بلند ہوئی تو وہ بغیر کسی مقصد اور کسی ارادے کے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایک نظر بے خبر سوئی ہوئی شجر کی طرف ڈالی اور اٹھ کر درخت کے نیچے میں کھڑی ہو گئی۔ داد جان کے کمرے سے ان کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر — ہر طرف ہندو سی خاموشی چھا گئی۔ رات تنگ بھی تھی اور دل نواز بھی! ہوا تو میں پھولوں کی جیسی سی جھک رہی ہوئی غمی اور چاند، بادام کے گھنے، خوبصورت درخت کے پیچھے سے جھانکتے جھانکتے بہت بلند ہو گیا تھا۔

رات کا پچھلا پہر، خاموشی، سناٹا اور — آتے جاتے لمحوں کا رواں نافشہ یادوں کے خاموش، پُر سکون سمندر کی لہروں پر ڈولتی رہی، اس کی گہرائیوں میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی رہی۔ اس کا ماضی رنج و غم کی ایک طویل داستان کے سوا اور کچھ نہیں تھا، حال کا ہر لمحہ یقین اور بے یقینی کی ایک ایسی کہانی کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا جس کے انجام کی کچھ خبر نہیں تھی اور — مستقبل — محض ایک تاریک غلا تھا۔

اسے دنیا اور دنیا والوں سے کبھی ڈر نہیں لگا تھا لیکن اس کی قسمت اسے ہر لمحہ خوفزدہ کیے رہتی تھی۔ دل کی دنیا میں ایک طوفان پہلے آیا تھا اور اب — سجاد بھائی نے دوسرے طوفان کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔ اس کے دل میں سجاد بھائی کی عزت ہمیشہ سے تھی اور محبت بھی — لیکن اس کی محبت اور چاہت کا وہ انداز نہیں تھا جو سجاد بھائی کی محبت اور چاہت کا تھا۔ سجاد بھائی کے جذبات تو بالکل مختلف تھے۔ اس نے تو کبھی ان کے اور اپنے لیے یہ بات خواب میں بھی نہیں سوچی تھی۔

کیوں؟

بنفشہ نے چونک کر پوچھا۔ یوں۔ جیسے اس کے دل کا چور پکڑ گیا ہو۔
ذرا یہ صفحہ تو پڑھ جائیے، ایک جملے کو دودو، تین، تین دفعہ بکھنے کو نہیں

کہا تھا میں نے!

شبتو کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اور بنفشہ اپنا لکھا ہوا صفحہ پڑھ کر شرمندہ سی ہو گئی۔

کیا بات ہے؟ میں کل سے آپ کو کچھ کھو گیا محسوس کر رہی ہوں۔

شبتو نے بڑے پیار سے بنفشہ کا ہاتھ تمام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

کچھ نہیں، مجھے جھلا کیا ہو گا؟

بنفشہ کی پلکیں جھک گئیں۔

دل کچھ اداس لگتا ہے!

شبتو کی آنکھوں میں شہزاد ناچ رہی تھی۔

نہیں۔ بالکل نہیں۔

بنفشہ نے گہرا کر کہا۔

تو پھر کیا وجہ ہے؟ آپ سے نہ لکھا جا رہا ہے نہ پڑھا جا رہا ہے۔

شبتو نے جست کی۔

ہاں! جانے کیا بات ہے؟ مجھے خود نہیں معلوم۔

بنفشہ، شبتو سے نظریں نہ ملا سکی۔

آپ کو نہیں معلوم؟!! اچھا! لیکن مجھے تو معلوم ہے۔

شبتو نے جھٹ سے کہہ دیا۔

کیا! تمہیں کیا معلوم ہے!!؟

بنفشہ کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور پریشانی بھی۔

ہی کہ — سجاد بھائی نے آپ کے سامنے حال دل بیان کر دیا ہے۔

شبتو نے بیباکی سے کہا۔

بنفشہ کی پلکیں اس کے رخساروں پر کانپ کر رہ گئیں۔ اس نے بڑی آہستگی

بڑے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور میز کے کنارے پر ستر لگا دیا۔ کوئی درد

اڑل کر اس کا سارا دکھ سمٹ کر آنکھوں میں آگیا۔ آئنا اس کی آنکھوں میں جھلملاتے،

نایک آئے اور ٹپ۔ ٹپ میز کے کنارے پر گر گئے۔

شبتو رانی کو لپکا یقین تھا کہ بنفشہ سے مارے شرم کے یہ حرکت سرزد ہوئی

پوڈیز تک تو وہ مسکراتی رہیں اور پیار بھری نظروں سے اپنی بنفشہ باجی

نہ دیکھتی رہیں پھر بڑی آہستگی سے ان کا سر اُپر اٹھاتے ہوئے بولیں۔

اؤ بھئی! تو اب اس میں شرم آنے کی کوئی بات ہے؟

لیکن بنفشہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ہنستی سی بنی رہ گئیں۔

یاں! یہ کیا چکر ہے؟

انہوں نے دل میں سوچا۔

بنفشہ باجی! آپ تو وہ ہی ہیں!

شبتو رانی نے کہا۔

بنفشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اگے وہ دادا جان کے کمرے سے نکل رہے تھے۔ بنفشہ نے لگا ہیں بچا کہ گزر جانا
لیکن سجاد بھائی بالکل سامنے آکر رک گئے۔
دادی اماں تو سر پڑ کر مٹی اندھ چلی گئیں۔
اپنے کمرے میں جانے کی بہت جلدی تو نہیں ہے؟
سجاد بھائی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
جی! جی نہیں!۔
بنفشہ سٹپٹا گئی۔
تو پھر میرے ساتھ آؤ۔

سجاد بھائی نے کہا۔

بنفشہ سوچ میں پڑ گئی لیکن سجاد بھائی نے جلتے جاتے جب پلٹ کر اس
طرف دیکھا تو وہ سر جھکا کر ان کے پیچھے پیچھے چل دی۔ سجاد بھائی بڑے اطمینان
صوت پر پیچھے گئے تو بنفشہ نے بھی بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

پھر تم نے کیا فیصلہ کیا بنفشہ بیگم؟

سجاد بھائی نے بغیر کسی متبذ کے کہا۔

بنفشہ کو شاید پہلے سے توقع تھی کہ سجاد بھائی اسی قسم کا سوال کریں گے۔
اس نے دو ایک لمحوں کے لئے بڑی خود اعتمادی سے سجاد بھائی کی طرف

پھر قدرے مدہم آواز میں بولی۔

میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔

فیصلہ نہ کرنے کی وجہ؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

مجھے نہیں معلوم۔

بنفشہ نے کہا۔

میں تمہیں بہت برا لگتا ہوں؟

سجاد بھائی نے سنجیدگی سے کہا۔

نہیں۔ نہیں۔ سجاد بھائی! یہ بات بالکل نہیں۔

بنفشہ نے جلدی سے کہا۔

تو پھر؟

سجاد بھائی کی لگا ہیں مستقل اس کے پرے پر جی ہوئی تھیں۔

میں آپ کی بات کا کیا جواب دوں؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

بنفشہ نے پریشان ہو کر کہا۔

تمہاری سمجھ میں نہیں آتا؟

سجاد بھائی نے کہا۔

نہیں۔

اچھا تو پھر میں جو فیصلہ کر دوں گا مان لوگی؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

جی۔

بنفشہ کے پاس اقرار کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

تو بنفشہ بیگم! میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اب میں آپ کو کسی اور کا ہرگز نہیں

بنفشہ نے جھینپ کر نظر میں جھکا لیں۔

بنفشہ تو نظر میں جھکا لئے بیٹھی تھی اور سجاد بھائی اپنی نگاہوں میں پیار کا ایک لہجہ اس کی طرف دیکھ کر جا رہے تھے بے شمار لمحے اس پیار بھری خاموشی کی ہر گزے تو بنفشہ کو ایک دم احساس ہوا کہ اسے سجاد بھائی کے کمرے میں بیٹھے ہوئے

فی الحال آپ کو ساتھ لے جانا مشکل ہے کیونکہ میرے جانے میں صرف چند دن

باقی رہ گئے ہیں لیکن ان چند دنوں میں، میں کچھ ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ دوسرے شخص کو آپ کے متعلق کچھ سوچنے کی جرات ہی نہ ہو سکے۔

سجاد بھائی نے یہ سب کچھ اتنی سنجیدگی سے کہا کہ بنفشہ ہلکی ہلکی ہنسی بنا ان کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

سجاد بھائی نے کہا۔

بنفشہ سوچوں میں ڈوبی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس طرح کیا دیکھ رہی ہو؟ کچھ اعتراض ہے تبیں میرے فیصلے پر؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

ہیں۔ نہیں تو۔۔۔ لیکن۔۔۔ پتہ نہیں آپ نے صحیح فیصلہ کیا ہے یا غلط؟

بنفشہ نے کہا۔

عزیزہ! آپ اس کی قطعی فکر نہ کریں، میں بہت سوچ کر فیصلہ کیا کرتا ہوں۔

سجاد بھائی قدرے مسکرائے۔

گھر میں کوئی ناراض تو نہیں ہوگا اس بات پر؟

بنفشہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

آپ بہت بڑی احمق ہیں، بیچارہ کی سوچوں میں اپنے دماغ کو الجھانے کی کوشش بالکل نہ کیجئے۔

سجاد بھائی کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔

اماں بیگم نے نذرانگی سے کہا۔

ادوں ہوں اپکھلی باتوں کو جانے دیجئے، اب تو آپ جلدی سے انتظامات کیے
میرے جانے میں چند دن باقی ہیں۔

سجاد بھائی نے کہا۔

تم مردوں اور لڑکوں کی اس عادت سے مجھے سخت چڑ ہے۔ ہمیشہ ہتھیلی پر
مردوں جلنے کی کوشش کرتے ہو۔

اماں بیگم جھجھلا کر بولیں۔

محاورے بولنے کا وقت نہیں ہے اماں بیگم!
سجاد بھائی کو ہنسی آگئی۔

تو اور کیا کروں؟ اب اگر تم یہ چاہتے ہو کہ ان چند دنوں میں تمہاری شادی کر دو
تو یہ مجھ سے نہیں ہوگا، غضب خدا کا پہلے بیٹے کی شادی کروں اور وہ بھی دھنگ
سے نہ ہو۔

اماں بیگم کا بلڈ پریشر بھر مٹا ہوا ہونے لگا۔

شادی کسے لئے کون کتا ہے بس کوئی چھوٹی سی تقریب ہو جائے۔

سجاد بھائی نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

مگنی کہ دوں؟

اماں بیگم نے پوچھا۔

ہاں! فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔

سجاد بھائی نے کہا۔

مگنی میں بھی کچھ تو دھوم دھڑکا ہونا چاہیئے آخر تم میرے بڑے بیٹے ہو۔
بیگم بولیں۔

دھوم دھڑکے کو پھر کسی وقت کے لئے اٹھا رکھئے۔

باد بھائی نے کہا۔

پا۔ بس۔ خاموش ہو جاؤ، میرا بزرگ بننے کی کوشش مت کرو، جو میں
بھول گئی، کر دوں گی۔

بیگم نے گھر ٹک دیا۔

دی اماں سے تو بات کر لیجئے۔

باد بھائی کمرے سے باہر نکلتے نکلتے بھی مشورہ دینے سے باز نہ آئے۔

مادرے کہنے کی ضرورت نہیں، ان سے پوچھے بغیر تو کوئی کام کرنے کا سوال ہی
پا ہوتا۔ لیکن انہیں یا کسی دوسرے شخص کو اعتراض بالکل نہیں ہوگا اس بات پر۔
بیگم نے بڑے مطمئن انداز میں کہا۔

مادرے۔ رات کو ڈرائنگ روم میں دادا جان سمیت گھر کے سارے بڑوں
کا بڑی دیر تک ہوتی رہی۔ شیخو رانی اپنی عادت کے مطابق چھپ چھپ
دل کی باتیں سننے کی کوشش کرتی ہیں۔

باد بھائی کا فیصلہ جس جس نے سنا دوا ایک لمحے کے لئے تو وہ اپنی جگہ ہونق بنا
لائی ماں پان چھاپیہ جپانا بھول گئیں، دادا جان اپنی خشخشی وارٹھی میں انگلیوں
ماکرنا بھول گئے۔ تاپا یا اپنا اپنے پانسپ کا دھواں باہر نکالنا بھول گئے۔

بنے سوچا۔ یہ سچا دیاں تو چھپے رہتے نہ نکلتے، لیکن دل میں سب بہت

خوش تھے اور سجاد بھائی کو بہت عقلمند سمجھ رہے تھے۔
 اس مینگ میں منگنی کا دن اور تاریخ بھی مقرر کر لی گئی، باقی انتظامات کے بارے میں بھی سب نے اپنا اپنا مشورہ پیش کر دیا اور جمعہ کا دن منگنی کے مقرر کر دیا گیا۔

بڑھیا کو یہ ساری باتیں اگلی صبح کو پتہ چلیں۔ وہ بھی ہوا یوں کہ بڑی اماں ان کے آفس جانے سے پہلے موقع پہنچی جا پکڑا اور جلدی میل دی ساری باتیں ان گوش گزار کر دیں۔

بڑھیا نے بڑی حیرت سے بڑی اماں کی تقریر سنی اور پھر بہت مطمئن نہ رہیں۔ ان روز بڑھیا خلافت معمول دوپہر کو ہی گھر میں آگئے۔ دوپہر کا کانا انہوں نے کھا تھا۔ یہ اچھا ہوا، بنفشہ کے لئے سجاد و بہت موندوں اور مناسب ہے۔

بڑی اماں نے بھی ان کی تائید کی اور پھر اپنا حرف مطلب زبان پر لے کر بڑی اماں کی طرف بڑھا رہی تھیں اور کہتی جا رہی تھیں۔ کھاؤ میاں! کبھی کبھی میں نے کیا سوچا ہے؟

بڑھیا نے فریادیں بولیں۔
 ہاں! تم کب تک مجھ بڑھیا کو تنہا ڈو گے؟
 بڑی اماں نے انتہائی بے چارگی سے کہا۔
 میں آپ کو کہاں تنہا ہوں اتنی؟
 بڑھیا مسکرائے۔

یہ تنہا نہیں تو اور کیا ہے کسی طرح شادی پر رضامند ہی نہیں ہوتے۔

بڑھیا نے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو دروازے کے باہر کھڑے

انہوں نے چائے کی فراہم کر دی اپنے کمرے میں پہنچے تو بنفشہ کو

اپنے سے موجود کیا کہ بڑی بہت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

بڑ بھیا اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ہوئے۔

جی۔

بنفشتہ نے گہرے دن بلائی۔

جھوٹ۔ انہی جلدی نواٹھ گئیں تھیں تم؟

بڑ بھیا نے کہا۔

ہیں نے اور شتو نے کینٹین میں سمو سے کھائے تھے، بھوک زیادہ نہیں تھی۔

بنفشتہ نے کہا۔

اچھا۔ اور کیا حال ہیں؟ سب خیریت؟

جی۔

منا ہے بعد کو نہاری منگنی ہے۔

بڑ بھیا نے مسکراتی رگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

بنفشتہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

تم خوش تو ہونا!

بڑ بھیا نے پوچھا۔

بنفشتہ پھر بھی خاموش رہی۔

ارے بھی! کچھ منہ سے تو یوں۔

بڑ بھیا نے کہا۔

کیا بولوں؟ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

بنفشتہ نے کہا۔

سجاد تمہیں پسند ہے؟

بڑ بھیا نے پوچھا۔

اُپ کو پسند ہیں؟

بنفشتہ نے اٹا اٹھی سے سوال کر دیا۔

یہ تم نے کیوں پوچھا؟ میری منگنی تو نہیں ہو رہی سجاد سے؟

بڑ بھیا مسکرائے۔

بنفشتہ بھی مسکرا دی۔

دیے یہ سب کچھ ہو کیسے گیا ایک دم؟

بڑ بھیا نے پوچھا۔

بنفشتہ نے بڑی سادگی اور معصومیت سے اپنی اور سجاد بھائی کی گفتگو مختصر اور بھیا

بتادی۔ وہ بڑے اٹھک سے سنتے رہے۔ بنفشتہ خاموش ہوئی تو وہ مسکرا کر بولے۔

بہت خوب! سجاد کا بھی جواب نہیں۔

بنفشتہ خاموش بیٹھی ان کی طرف دیکھتی رہی۔

ویسے اب میں تمہاری طرف سے بالکل مطمئن ہوں، سجاد جیسے لڑکے بہت کم

رتے ہیں اس سے زیادہ کوئی شخص تمہاری قدر نہیں کر سکتا۔

بڑ بھیا نے صوفے کی پینٹ سے مڑکاتے ہوئے کہا اور بڑی گہری سچوں میں

لٹک گئے۔

جمعہ کے دن بنفشتہ کی منگنی سجاد بھائی سے ہو گئی۔ سجاد بھائی کے منع کرنے کے

بوجود ماں بیگم اپنے دل کے ارمان پورے کرنے سے باز نہ آئیں جتنی بھی دھوم دھام

سے وہ تنگنی کمر بستہ تھیں اس میں انہوں نے کوئی گسرنہ چھوڑی۔ شجوا اور چھٹ باجی نے بھی اپنی حسرتیں پوری کرنے میں نخل سے کام نہیں لیا۔

ایک جمعہ کو تنگنی ہوئی اور دوسرے جمعہ کو سجاد بھائی کے رخصت ہونے کا دن تھا۔ تنگنی کے بعد سے بنفسفہ سے ان کی تفصیلی بات بھی نہیں ہو سکی تھی اپنے جانے کے سلسلے میں وہ کچھ اتنے مصروف تھے کہ باوجود کوشش کے وقت نہیں نکال سکے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ جمعہ کے دن تو ویسے ہی اتنا ہنگامہ ہوگا کہ بنفسفہ کی صورت

دیکھنا بھی دشوار ہوگا۔ کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکالنی چاہیے کہ ایک دن پہلے ہی اس سے ملاقات ہو جائے۔ کسی کے ذریعہ بلوانا انہیں اچھا نہیں لگا۔ خود اس کے کمرے میں جا کر اسے اپنے ساتھ لانا نہیں سکتے تھے کیونکہ وہاں شجوا سے ڈبھیسڑ ہو جانے کا خطرہ

تھا اور بنفسفہ خود — منہنی کے بعد سے ان سے اس قدر چھپنے لگی تھی کہ ان کا سامنا ہوتے ہی جلدی سے نظر بس جھکا کر دوسری طرف چل دیتی۔ لیکن آخر کب تک؟ جانے سے ایک روز پہلے سجاد بھائی کو موقع مل ہی گیا۔ بنفسفہ دادا جان کو شام کا اخبار سنا کر

ان کے کمرے سے نکل رہی تھی اور سجاد بھائی اسی وقت باہر سے آئے تھے وہ بڑے تھکے تھکے قدموں سے براہ راست کی میڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ بنفسفہ پر نظر پڑتے ہی وہ مسکرا دیئے۔ بنفسفہ نے جلدی سے آگے بڑھ جانا چاہا لیکن سجاد بھائی نے سنانے

آگے اس کا راستہ روک لیا۔ بنفسفہ نے گھبرا کر دادا جان کے کمرے کی طرف دیکھا پھر سنانے والے کمروں کی طرف نظر دوڑائی۔

کیا بات ہے؟

سجاد بھائی اس کی گھبراہٹ سے غلط فہم ہو کر بولے۔

جی! کچھ نہیں۔

بنفسفہ نے کہا۔

پھر؟ یہ اس قدر بے دلی، بے اعتنائی؟

سجاد بھائی نے کہا۔

نہیں تو۔

بنفسفہ نے پریشان ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

تہیں معلوم ہے میں کل جا رہا ہوں؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

جی۔ بنفسفہ نے کہا۔

تمارا بالکل دل نہیں چاہتا کہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھ کر مجھ سے باتیں کرو؟

بنفسفہ اس بات کا کیا جواب دیتی؟ سر جھکانے لگی رہی۔

میرے ساتھ آؤ۔

سجاد بھائی نے کہا۔

بنفسفہ نے گھبراہٹ کی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

بلا وجہ ڈرنا اور خوفزدہ ہونا چھوڑ دو۔

سجاد بھائی نے کہا۔

آؤ۔

انہوں نے پھر کہا۔

بنفسفہ نے بڑی بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور ان کے ساتھ چل دی۔

سجاد بھائی اپنا کوٹ اتار کر بستر پہ ڈالتے ہوئے بولے۔
ہوں۔ اب بناؤ تمہارا بالکل دل نہیں چاہتا مجھ سے باتیں کرنے کو؟
آپ تو خود اس قدر مصروف رہتے ہیں۔
بنفشہ نے کہا۔

اچھا بہانہ ڈھونڈا۔

سجاد بھائی مسکرائے۔

بنفشہ خاموش رہی۔

میرے ساتھ جانے کو دل چاہ رہا ہے؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

بنفشہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بولونا!

سجاد بھائی نے آگے بڑھ کر اس کا سر ملایا۔

بنفشہ کے چہرے پر سرخی مٹی چھا گئی۔

منہ میں زبان نہیں ہے؟

سجاد بھائی نے مسکرا کر پوچھا۔

میرے دل کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ آپ مجھے لے تھوڑی جاؤں گے۔

بنفشہ نے ان کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

سجاد بھائی کو اس پر نوٹ کر پیرا کیا۔ اس جیسی بے زبان لڑکی اور کس طرح اپنے

دلی جذبات کا اظہار کر سکتی ہے؟

انہوں نے سوچا اور اس کی طرف والہانہ انداز سے دیکھتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔
میرا اس چلے تو تمہیں ایک منٹ کے لئے اپنے آپ سے جدا نہ کروں۔ لیکن مجبوری
مان سے سب کچھ کرواتا ہے۔

سجاد بھائی نے کہا۔

دیسے۔ آپ مجھے کتنے عرصے بعد بلو الیں گے؟

بنفشہ نے پوچھا۔

سجاد بھائی نے بڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھی۔ چند لمحوں اس کی جھکی ہوئی ہلکیوں
نظریں جانے کچھ سوچتے رہے پھر اٹھ کر اس کے قریب آئے اور نیچے کھڑے ہو گئے جانے
ایک ان چاہ رہے تھے؟ بنفشہ نے گردن کھول کر ان کی طرف دیکھا۔

تم سچ بچ میرے بغیر نہیں رہ سکتیں؟

انہوں نے پوچھا۔

نہیں۔

بنفشہ نے بڑی صاف گوئی سے اقرار کیا۔

کیوں؟

مجھے ڈر لگتا ہے۔

ڈر لگتا ہے؟ کس سے؟ کس بات سے؟

سجاد بھائی نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

بنفشہ خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ میں یہ بات کس طرح بتاؤں کہ اپنے مستقبل کے
بارے میں سوچتے ہوئے جانے کیوں میرا دل دھڑک اٹھتا ہے، سہم جاتا ہے۔

سجاد بھائی نے جب اصرار کر کے پوچھا تو وہ اپنے دل کے خدشات زبان پر لے آئی۔

بادا وجہ وہم نہیں کرنا چاہیے، میرا دل کہتا ہے کہ اب تمہاری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں آئے گا۔

سجاد بھائی نے تسلی دی لیکن بنفسہ سجاد بھائی کی اتنی محنت اور اتنی ہمدردی پاکمر سوگوار سی ہوئی۔ سجاد بھائی نے اس کا ذہن بٹانے کے لئے بالکل بچکانہ قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ ان کی باتوں سے بنفسہ کے دل کی اداسی و فتنی طرد ہو چکی۔ لیکن اپنے کمرے میں آنے ہی وہ پھر گم صدم سی ہو کر رہ گئی۔ اپنے بستر پر بے جان سی پڑی وہ بڑے مایوس اور اداس اداس سے خیالات میں گھری رہی۔

اگلے دن سجاد بھائی کو جانا تھا گھر کا ماحول بڑا اداس اور سوگوار سا تھا ماں بیگم کو سب ہی لوگ سمجھا سچا کہ تنہا چلے تھے لیکن ان کے آنسو تھے کہ بے چلے آ رہے تھے۔ دادی اماں بار بار اپنی عینک اتار کر گیلی آنکھوں کو خشک کر رہی تھیں۔ بڑی اماں اوپر چچی جان دل پر اداسی کا بوجھ لئے کاموں میں مصروف تھیں۔ دادا جان، بڑا با، اماں اور چچا جان وقفے وقفے سے سجاد بھائی کو نصیحتیں کر رہے تھے۔ سجاد بھائی اپنے دل کی اداسی کو پھپھائے کبھی آ پا جان کو سمجھا رہے تھے، کبھی چھٹ باجی کی پیٹھ پختہ پختہ تھے اور کبھی شجر کے سر پر ہاتھ بھرتے تھے۔ بنفسہ اس روز صبح ہی سے کونوں کھدروں میں بھینتی پھر رہی تھی۔ اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ سجاد بھائی سے سامنا نہ ہونے پائے ایئر پورٹ جانے کا وقت قریب آیا تو سجاد بھائی اس سے کمرے میں آگئے وہ کمرے پر بیٹھی دونوں ہاتھ گودیں رکھے بڑی لمبی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سجاد بھائی اس کے سامنے

لیکھڑے ہو گئے تب بھی وہ اس طرح بیٹھی رہی۔ بنفسہ!

سجاد بھائی نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

بنفسہ نے ان کی طرف دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔

ایئر پورٹ نہیں چلو گی؟

سجاد بھائی نے پوچھا۔

نہیں، میں یہیں سے آپ کو خدا حافظ کہہ دیتی ہوں۔ بنفسہ نے کہا۔

یکہ۔ باتیں نہیں کرتے چنو اٹھو۔

سجاد بھائی نے اس کا ہاتھ تھام کر اٹھایا۔

میں نہیں خط لکھوں گا جواب ضرور دینا، سمجھیں۔

سجاد بھائی نے اس کا سر کپکپ کر ہلایا۔

اچھا۔

میرے بعد اداس رہنے کی قطعی ضرورت نہیں، ہنسنا بولا کہ وہ۔

سجاد بھائی نے کہا۔

بنفسہ خاموش رہی۔

میری نصیحتوں پر عمل کرو گی نا!

سجاد بھائی نے پوچھا۔

بنفسہ نے اقرار میں سر ہلایا اور آہستہ سے کہا۔

نہجورانی کی آنکھیں حیرت زدہ انداز میں بنفشہ کے سپرے پر نرم کر رہ جاتیں۔
 جب کہی دن اسی طرح گزرنے لگے تو نہجورانی کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ
 نہ تھا۔ بنفشہ کے سر پہ سوار ہو کر سجاد بھائی کو خط لکھوا لیں۔
 پیری سمجھ میں نہیں آتا نتیجہ! میں کیا لکھوں؟
 بنفشہ نے قلم تھاتھاتے ہوئے کہا۔
 ارے بھئی کچھ بھی لکھ دیجئے۔
 نہجورانی نے کہا۔

بنفشہ پیڈ کے نیلے صفحے پر نظر میں جمائے خاموش بیٹھی رہی۔
 نہجورانی نے بڑی عزت سے خط کا مضمون ذہن میں تیار کر کے بنفشہ کے گوش گزار کیا۔
 نے اسے ایک دم ریجیکٹ کر دیا۔ ”نہیں بھئی، یہ ساری باتیں تو میں ہرگز نہیں لکھ سکتی۔“
 بنفشہ نے کہا۔

”پھر؟ آخر آپ کیا لکھنا چاہتی ہیں؟“
 نہجورانی نے پوچھا۔
 تم دُعا دیر کے لئے مجھے تہنا چھوڑ دو۔ میں خود ہی سوچ سمجھ کے لکھ دوں گی۔
 بنفشہ نے کہا۔

یہ تو کر سکتی ہوں کہ آپ کے پاس سے ہٹ کر بستر پہ بیٹھ جاؤں لیکن اس کمرے
 پہ تو تہنا ہرگز نہیں چھوڑ سکتی۔
 نہجورانی نے کہا۔

آپ کا کیا ٹھیک؟ آپ پھر قلم چھوڑ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوں۔

سجاد بھائی پتلے گئے اور گھر میں کئی دنوں تک قبرستان کا سناٹا چھایا۔ آپ
 کو گھر بھرا ہوا تھا۔ بچے بھی تھے، جوان بھی تھے۔ اور بوڑھے بھی! لیکن پھر بھی ایک غلام
 احساس ہوتا تھا۔ اماں بیگم کے دل کو تو اس وقت تک قرار نہ آیا جب تک سجاد بھائی
 خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع نہ بھیجادی۔

بنفشہ کے نام جب سجاد بھائی کا پہلا خط آیا تو کئی دن گزر جانے کے بعد بھی
 نے جواب نہیں لکھا۔ نہجورانی روزانہ پوچھتیں، ”بنفشہ باجی! آپ نے سجاد بھائی کو خط
 دیا؟“ بنفشہ کا سر ایسے موقعوں پر ہمیشہ جھک جاتا اور وہ بڑی آہستگی سے کہتی، ”نہیں“
 تو نہیں لکھا۔

”آپ بھی کمال کرتی ہیں۔“

شجر نے بنفشہ کو خاموش دیکھ کر کہا۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ تم کمرے سے چل جاؤ۔

بنفشہ باوجود کوشش کے اپنی مکر اسٹ نہ روک سکی شجورانی کی تعزید

کی طرح دونوں ہاتھ کرپہ رکھے کھڑی تھیں۔

پھر شجورانی میز پر استغبار اٹھا کر اپنے بستر پہ لیٹ گئیں۔ اور بنفشہ

بہت سوتج بیمار کے بعد سجاد بھائی کو انتہائی مختصر سا خط لکھا جس کے ہر لفظ پر

اور مصمومت کی تکی تھی اس میں سوائے گھر والوں کی خیر نیریت کے اور کوئی بات

تھی خط لکھ کر وہ شجورانی کو دکھانے کے لیے ان کے قریب آئی تو وہ بارے

کے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

آخر آپ کب بڑی ہوں گی بنفشہ باجی ؟

شجورانی نے کہا۔

بنفشہ نے ان کی بات نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ لگا ہوں سے دیکھا۔ میرا مطلب

ذہنی طور پر۔

شجر نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

بنفشہ خط ہاتھ میں تھامے شجر کی طرف چپ چاپ تکی رہی۔

کم از کم یہ تو سوتج یلجئے کہ آپ نے جس شخص کو خط لکھا ہے وہ میرا بڑا

شجر نے کہا۔

تو پھر ؟

بنفشہ نے پوچھا۔

مطلب یہ کہ سجاد بھائی کے بجائے اگر آپ کے منگیترا صاحب کوئی اور حضرت

تو میں جبین بھٹ کر خط پڑھتی۔

شجورانی نے اپنی بات کی مزید وضاحت کی۔

لیکن میں نے تو اس میں ایسی کوئی بات

کو بھی سہی۔ آخر شرم لیا، ادب بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔

شجورانی نے بنفشہ کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ بنفشہ نے سوچا ”شجورانی ادب لحاظ

اب سے ہو گئیں ؟“

اب آپ اس خط کو لفافے میں بند کیجئے۔ اس پرائیڈر میں لکھئے، کل یونیورسٹی جائیں

اس کو پوسٹ کر دیجئے گا۔

شجر نے کہا۔

تم نے خواہ مخواہ ہی یہ لفافے کا پکڑ رکھا بیسٹا سادا ایرو گرام ٹھیک تھا۔

بنفشہ نے کہا۔

اور ہنہ ! آپ بھی بس یونہی ہیں منگیترا کو ایرو گرام بھیجنا انتہائی غیررومانی

نہ ہے۔

شجر نے کہا۔

بنفشہ نے جبین کر منہ دوسری طرف کر لیا اور انگٹ ٹبل کے قریب چلی گئی۔

ایٹے لفافے میں بند کر کے، اس پرائیڈر میں لکھ کر اور شجورانی کے دیئے ہوئے خوبصورت

پیکٹا کر جب وہ مڑی تو شجورانی اخبار بیسنے پر دمکے بے خبر سو رہی تھیں۔

پھر دقت بڑی خاموشی سے گزرنے لگا۔ سجاد بھائی کے خطوط بڑی پابندی سے آتے

سہے کبھی اماں بیگم اور آبا میاں کے نام، کبھی شجورانی اور چھٹ باجی کے نام کہی اور گھر کے دوسرے افراد کے نام۔ خاموشی کے ابھی لمحات میں ایک بار پھر ہنسنے لگا۔
چھٹ باجی (چھوٹی باجی) — جو ایم اے کرنے کے بعد گھر میں ہی بیٹھی تھیں۔ اور من
بارے میں سوتلے سوتلے کر اماں بیگم دن رات ہولایا کرتی تھیں۔ کہ یا اللہ! یہ لڑکے کہ
اپنے گھر کی ہوگی؟ عمر گزرتی جا رہی ہے۔ کہیں سے کوئی رشتہ ہی نہیں آ رہا۔ کہیں لڑکی
بالوں میں چاندی کا کوئی تار نہ چمک اُٹھے۔ ابھی چھٹ باجی کے لیے کسی حیدر آبادی کا
کارشتہ آیا۔ اماں بیگم نے پھر مٹی چڑی اور ذات پات کا سوال اٹھایا۔ ابا میاں کا کہنا
تھا کہ اب ان سب باتوں کا زمانہ نہیں رہا۔ لڑکا شریعت میں ہے اور لائق بھی بڑے ا
خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ بغیر کسی ریت و لعل کے حامی بھر لو۔ مگر وہ اماں بیگم ہی کیا
لڑکے کا "پوسٹ مارٹم" کئے بغیر ہنسنے لگا۔ وہ تو اس چکر میں دن رات ایک
دے رہی تھیں۔ اور شجورانی اس فکر میں ڈوبی ہوئی تھی کہ کہیں اماں بیگم سوتلے ہی
نہ بھر لیں۔ حیدر آبادیوں کے بارے میں ان کی رائے کچھ اچھی نہیں تھی۔ آپا جان کے رشتہ
کے سلسلے میں دخل اندازی کرنے پر اماں بیگم نے اگرچہ انہیں خوب ڈانٹا ڈپٹا تھا اس
باوجود وہ چھٹ باجی کے معاملے میں بولنے سے باز نہ آئیں۔ چلتے پھرتے اماں بیگم سے
بات کہہ ہی گئیں۔

حیدر آبادیوں کے چکر میں نہ پڑیے۔ اماں بیگم ورنہ زندگی بھر اس چکر سے باہر نہ نکلا
تم کیوں ہر موقع پر میری اماں بن کے مجھے مشورہ دینے بیٹھ جاتی ہو؟

اماں بیگم نے ہنسنے لگا۔

آپ کو نہیں پتہ اماں بیگم! ان لوگوں کے یہاں بڑا لین دین ہوتا ہے۔

شجورانی نے اماں بیگم کی جھڑکی کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

اے! میں تو نفی بھی ہوں کچھ نہیں جانتی اور تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔
اماں بیگم چڑ کر بولیں۔

بس کہہ رہی ہوں اماں بیگم! یہ لوگ تو آپ کے بدن کی کھال کھینچ لیں گے تب
بھی ہی دھار دیں گے کہ ایسے لوگ! کچھ نہیں دیتے کچھ نہیں دیتے بڑے کجخوس لوگ! ہیں
شجورانی نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

یا میرے اللہ کیسی ڈھبیٹ لڑکی ہے۔ اس کے اوپر تو ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی اثر
ہی نہیں ہوتا۔

اماں بیگم نے اپنا سر پیٹ لیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی سکرا اسٹ روکی تھی
واہی اماں تو باوجود کوشش کے اپنی ہنسی نہ روک سکی تھیں۔

میں کہوں تو ایسی باتیں سن کہاں سے لے رہے؟ کتنا ہی چٹے چٹے ہاتھیں کو دگر اس
لڑکی کو ہمیشہ خیر ہو جاوے ہے۔ کہ کس کا رشتہ کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے۔

واہی اماں ہنس کر بولیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ لوگ چکے چکے باتیں کرتی ہی کیوں ہیں؟ شجورانی نے گز
بھر کی زبان چلا دی۔

اس بدتمیزی پر اماں بیگم کا بلڈ پریشر مائی نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ انہوں نے تنبیہی
لگا ہوں سے شجورانی کی طرف دکھا اور ڈپٹ کر بولیں۔

تم اٹھی ہو یہاں سے یا میں کو روں تم سے سوال وجواب؟

شجورانی نے بڑے اطمینان سے چپلیں ہنسیں اور سر سر کرتی اپنے کمرے کی طرف چل

گئی۔ وہاں شامت کی ماری بیچاری چھٹ باجی بیٹھی بنفشہ سے باتیں کر رہی تھیں۔
نے شرارت آمیز نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا اور بولی۔
اجی چھٹ باجی! کچھ سنیے بھی؟

چھٹ باجی نے صیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

اماں بیگم اور دادی اماں تمہارے کو حیدر آبادیوں میں دینے کی باتاں کرتے بیٹے
چھٹ باجی ابھی پوری طرح اس کی بات سمجھ بھی نہ پائی تھیں کہ شجوت نے مزید فرمایا۔
میرے کو کھٹے سالن بہوت اچھے لگتے جی! میرے واسطے بکھارے بیگم اور
”ڈبل کا میٹھا“ ضرور بھیجنا۔

کیا بکواس لگائی ہے؟

چھٹ باجی شجوت کو ڈانٹنے کے باوجود ہنسنے سے باز نہ رہ سکیں۔ ان کے قریب
بیٹھی بنفشہ بھی بے ساختہ ہنس دی۔

اور اپنے بیٹے کے جینے (حقیقتی) کے وقت (وقت) لٹیاں (لٹیاں) ضرور ہونا۔

شجوت نے اپنی بکواس جاری رکھی۔

شجوت کی بچی بائیں ماروں گی۔

چھٹ باجی اسے دھپ لگانے کو دوڑیں۔ تو وہ پھلانگ لگا کر کمرے سے باہر نکلی۔

حیدر آبادیوں کے ہاں بیٹھ جانا کی ناپسندیدگی قطعی کام نہ آئی۔ آخر وہ جین

کس کھیت کی سوا۔ جو ایسے معاملوں میں ان کی رائے کو کوئی اہمیت دی جاتی؟ اماں بیگم

نے جب اچھی طرح چھان چھانک کرنے کے بعد یہ اطمینان کر لیا کہ لڑکا ہر لحاظ سے موزوں

ہے تو انہوں نے چھٹ باجی کی مرضی معلوم کر کے حامی بھر لی۔ چھٹ باجی کو تو سرے سے

رشتے پر کوئی اعتراض ہی نہیں تھا۔ توصیف پاشا میں کوئی کمی ہوتی تو وہ ناک نہ بھی باتیں
یہاں تو عالم یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو توصیف پاشا کے مقابلے میں شکل و صورت
کے لحاظ سے کچھ کم ہی محسوس کر رہی تھیں۔ رنگ اور ناک نقشے دونوں ہی میدانوں میں توصیف
پاشا چھٹ باجی کو صاف صاف مات دے رہے تھے۔

شجوت رانی کے کان میں جب یہ بھونک پڑی کہ توصیف پاشا کا رشتہ منظور کر لیا گیا ہے
وہ انہوں نے غیر معمولی طور پر تنجید ہو کر چھٹ باجی کے مستقبل کے بارے میں غور و فکر
لانا شروع کر دیا۔ جب ان کے غور و فکر نے انہیں کسی نتیجے پر نہیں پہنچایا۔ تو وہ ٹہنسی ہوئی
ان بیگم کے کمرے کی طرف چل دیں۔ اماں بیگم، دادی اماں اور بڑی اماں سے جانے کس
ٹپے پر صلاح مشورے کر رہی تھیں۔ شجوت نے بھی دادی اماں کے برابر میں گھس گھسا کر اپنے بڑے بھائی
دادی اماں کسسا کر بولیں۔

پرسے ہٹ کے بیٹھ لڑکی! تو تو بچوں کی طرح میری گود میں گسی جا رہی ہے۔

میں بچی ہی تو ہوں دادی اماں۔

شجوت نے بڑے اطمینان سے کہا۔

اب اتنی نفی بھی نہیں ہے۔ کہ گود میں گھس کر بیٹھے۔

دادی اماں نے خود ہی ایک طرف کھٹکتے ہوئے کہا۔

شجوت رانی ان کی بات سن کر انہیں کرتے ہوئے اماں بیگم کی طرف دیکھ کر بولیں۔

اجی اماں بیگم! میں نے آپ حیدر آبادیوں کا رشتہ منظور کر لینے۔

دادی اماں اور بڑی اماں اکیدم ہنس پڑیں۔ اماں بیگم نے ہنسنے کے بعد اپنی

بہن روکی اور ذرا رعب سے بولیں۔

رشتہ منظور کیا یا نہیں کیا لیکن تم آخر ایسی باتوں میں دخل اندازی کیوں کرتی ہو؟ میں اس واسطے بولی کہ میرے کو یہ رشتہ پسند نہیں۔

شجوع نے اہتہائی مسجید کی سے کہا۔

تمہاری ناپسندیدگی سے کیا مطلب؟ تمہارے لیے تو نہیں منظور کیا گیا یہ رشتہ، اماں بیگم نے کہا۔

مجھے چھٹ باتی کے لئے یہ رشتہ منظور نہیں۔
شجوع نے کہا۔

جب اسے کوئی اعتراض نہیں تو تم کون ہوتی ہو؟

اچھا! انہوں نے منظور کر لیا۔ تب پھر کچھ کہنا سننا فضول ہے۔

شجوع نے اماں بیگم کی بات پر دس ہونے سے پہلے ہی کہا۔

تم ایسی باتوں میں دخل اندازی کرنے سے باز کیوں نہیں آتی؟
اماں بیگم چڑکھ کر بولیں۔

اس کے کانوں میں، ساری باتوں کی بھنک بڑی جلدی پڑ جاتی ہے۔

بڑی اماں نے مسکرا کر کہا۔

کن سوئیاں لینے کی تو پرانی عادت ہے اس کی۔

اماں بیگم نے کہا۔

اور شجوع رانی اس وقت ایسی اذیت ہو کر بیٹھی تھیں جیسے ذکر ان کا نہیں کسی

کا بورہا ہو۔ کچھ دیر تودہ خاموش بیٹھی رہیں پھر ایک دم بولیں۔

اماں بیگم آپ بھی عنایت بھانت کے دام و شال کر رہی ہیں۔ اپنے خاندان پر

اماں بیگم پھر کوئی سخت سست بات کہنے ہی والی تھیں کہ شجوع نے پھر اپنی ناک دناخت کرتے ہوئے کہا۔

ایک بیگم بی بی ہیں۔ دوسرے جہد رآیدی، اب میری شادی خدیجوں میں کر نیے گا۔ پھر تم نے بدلیزی شروع کی؟ اماں بیگم نے جھڑکا۔

بغشتہ باجی کا معاملہ اگر سجاو بھائی کے ساتھ نہ طے ہوا ہوتا۔ تو ان کی شادی انوں میں کر دیتیں۔

شجوع نے اماں بیگم کی جھڑکی کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات جاری رکھی۔

دیکھ رہی ہیں جیسا بھی جان آپ اس کی ڈھٹائی؟

اماں بیگم نے بڑی اماں کو مخاطب کیا۔

اور اس سے پہلے کہ بڑی اماں شجوع کے بارے میں کوئی رائے زنی کرتیں شجوع سے باہر نکل گئیں۔

پھر۔ شادی کی تیاریاں بڑے زور و شور سے شروع ہو گئیں۔ اماں بیگم نے

اماں اور چھوٹی چچی کے ساتھ مل کر جہیز کی تیاری میں دن رات ایک کر دیا۔ ایک بار

مارے عزیز و اقارب اور دوست احباب جمع ہوئے۔ شور و غوغا ہوا اماں

پہننے میں دو ایک منٹ بعد آجاؤں گی۔

پھر

جاد بھائی اس کی بات سمجھ کر مسکرائے اور اس کا سر تھپتھا کر باہر چلے گئے۔

جاد بھائی کمرے سے باہر نکلے تو بغشتہ نے اپنی پیکوں کے نیچے چلتے ہوئے

لوگوں کی ہوا دے کر بھجوا دیا اور بو جھل قدموں سے باہر نکل آئی۔

زیادہ ڈرا سے شجور سے لگتا تھا۔ کہیں وہ من کا چور نہ پکڑ لے اور اس کے بعد بڑھیا سے خوفزدہ تھی۔ وہ جو اپنے دل کی گہرائیوں کا اندازہ کسی کو نہیں ہونے دیتے تھے دیکھ کر دلی کیفیت کا اندازہ اس کے چہرے پر ایک سرسری نگاہ ڈال کر ہی لگا لیتے تھے۔ بنفشہ نے ان کا سامنا کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو راستہ رک کر کھڑے ہو جائیں۔ تنگمانہ انداز میں اپنے کمرے میں آنے کا حکم دے دیں اور پوچھ بیٹھیں۔

”بنفشہ! تم سجاد کی طرف سے نکر مند اور احساس تو نہیں ہو؟“

اس کے بعد ان کی طویل تسبیحیں، ان کے تسلی بھرے الفاظ اور ان سب سے بڑھ کر ان کا پیار بھرا لہجہ، محبت بھرا انداز اور — اور اس کے ساتھ ان لمحوں کا احساس — جب دل کا درد دھمٹ کر آنکھوں کے ساحل تک آئے۔ ساحل کو بھی پار کر جائے۔ خاموشیوں کا جہرم کھل جائے اور زبان سے سجاد بھائی کی محبت، ان کی پابست کا اقرار نہ ہونے کے باوجود اقرار ہو جائے، پھر ایسے میں وہ بڑھیا بے خوفزدہ نہ رہتی تو کیا کرتی۔

گھریوں اپنے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ کوشش ہمیشہ تو کامیاب سے ہمکنار نہیں کرتی۔ بنفشہ بڑھیا سے کتراتی رہی۔ پہنچتی رہی لیکن کب تک؟ ایک دوپہر — جب خاموشی اور چپ کا زہر ملا ناگ وقت کے لمحوں کو نگل رہا تھا۔ سب سوتے ہوئے تھے بے خبر، بے سدھ، بنفشہ براہِ مدے کی رینگ پر دو لڑکھنیاں نکلنے لگیں بولی کھڑی تھی۔ سوچوں میں ڈوبی ہوئی، خیالات میں کھوئی ہوئی — تو ایسے ہی میں بڑھیا سلسلے والے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ بنفشہ اپنے ہمسے ہوئے، دیکھے ہوئے بے چین اور بے قرار دل کو سمجھانے میں کچھ اتنی مصروف نہ تھی۔

ان کی آمد کی خبر ہی نہ ہوئی جب بڑھیا کے قدموں کی آواز قریب سے قریب آئی تو وہ بڑی طرح چونک گئی۔ اس نے سہم کر ان کی طرف دیکھا جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔ اس نے سوچا وہ بڑھیا کو وہیں چھوڑ کر اندر چلی جائے ایک دم فدا۔ باڈر کی کوئی راہ اس کے سامنے نہیں تھی۔ مارے کھڑا ہٹ کے وہ بڑھیا کو سلام لے بھول گئی۔ ایک بار ان کی طرف دیکھنے کے بعد نگاہیں جو جھکیں تو جھکی ہی رہ گئیں یوں کے سامنے رخساروں کی دھوپ میں کانپ کر رہ گئے، لرز کر رہ گئے۔

پھر — وہی — وہ نہ ہونا چاہیے غبار بڑھیا پوچھے، پھر نہ رہ سکے۔ بنفشہ نے ان کا جواب نہ مل میں دیا نہ ناں میں۔ سر جھٹکاٹے کھڑی رہی۔ خاموش، چپ، لگم لگم، بڑھیا کچھ دیر تو لمحوں کے گزرنے کی عمدہ سنتے رہے۔ پھر اس کو بھگانے اس کی ڈھارس میں بندھانے لگے۔ مگر ان کے محبت بھرے الفاظ، ان کا پیار بھرا ہنسنے کے مجرد دل کو اور دکھایا اور زخمی کر گیا۔ اس سے پہلے کہ آنکھوں سے برستے آنسوؤں کی برسات کا سماں بڑھیا دیکھتے بنفشہ رخ موڑ کر کھڑی ہوئی اور چلا گئی بڑھیا نے اسے باتے ہوئے دیکھا مگر نہ اسے آواز دی نہ اسے دیکھا ایک طویل سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

انہی دنوں بنفشہ اور شجور کا رزلٹ آگیا۔ بنفشہ سینکڑ ڈیڑھ میں پاس ہوئی تھی۔ پرنے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ بقول ”بڑبا“ ”بڑے آبا“ کے شجور نے کمال کر دیا۔ شجور ہر طرف سے داد و تحسین کے ڈنڈے برسے لگے۔ ہر طرف سے ان کے الفاظ، داد و کرات کی بارش ہونے لگی۔ شجور ان کی پیٹھ کچھ اتنی زیادہ جھکا گئی کہ اس کے ٹوٹے مہانے کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ شجور ان کو ایسے میں اپنے پیٹ سے

سے سجا دھیا بے انتہا یاد آئے۔ انہوں نے جانے کس آس کا سہارا لے کر اپنے
پھر ایک خط لکھا۔ مگر اس کے جواب میں وہی خاموش تھی۔

سجا دھیا کی اس بہان لیوا خاموشی نے ویسے ہی قیامت ڈھاکھی تھی مگر
ماتول بچھا بچھا اور افسردہ سا ہو کر رہ گیا تھا۔ ایسے ہی قیامت خیز لمحوں میں ایک
دوپہر حبیب ہوائیں ساکت تھیں، درخت سر جھکائے کھڑے تھے۔ اور دھوپ تیز
اور جھیلی تھی۔ دادا جان کی سنبھلتی ہوئی طبیعت ایک دم بگڑ گئی۔ ڈاکٹر صبح ہی انہیں

کر گیا تھا۔ اس نے نہ تو ان کی حالت نشوونما کی تھی۔ اور نہ ہی اس کے چہرے
پر ان کی بنض تھامتے وقت غیر مطمئن سی کیفیت تھی۔ کسی کے دم و گمان میں بھی نہ

کہ یہ جھجھلاتی ہوئی شمع دوبہر ڈھلنے تک آخری بار جھڑک کر ہمیشہ کے لیے بجو جا
گی مگر اس شمع کو اب سمجھ ہی جانا تھا۔ وہ تو اس نے بجھنے سے پہلے آخری سنبھا

لیا تھا۔ دادا جان کی طبیعت جس وقت بگڑی تو شیخو اور منصفان کے کمرے میں
موجود تھیں۔ دادا جان کے چہرے پر درد و کرب کے آثار نمایاں ہوئے تو دونوں

پریشان ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے شیخو رانی آبا میاں
کمرے کی طرف دوڑیں۔ آبا میاں جلدی جلدی ڈاکٹر کو فون کر کے ان کے کمرے میں

ذرا سی دیر میں سب کو خبر ہو گئی۔ پورا گھر ان کے کمرے میں جمع ہو گیا۔ ٹیکسی بھیا گاڑ
نکال کر خود ڈاکٹر کو لینے چل دیئے مگر ڈاکٹر کے پہنچنے سے چند منٹ قبل ہی رینس

زندگی کی کہانی ختم ہو گئی۔ افسانہ اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ فتوہ اور رمضانی پر گرجنے پر
والے دادا جان نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لیں۔ دادا کی آواز سب سے بڑی

ڈاکٹر لٹی "کا خطاب دینے والے دادا جان نے کسی سے کچھ کہے بغیر کسی کی کوئی

بغیر آنکھیں موند لیں۔ سلیمان بھائی کو انگریز کی اولاد کا خطاب دینے والے دادا
ایک دم خاموش ہو گئے۔ بڑھپا سمیت گھر کے سب بچوں کو انگریزی اخبار سٹلے
لتا میں پڑھنے کی نصیحتیں کرنے والے دادا جان مزید کوئی نصیحت کئے بغیر
گئے۔ ابدی نیند، گہری بہت گہری نیند۔

یہ تھا انجام گہوارے سے نکلنے کی زندگی کا۔
یہ تھا اس کہانی کا اختتام۔

یہ بغیر خط شجورانی کی طرف بڑھا دیا۔ شجور نے دادی اماں کو خط پڑھ کر سنانا دیا کیا۔

سجاد بھائی نے خط کیا لکھا تھا، ایک "معذرت نامہ" لکھا تھا، ایک کہانی مصرائی، دادی پرانی کہانی۔ جو برسوں سے پردیس جانے والے نوجوان دہراتے پہلے ہے تھے۔ ایک قصہ تحریر کیا تھا۔ وہی پرانا قصہ۔ جو حسین درنگین اور شوخ و بالبتلوں کی دلفریب اداؤں کے جہاں میں بھنس جانے والے نوجوان و درویش ہیں بڑے انظار کی طویل، صبر آنا کھن گھڑیوں کو گن گن کر گزارنے والے ماں باپ کو ککھ صبر کرتے ہیں۔

شجورانی ایک ایک کر دادی اماں کو خط سنا رہی ہیں اور دادی اماں کی حالت یہ نا کہ منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے، بالکل کارٹون بنی بیٹھی تھیں۔ عینک پسل کرناک لنگی پر گئی تھی۔ جس کا انہیں مطلق ہوش نہیں تھا۔ ان کی آنکھوں میں یقین اور بے یقینی کی کیفیت تھی اور شجورانی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ سجاد بھائی کا خط نہیں لکھی کہانی پڑھ رہی ہوں کوئی افسانہ پڑھ رہی ہوں۔ جھوٹی کہانی بے حقیقت افسانہ لایں سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے سے وقت اور زمانے کی حقیقتیں نہیں بدلا کرتیں۔ زانی کا دل اس بات کو ملنے پر آمادہ نہیں تھا کہ سجاد بھائی ایسی حرکت کے ترکب کرتے ہیں۔

پھر ایسا ہوا کہ ایک کے بعد ایک، گھر کے ہر فرد کو خیر ہو گئی کہ سجاد بھائی نے دلا کر لایا ہے۔ دل کے نہ چاہنے کے باوجود، دماغ کے اکادہ نہ ہونے کے باوجود اسے الفاظ پر یقین کرنا پڑا۔ سب اپنے اپنے چہرہ دل پر نگر و تردید اور رنج و غم کے

اور جب بے شمار ہفتے فکر، پریشانی اور رنج و غم کی نذر ہو گئے تو سجاد بھائی کا ایک مختصر سا خط اماں بیگم کے نام آیا۔ سجاد بھائی کی تحریر پر نظر پڑتی ہی اماں کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا۔ انہوں نے جلدی سے عینک لگا کر خط پڑھنا شروع کر دیا۔ خط کے ختام پر پہنچنے تک اماں بیگم کا چہرہ بے شمار رنگ بدل چکا تھا۔ قریب بیٹھی دادی اماں اور شجور بڑی حیرت سے ان بدلتے ہوئے رنگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کیا لکھا ہے سجاد نے؟ خیریت سے تو ہے؟ اتنے دنوں سے کوئی خط کیوں نہ لکھا؟ وجہ تو کبھی ہوگی!

دادی اماں نے ایک ہی سانس میں اتنے سارے سوال پوچھ ڈالے۔ اماں بیگم نے بڑی عجیب نگاہوں سے دادی اماں کی طرف دیکھا اور کوئی بار

جذبات لئے سوچتے رہ گئے۔ آبامیاں نے اپنے آپ کو ایک دم بہت کڑور سٹو
 کیا۔ دادی اماں کیوں لگا۔ جیسے ان کی زندگی کی آخری گھڑیوں میں سے ان گنت لمے
 ایک دم کم ہو گئے ہوں اور شجرہ کو اپنے سینے پر بھاری بوجھ کا احساس ہوا۔
 بنفشہ کو یہ تو ضرور بتا دیا گیا کہ سجاد بھائی کا خط آیا ہے۔ لیکن ان کی شادی کا فخر
 کو اس سے پوشیدہ رکھا گیا۔ ہر شخص بنفشہ کے سامنے اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے
 لگا۔ شجرہ نے اس سے لگا ہنس ملا کر بات کرنا چھوڑ دیا۔ لیکن یوں چپانے سے یہ بات
 چھپ نہ سکی۔ بنفشہ بھی آنکھیں رکتی تھیں۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ جس دن سے سجاد بھائی
 کا خط آیا ہے۔ گھر کا ماحول اجڑا اجڑا سا اور فضا دیران دیران سی ہے۔ اس اجڑے پن
 اور اس دیرانی کا سبب کچھ تو ہو گا۔ سب کے چہرہ پر کامرہا یا پرن پے وجہ تو نہیں ہو
 سکتا۔ ان سب پر مستزاد اماں بیگم کی طبیعت۔ جو اسی دن سے اچانک بگڑ گئی تھی۔
 بلڈ پریشر کی شکایت انہیں کئی سالوں سے تھی۔ اکثر ان کی طبیعت خراب ہو جایا کرتی تھی۔
 مگر اس سے پہلے کبھی ان کی طبیعت اتنی زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی۔
 بنفشہ نے نہ کسی سے کچھ پوچھا نہ اپنی زبان سے کسی بات کا اظہار کیا۔ چپ چاپ
 خاموش اور گرم مسم سی سب کچھ دیکھتی رہی اور سب کی نظروں سے چھپ کر دیران
 کونوں اور خاموش تنہائیوں میں آنسو بہاتی رہی۔ بنفشہ کی ہستی سب کے لئے قابلِ غم
 ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر شخص اس کی طرف محبت، ہمدردی اور رنج و غم کے طے بلے تاثرات
 کے ساتھ دیکھتا اور ایک دہی ہوئی سانس لے کر رہ جاتا۔ سجاد بھائی کی اس مہمل
 حرکت نے اماں بیگم کو دھڑلہ صدمہ پہنایا تھا۔ اگر بنفشہ کی سنگینی سجاد بھائی سے نہ ہوئی
 ہوتی۔ تو شاید اماں بیگم کے دل و دماغ پر سجاد بھائی کی شادی کا اتنا زیادہ اثر نہ ہوتا۔

غریب کے جی کو سلمان بھائی پہلے ہی ایک روگ لگا چکے تھے۔ اداساب سجاد بھائی
 لکے دل کو دوسل روگ لگانے کے سامان پیدا کر دیئے تھے۔
 بنفشہ اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی تھی لیکن اسے یہ اندازہ غمزدہ ہو گیا
 کہ ایسی ہی بات ہے جس کا تعلق سجاد بھائی کی ذات سے ہے۔ کرید کی عادت
 یہ بالکل نہیں تھی۔ اور پھر یہاں پر معاملہ بھی سجاد بھائی کا تھا۔ جو اس کے منگیتر تھے۔
 منت وہ اپنے آپ میں کیسے پیدا کرتی کہ ان کے بارے میں کسی سے کچھ پوچھ
 اتی جرأت وہ کہاں سے لاتی کہ سجاد بھائی کا ذکر وہ اپنی زبان سے کرتی مگر
 روز ایسا ہوا کہ رات کے کھانے کے بعد گھر کے سب ”بڑے“ آبامیاں کے
 میں جمع تھے۔ شجرہ رانی اس رات بغیر کھانا کھائے منہ سرسپیٹے پڑی تھیں۔ بہانہ
 درد کا بنایا تھا۔ لیکن اصل بات یہ تھی کہ اس روز صبح ہی سے انہیں سجاد بھائی پڑی
 سے یاد آ رہے تھے۔ اور اس سے کہیں زیادہ شدت سے انہیں سجاد بھائی پر
 اڑا تھا۔ بنفشہ کھانا کھانے کے بعد اکیلی ہی لان میں ٹہل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب
 پنہ کرے کی طرف جانے لگی تو آبامیاں کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے
 بابا کے منہ سے اپنا اور سجاد بھائی کا نام سُن کر ٹھٹھک گئی۔ باوجود کوشش
 لاہر رک کر پوری بات سننے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکی۔
 سننے کو بنفشہ نے ان لوگوں کی باتیں سن لیں لیکن پھر۔ اس کے لئے اپنے
 ہنس پینچنا دشوار ہو گیا۔ جب سے چھوٹے باجی کی شادی ہوئی تھی۔ بنفشہ کو ان
 دل گیا تھا۔ لیکن اسے اور شجرہ کو ایک ساتھ رہنے کی ایسی عادت پڑ گئی تھی کہ
 وہ اب بھی زیادہ تر وقت ایک ہی کمرے میں گزارتی تھیں۔ مگر اس وقت بنفشہ

ایک زخم کے بعد دوسرا زخم۔

ایک طوفان کے بعد دوسرا طوفان۔

یہ ہے تقدیر کی کہانی — میری تقدیر کی کہانی۔ یہ کہانی بھی ادھوری سی لیکن اب تک اس کہانی کے جتنے باب میں نے پڑھے ہیں اس میں سوائے رنج و غم اور شکست و ناکامی کے کچھ نہیں بیٹے ہوئے سارے لمے طوفانوں کی نذر ہونگے اور آنے والا وقت بھی حزن و یاس کے سوا اور کچھ نہ دے سکے گا۔

نصرت وار کسے سمجھوں؟ سیلمان بھائی کو؟ یا سجاد بھائی کو؟

بیچ تو یہ ہے کہ تصور واران دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ میری قسمت بلیہ دن دکھا رہی ہے انسان کی قسمت اس کی جھول میں کچھ نہ کچھ تو ڈالا ہی کرتی ہے چاہے خوش ہو یا غم۔ زندگی کی یہ ادھوری کہانی مکمل ہونے تک جانے کتنے طوفان اٹھیں گے؟ جانے کتنے حادثات میری راہ روک کر کھڑے ہوں گے؟ جانے کتنے آبلے

یرے پاؤں میں پڑیں گے؟ اور جانے کتنے زخم مجھے چلنے سے آگے قدم بڑھانے سے معذور کریں گے؟ میرا وجود تو ان لوگوں کے لئے ایک بوجھ بن کر رہ گیا ہے۔ بڑھ کر ساری زندگی اپنے کا ندھوں پر لا دکر کون چلتا ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو بنفشہ چوبک پڑی۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ اس کے پاؤں جیسے زمین پر جم کر رہ گئے۔ دستک دوبارہ ہوئی۔ تو وہ مشکل تمام دروازے تک آئی۔ دروازہ کھولتے

ی اسے تنجو کی حیرت زدہ نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بنفشہ واپس پلٹ کر اپنے بستر پر آگئی اور نگاہ ایک طرف سرکا کر بڑے بے جان انداز سے بیٹھ گئی۔ تنجو بہت آہستہ

بجائے تنجو کے کمرے میں جانے کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اور غم ہاں انداز سے بستر پر گر گئی۔ یہ کیسی ساعتیں تھیں؟ یہ کیسے لمے تھے؟ اس نے کچھ سوچنا چاہا تو ساتھ نہ دیا۔ رونہ چاہا تو آنکھوں نے ساتھ نہ دیا۔ اس کے احساسات برف کی سرد اور منجمد سے ہو گئے تھے۔ بے شمار لمے گزرن گئے۔ اور وہ چپ چاپ لیٹ کر اپنے دھڑکنے کی صدا سنتی رہی۔ کمرے کے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ اٹھ بیٹھ گئی۔ کمرے کا پردہ ہوا سے اڑا تو اس نے دیکھا رمضان اور دھڑکنے گزر رہا تھا وہ تو ڈر گئی تھی۔ کیسی تنجو نہ ہو۔ اگر ان لمحوں میں وہ یہاں آگئی۔ تو اس کی نگاہیں میرے چہرے پر پڑتے ہی دل پہ لکھی ہوئی تحریر کا ایک ایک لفظ پڑھ لیں گی۔ وہ اٹھ دروازے کے قریب آئی اور کچھ سوتل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ چند لمحوں کی کرسی کی پشت کا سہارا لئے کھڑی رہی۔ بہت اداس، بیزار اور ہنس مٹا رہی۔

قدم در پیچھے تک آکر ٹپک گئے۔ اور پھر۔ سوچوں کے در آہستہ سے غم وا ہو گئے۔ غم وا در کے اس پار اُمید کی جھلکتی ہوئی کرنیں اسے اندھیروں میں گم ہوتی ہوئی نظر آئیں۔ اسے اپنے ارد گرد بھڑکتے ہوئے شعلوں، تپتی ہوئی تیز و تند آندھیوں اور چنگھاڑتے ہوئے مہیب طوفانوں کا احساس ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے آسمان کی بلندیوں کو چھونے والے شعلوں کی سرخ سرخ زبانیں اس کے وجود کو چاٹ چاٹ کر ختم کر دیں گی۔ جیسے ان تیز و تند آندھیوں میں اس کا وجود تنکے کی مانند اڑ جائے گا۔ اور ان مہیب طوفانوں میں اس کی ہستی کا ٹٹماتا ہوا دیا آخری بار بھڑک کر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گا۔ اس نے بیٹے ہوئے لمحوں کی کہانی کو دھراتے ہوئے سوچا۔

ندروں سے اس کے قریب آئی۔ چند سیکنڈ تک بنفشہ کے چہرے پر نگاہیں چلے
چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر بہت آہستگی سے بول۔

کیا بات ہے بنفشہ باجی؟
کچھ نہیں۔

بنفشہ نے کہا لیکن اس کی چھکی ٹنگا ہیں اوپر نہ اٹھ سکیں۔
آج آپ اس کمرے میں سوئیں گی؟

شجوع نے پوچھا۔

معلوم نہیں۔

بنفشہ نے شجوع کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

”کیا مطلب؟“ شجوع نے چونک کر پوچھا۔

”فی الحال تو نیند نہیں آرہی“ بنفشہ نے کہا۔

”کیوں؟“ شجوع نے پوچھا۔

بنفشہ نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔

شجوع کا دل کسی خدشے سے دھڑک اٹھا۔ وہ بنفشہ کے قریب بیٹھ گئی اور

بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

اتنی چُپ چُپ کیوں بیٹھی ہیں؟

بنفشہ نے اتنی افسردہ نگاہوں سے شجوع کی طرف دیکھا کہ اس کا ہاتھ بنفشہ

کے شانے پر کانپ کر رہ گیا۔ اس نے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ بنفشہ باجی کو
بھی سہاؤ بھائی کی شادی کا علم ہو گیا ہو۔ اگر تیج تیج ایسا ہوا ہے تو یہ بہت بڑا ہوا

ناخبرہ بات چھپنے والی تو نہیں تھی۔ کبھی نہ کبھی تو بنفشہ باجی کو علم ہو ہی جاتا۔
کئی لمحے گزر گئے۔ خاموشی چپ چاپ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھی
ہو کرے کا ماحول بالکل مجدد سا ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر اس مجدد سی خاموشی کو بنفشہ نے
باد اور اپنے شانے پر رکھا ہوا شجوع کا ہاتھ تمام کر بولی۔

”شجوع! بات اگرچہ بہت تکلیف دہ ہے لیکن اس کے باوجود تم نے مجھ سے چھپا
یہ سنا تھا بہت زیادتی کی ہے“

”تو۔ اس کا مطلب ہے کہ بنفشہ باجی کو سچ سچ معلوم ہو گیا۔“

شجوع کا شبہ یقین میں بدل گیا۔ لیکن اس نے بنفشہ سے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکاٹے
روش بیٹھی رہی۔

”میں تو پہلے ہی اپنے مستقبل کے بارے میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھی۔“
شجوع نے کہا۔

”بنفشہ باجی!۔“ شجوع کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں؟“ بنفشہ نے کہا۔

”کیا کہوں۔ بنفشہ باجی؟ اتنا بے زبان تو میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی نہیں
ہو کیا تھا۔“ شجوع نے کہا۔

بنفشہ پکیں چھکاٹے بغیر اس کی طرف دیکھتی رہی۔

”ایک زخم آپ نے پہلے بھی کھایا تھا۔ جب میں آپ کو تسلیاں دینے اور

پ کو سمجھانے کی کوشش میں تھی۔ لیکن اب تو بات بالکل مختلف ہے۔ باوجود
شجوع کے مجھے الفاظ نہیں ملتے، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں؟

کیسے تہل دوں؟" شجوع نے کہا۔
 "شجوع! بات صرف میرے ہی دکھ کی تو نہیں۔ یہ تو ہمارا مشترکہ دکھ ہے۔"
 بنفشہ نے کہا۔

"آپ بیچ بکتی ہیں؟" شجوع نے تاسف سے کہا۔

"میں یہ سوچ کر پریشان ہوں کہ میری ذات کب تک تم لوگوں کے لئے ایک تکلیف دہ اور پریشان کن بوجھ بنی رہے گی؟ بنفشہ نے کہا۔
 "آپ ایسی باتیں کیوں سوچتی ہیں؟" شجوع نے شکایت آمیز نگاہوں سے بنفشہ کی طرف دیکھا۔

بنفشہ خاموش رہی۔ کئی سیکنڈ خاموشی سے گزر گئے۔ دونوں میں سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ اب کچھ کہنے سننے کے لئے رہ بھی کیا گیا تھا۔ اب تو صرف یہی رہ گئی تھیں۔ بکھری ہوئی سوچیں اور خیالات رہ گئے تھے۔ الجھے ہوئے خیالات۔ پریشان خیالات۔
 پھر بنفشہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلو، سونے ہیں، کافی رات گزر چکی ہے۔" اس نے کہا۔

"چلے۔" شجوع نے کہا اور دونوں تھکے تھکے قدموں سے شجوع کے کمرے کی طرف

چل دیں۔

اور اگلے روز شجوع نے اماں بیگم کو بتا دیا کہ بنفشہ باجی کو بھی صورت حال کا علم ہو گیا ہے۔ اماں بیگم نے شجوع کی طرف اس انداز سے دیکھا۔ جیسے انہیں شبہ ہو کہ شجوع نے ہی بنفشہ کو صورت حال سے آگاہ کیا ہے۔ شجوع نے ان کی آنکھوں میں شک

لا پر چھائیاں دیکھ کر اپنی پوزیشن فوراً صاف کر دی لیکن جانے کیوں؟
 لادل ایک دم بھرا آیا۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی اور دیر تک ٹیکوں میں پائے لیٹی رہی۔

دوپہر کے کھانے کے وقت سب نے محسوس کیا کہ بنفشہ کا چہرہ غیر معمولی طور پر داس تھا۔ باوجود کوشش کے وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ کھا سکی۔ سب اسے لے رہ گئے۔ لیکن وہ بھوک نہ ہونے کا بہانہ کر کے باہر برآمدے میں نکل گئی۔ اسے کی رینگ پر بھکتے ہوئے وہ بڑی اداس سی سوچوں میں کھو گئی۔ پھر اسے آیا کہ آج وہ صبح سے اماں بیگم کی مزاج پر کسی کے لئے نہیں گئی جب سے ان بیت خراب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر نے انہیں مکمل آرام کا مشورہ دیا تھا۔ ان کا کھانا اور نہ لچھی ان کے کمرے میں ہی پہنچایا جاتا تھا۔ بنفشہ نے ایک اندرہ سی نگاہ داماں کے کمرے کی طرف ڈالی۔ اور اماں بیگم کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہ کھانا کھا کر ان کے سہارے اپنے بستر پہ بیٹھی تھیں۔ بنفشہ پر نگاہ پڑتے ہی ان کی آنکھوں پانی بھر آیا۔ لیکن فوراً ہی انہوں نے آنکھیں صاف کرنے کے بہانے اپنے آپ کو اٹھائیں خشک کر لیں۔ بنفشہ ان کے قریب جا کر کھڑی ہوئی تو انہوں نے بڑی

بت سے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے پاس بٹھالیا۔

اماں بیگم کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بنفشہ نے سوچا۔

کتنی کمزور ہو گئی ہیں اماں بیگم! اسے پہلی بار ان کے چہرے پر بڑھاپے کے اثر نظر آئے۔

اولاد کا دکھ بھی کیا دکھ ہے؟ کس قدر تکلیف دہ اور کتنا جان لیوا، صرف

چند لمحوں میں ماں باپ کو بڑھاپے کی دہلیز پر لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ بس اس دکھ
محسوس کرنے کی دیر ہوتی ہے۔ اور اس دکھ کے احساس کا وہ پہلا لمحہ کس قدر بھاری
ہوتا ہے۔ اسے تو صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ جو درد کے اس جلنے مہرا میں
قدم رکھ چکے ہوں۔

بنفشتہ نے اماں بیگم کے چہرے سے نگا میں بٹا کر انتہائی اندر دگی سے یہ
سب کچھ سوچا اور مدھم آوازیں بولی۔

”اماں بیگم! آپ زیادہ سوچانہ کریں، اپنی صحت کا خیال رکھئے، ابھی تو
ہم سب کو قدم قدم پر آپ کی مزدورت ہے۔ خدا نہ کرے جو آپ کو کچھ ہو“
بنفشتہ کے منہ سے ایسی جنت بھری باتیں سن کر اماں بیگم کے ہاتھوں سے ہر
ضبط کا دامن چھوٹ گیا۔ انہوں نے دونوں ہاتھیں پھیلا کر بنفشتہ کو اپنے سینے
سے لگا لیا۔ اور والہانہ انداز سے اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے رو پڑیں۔
بنفشتہ نے ان کے آنسوؤں کو اپنے بالوں پر گرتے اور جذب ہوتے ہوئے غور
کیا۔ لیکن جانے اس وقت اس میں اتنا حوصلہ اور اتنا صبر کہاں سے آگیا تھا کہ
اس کی پلکیں تک نہ بھگیں، ورنہ اس کی آنکھیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھلکا اٹھتی
تھیں۔ ”ایک معصوم لڑکی کا صبر سمیٹ کر تو کبھی خوش نہیں رہ سکے گا سجاد!“
اماں بیگم نے دکھے ہوئے دل سے کہا۔

بنفشتہ کا دل کانپ کر رہ گیا۔ وہ تڑپ کر اماں بیگم کے سینے سے الگ
ہو گئی۔ اور انتظار بھرے ہنجور میں بولی۔
”ایسے نہ کہئے اماں بیگم“

”تمہیں اندازہ نہیں بنفشتہ بیٹی! سجاد کی اس حرکت نے میرے دل کو کتنی
بے چین کیا ہے؟“ اماں بیگم نے کہا۔

”اس میں ان کا کوئی قصور نہیں اماں بیگم! میری قسمت ہی ایسی ہے“ بنفشتہ
انظر میں جھکنا کر کہا۔

”اگر اُس نے تمہارے ساتھ منگنی نہ کی ہوتی تو مجھے اس کے شادی کرنے
کا زیادہ دکھ نہ ہوتا“ اماں بیگم نے کہا۔

”آپ میری وجہ سے پریشان ہو کر اپنی صحت خراب نہ کریں اماں بیگم“
بنفشتہ نے کہا۔

اماں بیگم نے کچھ نہیں کہا خاموش بیٹھی دوپٹے کے آپٹل سے آنسو روکنے
”میں تو خود اپنے آپ کو سب کے سامنے مجرم سامعوس کرتی ہوں“
بنفشتہ نے کہا۔

”تم ایسی باتیں کر کے میرے دل کو تکلیف نہ پہنچاؤ بنفشتہ! تمہیں کیا معلوم
تم جیسی نیک اور سعادت مند لڑکی کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھ کریں کتنا
محسوس کرتی“ اماں بیگم کی آنکھیں ایک بار پھر جھپک پڑیں۔

بنفشتہ سر جھکائے فرش پر نظریں جمائے بیٹھی رہی۔
”تمہاری قدر نہ کر کے سجاد کو زندگی میں کبھی نہ کبھی ضرور بچھتا نا پڑے گا“
اماں بیگم نے تاسف سے کہا۔

بنفشتہ پھر بھی اسی طرح بیٹھی رہی۔
وہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ تم جیسی خوبصورت اور خوب سیرت لڑکی

اس کی بیوی بیتی " اماں بیگم نے کہا۔

بنفشتہ نے ایک لمحے کے لئے ان کی طرف دیکھا اور جانے کیا سوچنے لگا۔
 "تم میں کسی بات کی کمی نہیں، انشاء اللہ تمہیں اس سے ہزار درجہ اچھا شریک
 زندگی ملے گا۔ تم غم نہ کرو خدا تمہاری قسمت اچھی کرے گا۔"
 اماں بیگم نے صدقِ دل سے کہا۔

اور۔ اس لمحہ۔ بنفشتہ جواب تک جانے کس طرح ضبط کئے بیٹھی تھی۔
 ہر بندھن سے آزاد ہو گئی۔ اس نے بڑی حسرتناک نگاہوں سے اماں بیگم کی طرف
 دیکھا۔ اور بڑی آہستگی سے بولی۔

"اماں بیگم! یہ دعائیں میرے لئے نہیں، جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ یہ
 دعائیں میرا مقدر نہیں بدل سکیں گی۔"

پھر آنسو اس کی آنکھوں میں برسات کی گھٹاؤں کی طرح اُمڈ کر آئے۔ اس نے
 اماں بیگم کے شانے پر بڑی آہستگی سے سر رکھا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بنفشتہ کی زندگی میں دکھوں کی کچی پہلے بھی نہیں تھی۔ لیکن اب۔ سچا دھبائی
 کے انقوں سے اپنا دامن چھڑا کر اس کے دل کو ایک اور دروگ لگا گئے تھے۔
 نے آگے بڑھتے ہوئے اسے ایک اور ٹھوکر لگا کر دیا تھا۔ دوسری ٹھوکر پہلی
 ریلان بنائی کے جھوٹے وعدوں نے لگا کر دیا تھا۔ جب منزل کی جستجو میں قدم آگے
 دیا۔ تو ٹھوکر لگا ہی کرتی ہیں۔ لیکن ہر ٹھوکر کی تکلیف یکساں نہیں ہوتی۔
 اور دکھ احساس بہت معمولی سا ہوتا ہے اور کبھی بہت شدید کبھی کبھی یہ ٹھوکریں
 ہر لذت سے بھی آشنا کرتی ہیں۔ اور زخموں کو اگر مرہم نہ ملے تو وہ ناسور بن
 تے ہیں۔ رستے ہوئے ناسور۔

بنفشتہ نے جب پہلی بار ٹھوکر کھائی تو اسے دکھ ضرور ہوا۔ لیکن جانے کیوں

وہ دکھ شدت نہ اختیار کر سکا۔ لیکن یہ دوسری ٹھوکر اس کی روح تک کو زخمی نہ گئی۔ اگرچہ یہ بے بسی تھا کہ سچا بھائی کی اور اس کی طویل ملاقاتیں نہیں ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کا ساتھ زندگی بھر نبھانے کے لئے نہ تو سر ہاکی تنگ اور حسی چاندنی راتوں کا سہارا لیا تھا نہ درختوں کی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں میں محبت کے لمحات بتائے تھے اور نہ چاند تاروں کو اپنی محبت کا گواہ بنایا تھا۔ بس اپنا مختصر سی ملاقاتیں تھیں اور کچھ باتیں تھیں۔ سیدھی سادھی باتیں سچا بھائی بڑا سچا سے اپنے دل کے نال خانے میں جھلملاتی ہوئی شمع کی مدھم مدھم روشنی میں اچھا اور بہت اچانک بے نقاب ہوئے اور ہنشتہ نے اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے نیچر کو سمجھنے دیکھا۔ بڑی خاموشی سے اور بڑی تیزی سے ہنشتہ کی زندگی میں وہ لمحات کسی حادثے سے کم نہیں تھے۔ وہ گھبرائی، پریشان ہوئی، حیران ہوئی، گر گھبراہٹ پریشان ہونے اور حیران ہونے سے اُن لمحوں کی حقیقت نہ بدل سکی۔ وہ اس مادہ کو اپنی زندگی میں آنے سے نہ روک سکی۔

وہ لمحات مختصر تھے۔ بہت مختصر۔

وہ ملاقاتیں بھی مختصر تھیں۔

اور وہ باتیں بھی مختصر تھیں۔

لیکن اس کے باوجود اُن سب کی اہمیت اپنی جگہ پر تھی۔

کبھی کبھی ایسا ہوا ہی کہتا ہے کہ ایک مختصر سالحہ، ایک چھوٹی سی ملاقات اور چند باتیں فقط چند باتیں، دل و دماغ پر ایک نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ بہت گراں قدر اور دیر پا نقش۔ ہنشتہ کی زندگی میں بھی وہ لمحات آئے اور گزر گئے۔ وقت گزرا

نیا دین باقی رہ گئیں، وہ باتیں اور وہ ملاقاتیں خواب ہو گئیں۔ لیکن نقش باقی گئے۔ اُلجھے ہوئے خیالات باقی رہ گئے۔ اور بکھری ہوئی سرسبز باقی رہ گئیں۔ شب و روز بڑی خاموشی اور بڑی بے کیفی سے گزرنے لگے۔ بڑھتی آن دنوں نے کس کام کے سلسلے میں لاہور گئے ہوئے تھے۔ ہنشتہ نے انہیں بڑی شدت یاد کیا۔ وہ۔ جو اس کے سب سے بڑے غم خوار اور غمگسار تھے، جن کی پیار باتیں ہر موقع پر اس کے زخموں کے لئے مرہم کا کام انجام دیتی تھیں، اس سے دور تھے۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا ابھری۔

غیب بھائی! آپ کہاں ہیں؟ اب۔ جبکہ پچھلے تمام لمحوں کے مقابلے میں آپ کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ تو آپ مجھ سے دور ہیں۔ دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس صدا کی بازگشت ہنشتہ کو دیر تک سنا دیتی تھی۔ اس نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا دل دماغ ذہن سب اس کے اختیار سے باہر ہو چکے تھے۔ وہ کس کس کو سمجھاتی؟ دل کو نے کی کوشش کرتی تو وہ سک اٹھتا۔ اور ذہن کو سمجھاتی تو وہ باغی آتا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسے لمحات بھی گئے۔ جب وہ اپنے آپ کو اس قدر مجبور اور اتنا بے بس محسوس کرے گی۔

دوسری منزل پہ بڑی آماں کے کمرے کے سامنے والی بالکونی میں ٹھہرے ہوئے اس نے بڑی اداسی سے پچھلے لمحوں کے بارے میں اُن لمحوں کے بارے میں۔ جو اسے کچھ سوگنا تیں دیکر اور اس سے بہت زیادہ کپٹے گئے تھے۔ سکون اور چین کی دولت کے بدلے اسے رنج و غم کی

سوغاتیں ملی تھیں۔ دھندلوں کی دیہڑتوں کے پیچھے چھپ جانے والے لمحات اگرچہ اسے تہی دامن نہیں کر گئے تھے۔ لیکن یادوں کی مرجھاتی ہوئی کھیلوں کے سوا کچھ اور دیکر بھی نہیں گئے تھے۔ یادوں کی ان کھیلوں کو چنتے ہوئے بنفشہ کی پتکوں پر ستارے چمک اٹھے۔ اس نے بالکونی کی ریبنگ پر دونوں کھنیاں ٹکا جھکتے ہوئے سوچا۔ گزرے لمحے، بیتی باتیں اور ادھو سے خواب ہمیں سلا دکھ کے اور کچھ نہیں دیتے، پیچھے سرک جانے والے لمحے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ بیستی باتیں خواب ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور ادھو سے خواب نہ کچھ ہوتے ہیں نہ ان کی تعبیریں ملا کرتی ہیں۔ پھر بھی اُن لمحوں، اُن باتوں اور اُن خوابوں کا تصور، اُن کا خیال ہمارے دل و دماغ سے جدا نہیں ہوتا، آخر ہم لوگ سیلوں کا تعاقب کیوں کرتے ہیں؟

بنفشہ کا پریشان ذہن جھٹک گیا۔ کوشش کے باوجود وہ اپنی آنکھوں کو ماضی کے بھروں میں جھانکنے سے باز نہ رکھ سکی بے شمار ساعتیں دبے پاؤں گزر گئیں۔ اور جب وہ چونکی تو رات کی ہانہیں کچھ اور پھیل گئی تھیں نیچے سے چمکدار سڑک پر سواریوں کی آمد و رفت کم ہو گئی تھی۔ گاڑیوں اور سکوتروں کا شور جیسے تمس سا گیا تھا۔ درختوں سے گھری ہوئی خاموش سڑک پر ایک تار چھ سواریاں بٹھلے بڑی سست رفتاری سے جا رہا تھا۔ گھوڑے کے پاؤں اور تانگے والے کی ٹخ ٹخ کی آواز خاموشی کو جھنجھوڑتی ہوئی سنائی دے رہی تھی۔ اسے ایم سی کے ہسپتال کی سفید عمارت سر اٹھائے آسمان کی بلندیوں تک رہی تھی۔ ہسپتال کا چوکیدار تھک کر برآمدے میں بیٹھی ہوئی، پنج پر تھک

نہا اور اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے زور زور سے کھانسی رہا تھا۔ ہسپتال کے احاطے میں لگے ہوئے درختوں کے سائے سفید دیوار پر آہستہ آہستہ سرسرا رہے تھے۔ گھنے درختوں میں چھپی ہوئی گورنمنٹ اسکول کی وسیع عمارت لمحہ بہ لمحہ تاریکیوں میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ اور سڑک کے دونوں جانب چلتے ہوئے بلوں کی زرد روشنیاں بڑی خاموشی سے اندھیرا لگاتار بک کر رہی تھیں۔ زینے میں کسی کے قدموں کی آواز بلند ہوئی۔ بنفشہ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بڑی اماں اپنے بھاری بھر کم وجود کو سنبھالے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہی تھیں۔

بنفشہ نے سوچا۔ شاید گھر والوں کی میٹنگ ختم ہو گئی۔ جیسی بڑی اماں اوپر آ رہی ہیں۔ اب وہ مجھ سے یہاں تنہا کھڑے رہنے کا سبب ضرور پوچھیں گی۔ اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑے گا۔ اس سے پہلے کہ بڑی اماں کی نظر اس پر پڑتی وہ جلدی سے بڑبا کے کمرے میں گھس گئی اور ان کی مینے پر سے کتاب اٹھا کر اس کے ورق اٹھنے لگی۔ جب بڑی اماں اپنے کمرے میں چلی گئیں تو وہ دبے قدموں سے زینے کی طرف بڑھ گئی۔ اور بڑی آہستگی سے نیچے اترنے لگی۔

لگے روز۔ آہستہ آہستہ ڈھلتی ہوئی شام کے اداس لمحوں میں جب بڑی خاموشی تھی اور بڑی تنہائی، بنفشہ، دادا جان کے کمرے کی کھڑکی کے پاس ٹھہری چھوٹی بچی کی بیٹی شیجو کو رنگیں تکی کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور بڑی بے چینی سے شیجو کے سوکر اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ شیجو کو جب سے

ڈیپارٹمنٹ میں یکچہرہ شپ ملی تھی۔ اس کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ دوپہر کو یونیورسٹی سے واپس آکر کھانا کھاتے ہی وہ اپنے بستر پر دراز ہو جاتی تھی۔ نہ جانے کوئی کونسی کتابیں پڑھنے پڑھتے جب شام ہو جاتی تو وہ چادر تان کر سو جاتی اور منظر کے وقت تک سوئی رہتی۔

شجر، اب وہ پہلی سی شجرہ نہیں رہی تھی۔ سچا دھبائی سے بالکل غیر متوقع طور پر جو حرکت سرزد ہوئی تھی۔ اس نے اگر ایک طرف بنفشہ کے دل کو پامال کیا تھا تو دوسری طرف شجرہ کو بالکل کم سن بن کر رکھ دیا تھا۔ اب اس کے ہونٹوں سے بات بے بات کہتے بھی نہیں پھوٹتے تھے۔ اور بنفشہ ان سب باتوں کا ذمہ دار اپنے آپ کو مٹھراتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ وہ اس گھر میں آئی نہ ان لوگوں کو دکھ کیے دن دیکھنے پڑتے۔

اس وقت بھی بنفشہ کی نگاہیں یوں تو شجرہ بٹیا کا تعاقب کر رہی تھیں لیکن دماغ مال کے چہرے پر سے ماضی کی گرد بھاڑ رہا تھا۔ بھلا کہ اس آخری شام کو شجرہ کے گھر آنے سے آج کی شام تک کے لحاظ میں ایک کمانی بچھی ہوئی تھی۔ ایک طویل کہانی، ایک افسانہ پوشیدہ تھا۔ دروہرا افسانہ، بیتی گھر ٹیوں کے دامن سے یادوں کے موتی پختے ہوئے بنفشہ اپنے ارد گرد کے ماحول سے بے خبر ہو گئی۔ وہ تو جب گیٹ کے سامنے ٹیکسی آکر رک کی تراس کے خیالات منتشر ہو کر رہ گئے۔ چند سیکنڈ بعد متعجب بھائی (بڑھپتیا) سوٹ کیس ہاتھ میں تھامے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ لاہور کی آب و ہوا میں ان کی صحت کچھ اور شاندار

ملی تھی۔ ان کا سائلا چہرہ سرخی کی تمازت سے تھرا رہا تھا۔ اور چہرے کے بسورت نقوش کچھ اور نمایاں ہو گئے تھے۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی ان کی نگاہوں نے بنفشہ کو ڈھونڈ لیا۔ ان کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ ان دوسرے ہی لمحے وہ کچھ بچہ سے گئے۔ کچلائی ہوئی شام کی خاموشیوں اور نائیوں میں وہ انہیں بڑی اداس، زرد اور بیمار سی لگی۔ انہوں نے افسردگی سے سوچا۔

اس لڑکی کو کھٹ کھٹ کے رہنے کی عادت پڑ گئی ہے۔

بنفشہ کے زرد، بیمار چہرے پہ نظریں جمائے وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کے قریب آ گئے۔ بنفشہ کی نگاہیں بھی انہی کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ قریب آئے تو بنفشہ مسکرائی لیکن یوں جیسے سک اٹھی ہو۔ بڑھپتیا حیرت زدہ سے ان کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ بنفشہ کے چہرے پر سوگوار کی کاہ انداز، یہ روپ سے پہلے انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ بنفشہ نے آہستہ آواز میں انہیں مہیا کیا۔ بڑھپتیا نے سر کے خیف سے اشارے سے جواب دیا۔ اور اس سے بے کمرے میں آنے کے لئے کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ بنفشہ سر جھکائے ان کے پیچھے چلی، سوٹ کیس ایک طرف رکھ کر بڑھپتیا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑی گہری نگاہ سے یوں — جیسے اسی ایک نگاہ میں وہ اس دل کی خاموش گہرائیوں تک میں جھانک لیں گے۔ بنفشہ کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ ردل بڑی دور سے دھڑک اٹھا۔ بڑھپتیا نے ایک ہاتھ سے اپنے بچہ سے ہونے لگا کو سیٹھتے ہوئے کہا۔

میں سب گھر والوں کے پاس حاضری دے آؤں، تم یہیں بیٹھ کر میسٹر
انتظار کرو۔

دوسرے ہی لمحے وہ اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کمرے سے باہر
نکل گئے۔ بنفشہ نے پلٹ کر انہیں کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھا اور آگے
بڑھ کر کمرے کے در پہچے کھول دیئے۔ رخصت ہوتی ہوئی شام کی ہوا کا ایک
جھونکا پردوں سے الجھتا، ٹکراتا کمرے میں گھس آیا۔ اور چنبیل کی منہ بند کیوں کی
الہی سی سنگدھ کمرے کی فضا میں بکھر گئی۔ بنفشہ چند سیکنڈ صوفے کی پشت کا
سہارا لئے سر جھکائے کھڑی رہی پھر تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر بیٹھ گئی
اور ان لمحوں کا تصور کرنے لگی۔ جب بڑھیا اس کے کچھ نہ کہنے کے باوجود سب
کچھ جان لیں گے۔ دل کا درد روح کے زخم اور ذہن کی ٹھکن۔ کچھ بھی ان سے
پوشیدہ نہیں رہے گا۔ وہ اس درد اور اس ٹھکن کا سبب ضرور جاننا چاہیں
گے۔ وہ ان سے چھپانے کے باوجود کچھ نہ چھپا سکے گی پھر۔ پھر۔ وہ کیا کرے
اس نے سوچا۔ اس کا دل چاہا وہ ایک دم اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگ جائے،
کسی ایسی جگہ چھپ جائے جہاں تک شعیب بھائی کی نگاہیں نہ پہنچ سکیں اور
اسے ڈھونڈ نہ سکیں۔ اس تک پہنچ نہ سکیں۔ اس سے کچھ پوچھ نہ سکیں۔
اور اس سے کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔ لیکن دل چاہنے کے باوجود وہ ایسا نہیں کر
سکتی تھی۔ بالکل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی۔ بیٹھی رہی۔
چپ چاپ، خاموش، سوچوں میں ڈوبی ہوئی، خیالات میں الجھی ہوئی اور اندھیرے
بڑھنے والی آہستگی سے کمرے میں سرک آئے۔

اور جب۔۔۔ بڑھیا کمرے میں واپس آئے تو در پہچوں کی راہ سے کمرے
ن آتی ہوئی مدھم سی روشنیوں میں بنفشہ نے دیکھا۔ بڑھیا کی آنکھوں میں رنج و
نم اور نگر و تردد کے سائے ہوئے ہوئے کا منہ رہے تھے۔ لیکن اگلے ہی
لمحوں میں انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

دو قدم آگے بڑھ کر انہوں نے کمرے کی تہی جلاتے ہوئے کہا۔
”اندھیرے میں کیوں بیٹھی ہو؟ لائٹ آن نہیں کر سکتی تھیں؟“
”مجھے خیال ہی نہیں رہا“ بنفشہ نے کہا۔

”اندھیرے میں رہنے کی عادی ہو گئی ہو؟“ بڑھیا نے کہا۔
”معلوم نہیں“ بنفشہ نے کہا۔

بڑھیا نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اس کے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔
چند سیکنڈ تک کمرے میں خاموشی رہی۔ پھر بڑھیا نے اس خاموشی کو توڑا۔
”اتنی خاموش کیوں ہو؟ کچھ اپنی کہو، کچھ میری سنو۔“
”میرے پاس تو کہنے کے لئے کوئی بات نہیں۔ ہاں! آپ کی بے شک سن
سکتی ہوں۔“

بنفشہ نے ان کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔
”بچہ کتنی ہو؟“ بڑھیا کا انداز بڑا عجیب سا تھا۔
بنفشہ خاموش رہی۔

”اور کوئی خاص بات میری غیر موجودگی میں؟“ بڑھیا نے پوچھا۔
”کوئی خاص بات نہیں۔“ بنفشہ نے کہا۔ لیکن اس کا دل تھا کہ اس

لحے چیخ و چیخ کر کہہ دینا چاہتا تھا۔ شعیب بھائی! ہاں! آپ کی عدم برکت میں بہت کچھ ہو گیا۔ میری موبوم آس نے بھی دم توڑ دیا۔ میرا ذہنی سکون چھن گیا۔ میرے دل کا چین ختم ہو گیا۔ آپ تو کہتے تھے اب آپ میری طرف سے مطمئن ہیں، میری قدر سجاد بھائی سے زیادہ کوئی نہیں کر سکتا۔ پھر اب یہ سب کچھ کیوں ہو گیا؟ کیسے ہو گیا؟

لیکن بنفشہ یہ — ساری باتیں صرف سوچ کر رہ گئی۔ زبان سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ تو ان لڑکیوں میں سے تھی جو ساری زندگی سوچوں کے اتھاہ و عین سمندر میں ڈوب ڈوب کر ابھرتی اور ابھرا بھر کر ڈوبتی رہتی ہیں ان کا دل تو بہت کچھ کھنا چاہتا ہے مگر ان کی ہمتوں کی پستی الفاظ کو زبان تک آنے کی مہلت ہی نہیں دیتی۔

بنفشہ نے سوچا — میں یہ تمام باتیں شعیب بھائی سے کیوں کہوں؟ اگر میری راہ میں قدم قدم پر کانٹے کھرے ہیں تو قصور وار شعیب بھائی تو نہیں۔ اگر زندگی میں میرے لئے زخموں کے انبار ہیں تو اس کے ذمہ وار شعیب بھائی تو نہیں، یہ شب تو قسمت کے کھیل ہیں — تقدیر کے کھیل ہیں اور میری تقدیر بنانے والے شعیب بھائی نہیں، پھر مجھے ان سے فریاد کرنے کا کیا حق پہنچتا ہے۔

بڑھیا، بنفشہ کے چہرے پر تنگا میں ہمائے اس کے بولنے کے منظر تھے۔ لیکن بنفشہ بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اُن لمحوں میں اسے اپنے دل کی ملکیت کا احساس اتنی شدت سے ہوا تھا کہ کوشش کے باوجود وہ اپنی پٹکیوں کی

پٹمن کے نیچے چراغوں کو جھلکانے سے نہ روک سکی اپنے آنسوؤں کو بڑھیا کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش میں اس نے اپنے نرم دھاڑک ہونٹوں کو بڑی بے رحمی سے دانتوں تلے بیچ لیا۔ لیکن آنسو پھر بھی تقم نہ سکے۔ ہونٹوں کے گوشے آہستہ سے کانپنے، پٹکیوں کے سائے دھیرے سے لڑاٹھے۔ اس کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں پکڑ کر بیچھن دیا۔

بڑھیا — جو مسلسل اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے، اپنی جگہ سے اُٹھے چند سیکنڈ اس کے سامنے کھڑے رہے پھر اس کے برابر میں بیٹھ گئے۔ انہوں نے بے حد آہستگی اور نرمی سے بنفشہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ اور مدھم آواز میں بولے۔
”تم مجھ سے سب کچھ کہہ کیوں نہیں دیتیں؟“

”کوئی بات ہو تو کہوں بھی“ بنفشہ نے ان کی طرف دیکھ کر بغیر کہا۔
”جب کوئی بات نہیں تو پھر یہ آنسو؟“ بڑھیا نے اس کا سر اپنی طرف گھمایا۔ بنفشہ نے اپنی شہمی آنکھوں سے بس صرف ایک سیکنڈ کے لئے ان کی طرف دیکھا۔ بڑھیا کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی اور دوسرے ہی لمحے بنفشہ ان کے شانے پر سر رکھ کر رو پڑی۔ اتنی سسکیاں اور اتنے آنسو کہ — کو بڑھیا کا دل کانپ کر رہ گیا۔ انہیں ایسا لگا جیسے ان سسکیوں میں بنفشہ کا کانپنا اور لڑنا تھا اور وجود ڈوب کر رہ جائے گا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے اب جو یہ بادل برسے ہیں تو سدا برتنے ہی رہیں گے۔ اور بنفشہ کی ہمتی آنسوؤں کے اس سیلاب میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے کھو جائے گی۔
بنفشہ سسک سسک کر روتی رہی اور بڑھیا اس کے شانے پر ہاتھ رکھے

بیٹھے رہے۔ بالکل خاموش اور چپ چاپ، کیسے عجیب سے لمحات تھے۔ ہا نہیں بھلا کر اگے بڑھتی ہوئی رات کے قدموں کی مدھم سی چاپ، درتپکے کی راہ سے کمرے میں بکھری ہوئی پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو، طلوع ہوتے ہوئے چاند کی زرد، بیمار روشنی، جھللاتے نئے ستاروں کا خاموش کارواں، کمرے کا پرسکوت ماحول اور۔۔۔ ماحول کے اس سکوت کو توڑتی ہوئی بنفشہ کی سسکیوں کی آواز۔ بڑھتی کا دل دکھ سے بھر گیا۔ انہیں احساس ہوا کہ اتنے تکلیف دہ لمحات ان کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ انہوں نے بنفشہ سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کو بھی نہیں پونچھا۔ وہ چاہتے تھے بنفشہ جی بھر کے روئے اتنا روئے، کما س کے دل کا سارا درد آنسوؤں کی راہ بہ نکلی، پھر اس کے بے چین دل کو قرار آ جائے اور اس کا دماغ پرسکون ہو جائے۔

بنفشہ جب جی بھر کے روچکی تو بڑھتی آنکھوں سے جھک کر اس کی طرف دیکھا اور بہت سے بولے۔

”خدا کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے بنفشہ! معلوم نہیں غم کے ان پردوں کے پیچھے کون سی غرضیاں تجاری منتظر ہیں“

بنفشہ نے بڑھتی آنکھوں کے شانے سے سر اٹھا کر ان کی طرف بڑی جبریت سے دیکھا۔ زبان سے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی نگاہوں میں ایک سوال تھا۔

”تو کیا آپ کو یسوع مسیح حقیقت کا علم ہو گیا؟“

بڑھتی نے اس کی نگاہوں کا معنوم سمجھتے ہوئے کہا۔

”ہماری امی پیٹ کی بہت اگلی ہیں۔ دیے ایک طرح سے ان کی یہ عادت ہے

لے نامزدہ مند ہی ثابت ہوئی۔ جو بات میں تم سے ایک گھنٹہ میں بھی نہ پوچھ سکتا وہ انہوں نے چند منٹ میں ہی مجھے بتا دی“

بنفشہ نے صوفے کی پشت سے سر اٹھاتے ہوئے بڑی دیران نگاہوں سے درتپکے سے جھانکتے ہوئے ستاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھا۔ کمرے میں پھر پہلے ہی جیسا سکوت طاری ہو گیا۔ لیکن اب سکوت میں بنفشہ کی سسکیوں کی صدا نہیں بھر رہی تھی۔ وہ جی چپ تھی۔ اور بڑھتی بھی خاموش! دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھیں۔ اور وقت بڑی آہستگی سے گزر رہا تھا۔

پھر۔۔۔ بڑھتی نے اپنے مخصوص انداز میں بنفشہ کو بے شمار نصیحتیں کر ڈالیں۔ بڑھتی کا وہ پیار بھرا انداز تو بنفشہ کے دل کو اور بھی زخمی کر گیا۔ اتنی چاہت اور تکی محبت سے کہی ہوئی باتیں۔ بنفشہ پر دہلے بست بھاری گزری۔ درود دل لہ ہونے کی بجائے اور بڑھ گیا۔ ستارے سر ترگاں چمکنے کے لئے پھر بے تاب ہو گئے چراغ آنکھوں میں جھللانے کے لئے پھر بے چین ہو گئے۔ کوشش تو اس نے بہت کی لیکن نہ وہ ستاروں کو چمکنے سے روک سکی۔ نہ چراغوں کو آنکھوں میں جھللانے سے روک سکی اور بڑھتی دیر تک بیٹھے اس کی آنکھوں اور اس کی پلکوں پہ دیوالی لرات کا سماں دیکھتے رہے۔

بنفشتہ بھی چپ چاپ وقت کے گزرنے کا سماں دیکھ رہی تھی اس کا ماضی —
 یادوں کے اجر طے ہوئے سنسان اور میران نگہ کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حال — یقین
 اور بے یقینی کی ایک ایسی کمانی کٹا ہوا معلوم ہوتا تھا جس کے انجام کا کچھ پتہ نہیں تھا —
 مستقبل — ایک تاریک خلا کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس کے اعصاب مضبوط تو کبھی
 بھی نہیں تھے۔ لیکن گزشتہ چند برسوں میں دوسروں کی منزل کو اپنی منزل سمجھ کر دو دفعہ اس
 نے جس انداز سے فریب کھایا تھا، اس نے بنفشتہ کے دل کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ کوئی
 آہٹ ہو، کوئی پتہ کھرکے، کوئی مایہ لہرائے — وہ چونک پڑتی تھی، سہم جاتی تھی
 اس کا دل بڑی زور سے دھڑک اٹھتا وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر پریشان
 نظروں سے اوجھڑا دھڑکیٹتی اور اپنے دل کے دھڑکنے کی صدا سنتی رہتی۔

اور جب — وقت کے بہتے دریا میں اپنے سفیدہ دل کو کھیلتے ہوئے بنفشتہ
 نے اپنی زندگی اور موت کے درمیانی فاصلے کو کچھ اور کم کر دیا تو اس کی کتاب زندگی
 میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔ ایک ڈوبتی ہوئی شام کو ٹنگے کے سلسلے لمبی سی
 گاڑی اکبر کی اور کوئی اترا شاہانہ انداز، ہاؤتار چال، سمن ووجاہت کا مجسمہ،
 ابامیاں، پچامیاں اور "ٹڈبا" ان کی پذیرائی کو بڑے مسکراہٹوں کے تبادلے ہونے
 مصلحے کے گئے اور ہاتھوں ہاتھ اس اجنبی کو اندرے جایا گیا۔ شجورانی کے دماغ
 میں کھدر بدر شروع ہوئی، لیکن جس سے بھی اس اجنبی کی آمد کی وجہ پوچھی اسی نے
 گول مول جواب دیا۔ وہ تو اللہ عیلا کرے۔ چھوٹی چچی کا جنہوں نے دبے لفظوں میں
 بتلویا کہ بنفشتہ کے رشتے کی بات چل رہی ہے شجورانی یہ خبر سن کر اس ہو گئیں ہوس
 محنت انہوں نے رات گئے ہمک ان میں بالکل تنہا ٹپکتے ہوئے سجاد بھائی کو بہت یاد کیا۔

وقت کے سیل رواں کو آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا رنج و غم، خوشی اور
 مسرتیں، مسکراہٹیں اور آہستہ، تپتے اور ٹنگے — سب اس کی پھیلی ہوئی ہانوں میں
 سما جاتے ہیں اور وہ چپ چاپ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ بغیر کسی آہٹ کے، شے بغیر
 رکے بغیر کسی سے کچھ کے بغیر اور کسی کی کچھ سے بغیر — یہ ازل سے ہوتا آیا ہے اور اب
 ہوتا رہے گا، اور جب وقت کا سیل رواں آگے بڑھ جائے تو پیچھے کچھ نہیں باقی بچتا
 سوائے یادوں کی جھللاتی شمعوں کے۔ وہ تمغیں — جو وقت کے ان گنت لمحات
 کے دھندلکوں میں مدہم تو ضرور پڑ جاتی ہیں لیکن بجتی کبھی نہیں۔ انجانی سمت سے آتی
 ہوئی ہوا کے جھوکوں میں ان شمعوں کی دیون لڑتی ہیں، مقرر تھراتی ہیں، کانپتی ہیں لیکن پھر بھی
 فروزاں رہتی ہیں۔

بھر۔ اس اجنبی کے متعلق بہت دنوں تک چھان بین ہوتی رہی۔ پوری چھان بین ہو جانے کے بعد ماں بیگم نے شیخو کے یہ کام سپرد کیا کہ وہ بنفشہ سے اس کی مرضی معلوم کرے۔ شیخو نے اپنا دام بچانے کی بہت کوشش کی لیکن اماں بیگم کے سامنے اس کی ایک نہ چل سکی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوئی کہ کس منہ سے بنفشہ باجی سے یہ بات پوچھے کہ آپ کو یہ رشتہ منظور ہے یا نہیں؟ کوشش کے جب وہ اپنے آپ میں اس بات کی جرأت نہ پیدا کر سکی تو اس نے اپنے بھائی کو ارادہ کر لیا کہ وہ اماں بیگم سے صاف صاف کہہ دے گی کہ وہ یہ کام انجام نہیں دے سکتی لیکن اس روز چھٹ باجی دو چار روز کے لئے رہنے آگئیں۔ شیخو نے جھٹ اپنی بلا ان کے سر ڈال دی۔ چھٹ باجی نے اس کام کو آسان سمجھ کر فوراً حامی بھری۔ لیکن جب ان کے پوچھنے پر بنفشہ نے بجائے جواب دینے کے ٹپ ٹپ آنسو گرانا شروع کئے تو ان کی آئی نفل گم ہو گئی۔ تین روز اسی طرح گزر گئے کہ جب بھی وہ کھانچا کہ بنفشہ سے اس کی مرضی معلوم کرنے کی کوشش کرتیں بنفشہ سر جھکا کر آنسو بہانا شروع کر دیتی۔

بنفشہ کی ذہنی کیفیت ان دنوں بڑی عجیب سی تھی۔ گزشتہ برسوں کی بے شمار باتیں سوچ سوچ کر اس کا دماغ ٹھک کر رہ گیا تھا اور دل پریشانیوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا تھا۔ چھٹ باجی نے میکے میں اپنے قیام کی مدت دو تین روز اور بڑھادی تھی صرف یہ سوچ کر کہ ممکن ہے بنفشہ کو کوئی قطعی فیصلہ کرے انہیں اس سے آگاہ کر سکے۔ لیکن وہ دو تین روز بھی بیکار بھینپنے میں گزر گئے بنفشہ اسی طرح گپ چپ اپنے کاموں میں مصروف رہی۔ اگلے روز صبح چھٹ باجی کو جانا تھا انہوں نے بڑے پیار سے بنفشہ کے گلے میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں تو کل صبح چلی جاؤں گی بنفشہ! تم سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لو، پھر شیخو کو بتا دینا۔ بنفشہ پلکوں کی چلن گرائے جانے کیا سوچتی رہی۔

پھر اس رات بنفشہ نے دادا جان سے کہہ بند کر کے سامنے والی گیلری میں بٹک کا سہارا لے کر سوچا۔ شیخو نے فیصلہ کر لینا چاہیے۔ آخر وہ کب تک ان کے اوپر بوجھ بنی بیٹھی رہے گی؟ ہاں نے جانے کس طرح دوڑ دھوپ کے اس کے لئے اتنا اچھا رشتہ تلاش کیا ہے۔ وجاہت مرزا میں کسی بات کی انوکھی نہیں ہے۔ پیسہ پر اہم باہمی ہیں ان کے پاس حق بھی ہے دولت بھی، حق بھی ہیں باوقار بھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ خود ان کے قابل نہیں نظر آ رہے۔ ان کے لئے لڑکیوں کی کمی بھی نہیں ہوگی لیکن جب اس کی قسمت ان کے ساتھ جا چکی ہے تو پھر دل کا چاہنا یا نہ چاہنا کوئی معنی نہیں رکھتا، اور یہی سب سوچ بنفشہ نے اپنے آپ کو ایک بار پھر اپنی قسمت کے حوالے کر دیا۔

اور اس کے بعد بنفشہ کی شادی کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو گئیں، اماں بیگم نے ایک چیز کی خریداری کے لئے شیخو کے ذریعے اس کی مرضی معلوم کرتیں تو وہ نے بیٹھ جاتی اور بڑی اداسی سے سوچتی کہ آخر اس گھر کے لوگوں سے کون سا فرد سزاوار ہوا تھا۔ جس کی پاداش میں وہ ایک سزا اور ایک بوجھ بنا کر ان کے سروں سے لٹا کر دی گئی۔ بیچپن سے لے کر اب تک پالا پوسا، بڑھا کھیا کر بڑا کیا، کبھی قابل یا اولاد اتنے سارے طول طویل خرچے اس کی اور شرافت کی آخر کتنی مثالیں مل گئی دنیا میں؟ آخر ایک روز اس نے تنگ آکر شیخو سے کہہ دیا۔

شیخو! مجھے کچھ نہیں چاہیے، اماں بیگم سے کہہ دو میرے لئے کچھ نہ خریدیں لیکن

شہزادہ مال بیگم نے بنفشہ کی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی بنفشہ کے لئے اماں نے دل کھول کر روپیہ خرچ کیا اپنے مقدور بھروسے کے لئے ابھی سے ابھی چیز خریدنے اس کے لئے آپا جان اور چھٹ باجی سے کہیں زیادہ ہنر بہنر تیار کیا جو شخص بھی جہاں دیکھتا، تعریف کئے بغیر نہ رہتا اور مال بیگم کی فراخ دلی، نیکی اور شرافت کو سراہے بغیر نہ رہتا بنفشہ کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی شادی میں شرکت کے لئے وجاہت مرزا کی بڑی بہن اپنے بچوں کے ساتھ کینیڈا سے آئی تھیں اور چھوٹی بہن اپنے شوہر کے ساتھ ایران سے آئی تھی چھوٹی بہن بشکل تمام بنفشہ کی ہم عمر ہوگی لیکن اس کی شادی بہت کم عمر میں ہو گئی تھی اس کے شوہر پاکستان سے ہی ماں نے اپنے زندگی کی شمع گل ہونے سے چند عرصے پہلے اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے تھے اپنے باپ کو تو اس نے ہوش سنبھال کر دیکھا ہی نہیں تھا، وہ بہت پہلے ہی موت اور زندگی کے درمیان فیصلے کو ختم کر چکے تھے، وجاہت مرزا کی طرف سے ان کے دو بہار کے چند رشتے داروں نے شرکت کی تھی باقی کثیر تعداد ان کے دوستوں اور ان کی بیویوں کی تھی۔ دونوں نہیں بشکل تمام ایک عرصے میں جاتے جاتے بنفشہ کو بہت مہار پیار بھری نصیحتیں کر گئیں۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد اتنی بڑی کو بھٹی بالکل سنانا اور دیران ہو کر رہ گئی۔ بنفشہ وحشت زدہ سی ہو گئی۔ مگر ان لوگوں کو گئے ہوئے چار پانچ روز بھی نہ گزرے تھے کہ وجاہت مرزا اسے ساتھ لے کر بہن مومن منانے چل دیئے جانے سے پہلے بنفشہ ایک روز کے لئے گھر گئی۔ اتفاق سے چھٹ باجی اور آپا جان بھی آئی ہوئی تھیں، سب سے ملاقات ہو گئی لیکن بڑ بھتیجا حسب دستور غائب تھے۔ بنفشہ کچھ ناامید سی ہو کر واپس جانے کی تیاری کر رہی تھی کہ بالکل خلاف توقع وہ لگے

پاشا داب و نگشتہ چہرہ دیکھ کر وہ بڑے مطمئن انداز سے مسکرائے۔ اور شام کی ٹکی ہلکی وار دھوپ میں چھپا کے درخت سے قدرے فاصلے پر بیٹھے وہ دیکھ کر اس سے کہتے رہے۔

صرف بڑ بھتیجا بلکہ گھر کے سبھی افراد بنفشہ کو خوش و بخیر کر مطمئن تھے۔ اگلے روز بنفشہ وجاہت مرزا بہن مومن منانے چل دیئے۔ ملکوں ملکوں شہروں، شہروں گھومتے ہوئے نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اور انسانوں کو بڑی نزدیک سے پرکھ کر تقریباً ہلک وہ باہر رہے۔ اور جب وہ لوگ واپس آئے تو بنفشہ کو احساس ہوا کہ اتنے گھر میں تنہا نہ رہ کر وہ کہیں پاگل ہی نہ ہو جائے۔ اس نے اپنی گزشتہ زندگی بہت سے لوگوں کے درمیان گزاری تھی اور یہاں سوائے چند ملازموں کے اور کوئی نہیں وجاہت مرزا تو سارا وقت گھر میں گزارنے سے رہے۔ ان کا اتنا وسیع بزنس تھا۔ زیادہ وقت گزارنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کو بھٹی ایسے علاقے میں تھی۔ کوئی پڑوس بھی نہیں تھا۔ چند کوٹھیاں تھیں جو ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھیں باقی سارا علاقہ غیر آباد تھا۔ کوئی کام نہ ہونے کی وجہ سے دن اسے بے پروا ملتا تھا۔ اتنا بڑا گھر اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اماں کو بشکل تمام سمجھا کر کھانا پکانے کا کام اپنے ذمے لے لیا نکلاس طرح وقت کی ت کا احساس کچھ کم ہو۔

بنفشہ سوچتی تھی یہ اس قدر وسیع کو بھٹی، جھلملاتے ہوئے ریشمی، قیمتی کپڑے، تے ہوئے بیش قیمت زیورات، یہ پر تکلف سازو سامان — یہ سب فرنگیوں کیوں لگیا ہے؟ میں نے کبھی ان چیزوں کی تمنا نہیں کی تھی، میں نے کبھی

ایسی زندگی کے خواب نہیں دیکھے تھے۔ یہ سچ ہے کہ لڑکیاں عموماً ایسی زندگی کے
سپنے دیکھا کرتی ہیں لیکن میں تو ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔ قسمت کے کھیل
نڈاے ہیں۔ کچھ لوگ آرزوؤں اور تمناؤں کا بھوٹا سہارا لئے سپنوں کے رنگین جال
بننے بننے زندگی کے آخری سرے تک پہنچ جاتے ہیں اور کچھ نہیں پاتے اور جو
ایسی تمناؤں اور خواہشوں کو اپنے خوابوں میں بھی جگہ نہ دیں انہیں یہ سب کچھ کتنی
آسانی سے مل جاتا ہے۔ دوسروں کے لئے یہ زندگی بے شک حسین اور پرکشش ہوگی
لیکن مجھے تو وہ منت ہو تی ہے لیکن کچھ بھی سہی — مجھے اس زندگی کے ساتھ سمجھو
کرنا ہی ہے۔

لوگوں کا کالواں وقت کی بانہوں میں سمٹ کر کچھ اگے بڑھا تو نبشتہ پر اس حقیقت
کا انکشاف ہوا کہ یہ حسین اور پرکشش زندگی تو کچھ بھی نہیں۔

مرگ ایک دھوکہ ہے۔

غص ایک فریب ہے۔

نفس ایک عسقم ہے۔

وجاہت مرزا کی شرافت تو ان کی کینگی اور رزالت پر پڑا ہوا ایک خوبصورت
پرودہ ہے، ایک نقاب ہے۔ ہوا کے جھونکے سے جب وہ پردہ اڑا تو وجاہت مرزا
کی بفا ہر بات اور ہر پرمکنت نظر آنے والی شخصیت اپنے تمام تر مکروہ پن کے ساتھ
بالکل عریاں نظر آئی، ”اوپچی“ اور ”منڈب“، سوسائٹی کی وہ کون سی خوبی تھی جو ان
میں نہیں تھی۔ شادی کے بعد کے یہ چار ماہ انہوں نے جانے کس طرح شرافت کے
جامے میں دھ کر گزار دیئے تھے۔ نبشتہ کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو یقیناً پرزور

اختلاج کرتی۔ لیکن وہ — سدا کی بے زبان لڑکی سوائے سب کچھ سننے اور بھرت
لرنے کے اور کیا کر سکتی تھی۔ چند بار وہ بی زبان سے اس نے وجاہت مرزا کو سمجھانے
کی کوشش کی لیکن وہ سمجھنے اور سمجھانے کی منزلوں کو بہت ہی جھپٹا آئے تھے۔
نبشتہ کے سمجھانے کا انداز بھی بالکل منت سماجت کرنے کا تھا۔ سہی ہوئی نگاہیں
زم اور میٹھی زبان — وجاہت مرزا تو تلخ اور کڑوی کیلی زبان کا مطلب بھی
نہیں سمجھتے تھے پھر ان جلیباہ حصلت آدمی قزم اور میٹھی زبان کا مفہوم کیسے سمجھ سکتا تھا۔
وقت، حالات اور قسمت نے وجاہت مرزا کو نبشتہ کا ”عجازی خدا“ بنایا تھا۔
وہ سب کچھ کتنے سب کچھ کرنے اور کروانے کا اختیار رکھتے تھے اور نبشتہ ان کی ہر بات
سن کر سر جھکا دینے پر مجبور تھی۔ وجاہت مرزا کی شاہیں کلبوں میں گزرتی تھیں۔ بلکہ
رات گئے وہ کلب سے اٹھتے تھے اور ان کے حکم کے مطابق نبشتہ ہر شام سب سے
کران کے ساتھ کلب جانے پر مجبور تھی۔ لباس بھی ان کی مرضی کے مطابق پہننا ضروری
تھا۔ اس کے لئے منت نئے ڈیزائن کے کپڑے تیار کر دئے جاتے تھے جن کی بیودہ
ناش خراش پر نبشتہ دل ہی دل میں کڑھتی تھی۔ وجاہت مرزا سے ان دہیات باسوں
میں دیکھ کر بہت مسرور ہوتے تھے اور بڑے فخر سے اسے اپنے دوستوں سے ملواتے
تھے۔ دوست بھی انہی کے ہم صفت تھے اور باشی اور میٹھی میں کوئی کسی سے
لم نہیں تھا۔

وجاہت مرزا جس کلب کے ممبر تھے۔ وہ شتر کا سب سے بڑا کلب تھا۔ اس کی
برشپ کا فخر صرف انہی لوگوں کو حاصل تھا دولت جن کے گھر کی ٹونڈی تھی اور
مال و زر جن کے ہاتھ کا میل تھا۔ وہاں سرشام زندگی ایک انوکھے اور دلنریب انداز

سے اگمہ لائی لیتی تھی اور رات کی پھیلی ہوئی بانہوں میں لمحہ بہ لمحہ جہان سے جہان ترہوڑ جاتی تھی، سکوت صبح سے پہلے یہ غمار آلود زندگی ٹھک کر دم توڑ دیتی تھی کلب کی اس جگہ لگتی ہوئی عمارت میں ہر برس سے کام پڑتہ تہذیب "اور ترقی پسندی" کا لیبل چڑھا کر اسے بڑے بڑے فخر سے انجام دیا جاتا تھا، بڑے بڑے "بزنس ایگریٹس" غٹوں میں طے پا جاتے تھے، بس کسی خوبصورت چہرے اور جہان جسم کی جھلک دکھانے کی دیر ہوتی تھی۔ وجاہت مرزا کی اس پسندیدہ دنیا میں مرد کسی کے باپ، کسی کے بھائی اور کسی کے شوہر بن کر نہیں سوچتے تھے وہ صرف مرد ہوتے تھے اور یہاں آنے والی عورتیں نہ کسی کی بیٹیاں تھیں نہ بیٹیاں اور نہ کسی کی بیویاں — وہ صرف عورتیں تھیں۔ مرد اپنے نفع کی خاطر مال و زر کی چکا چوند سے اندھے ہو کر انہیں دوسروں کے حوالے کر دیتے تھے "اقتدار" کی "اونچی کرسی" کے خواب دیکھنے والے مرد یہاں بڑی جلدی اپنے خوابوں کی تعبیر پالیتے تھے۔ بس اپنے منیر کا گلا گھونٹنے کی دیر ہوتی تھی۔ یہاں پر صرف تھوڑی سی کشمکش کے بعد ہر رشتہ، ہر ناظر اور ہر تعلق بڑی آسانی سے ٹوٹ جاتا تھا، امان مال و زر سے بڑی جلدی یا راستہ ہو جاتا تھا۔

کلب کی اس جاگتی اور جگمگاتی دنیا کو منور کرنے کے لئے جو عورتیں یہاں آتی تھیں ان میں اور کوسٹوں پر بیٹھے والی طوائفوں میں فرق صرف اتنا تھا کہ ان عورتوں نے اپنے چہروں پر لفظ "تہذیب" کی چھاپ لگا رکھی تھی۔ کچھ کو تو "مادر" ہونے کا جنون بہانہ کھینچ لایا تھا اور کچھ اپنے "مجازی خداؤں" کے نادر شاہی احکام اور ان کی بے بسی کی بھینٹ چڑھ کر اس کمرہ و دنیا میں اگمہ دی تھیں، نقشہ بھی انہی میں سے تھی۔ لیکن یہ شاید اس کی خوش قسمتی تھی کہ وجاہت مرزا نے اسے ترقی

کے زینے پر ایک دم ہی چڑھ جانے کا حکم نہیں دیا تھا، تہذیب کی "آخری منزل" ایک دم ہی پھولنے پر مجبور نہیں کیا تھا، فی الحال تو وجاہت مرزا اس کے لباس کی زائش خراش کی طرف متوجہ تھے، اسے راتوں رات رقص اور اس کے "آداب" سکھا دینے کی سر توڑ کوشش میں مصروف تھے اور نقشہ کی حالت یہ تھی کہ ٹھنڈے کے ایک ایک اسٹپ پر وہ پوری جان سے لرز کر رہ جاتی تھی۔ رات کی تنہائیوں اور مناظروں میں وہ اپنے بستر پر خاموش لیٹی سوچتی رہتی اور چپ چاپ آنسو بہاتی رہتی۔ لیکن یہ کوئی چند روز کا قصہ تو تھا نہیں یہ عذاب تو ہمیشہ کے لئے اس پر نازل ہو گیا تھا۔ آنسو بھی کمان تک اور کب تک اس کا ساتھ دیتے، وہ بھی ایک روز جواب دے گئے، چپ چاپ قلم گئے، خشک ہو گئے۔

نقشہ کا دل ہر دم ہی چاہتا تھا کہ اس دنیا سے — وہ جو وجاہت مرزا کی پسند دینا تھی، ان کی پسندیدہ جگہ تھی، ایک دم بھاگ جائے اس کی جگہ گھٹ لے لے قد بھیانک تھی وہاں پر بلند ہونے والے نقشے کس قدر کھو کھلے تھے اور وہاں بکھرنے والی مسکراہٹیں کتنی پھلکی تھیں؟ یہ کوئی نقشہ کے دل سے پوچھنا یا ان عورتوں سے پوچھنا جن کے قدم وہاں تک خود نہیں پہنچے تھے پہنچائے گئے تھے۔ رنگ و نور کے اس طوفان میں "شرافت" اور "پارسی" کی "ہشیں تیرتی نظر آتی تھیں، خوشبوؤں کے اس سیلاب میں "انسانیت" کی مسخ شدہ ادب بڑی گلی لائیں اپنی تمام تر عزیمت کے ماتھے بہتی نظر آتی تھیں، جانے رنگ و نور کی یہ کیسی دنیا تھی کہ نقشہ کو یہاں سوائے مہیب تاریکی کے اور کچھ نظر نہیں آتا تھا، ایسی تاریکی جس کا سراپا ہی بربادی کے جیہانم غار کے دہانے پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ خوشبوؤں کا جانے یہ کیسا جہان تھا۔

کہ ہفتہ کو وہاں شدید نقص کا احساس ہوتا تھا۔ معلوم نہیں سچ یا ایسا ہی تھا یا اس کے سوچنے سمجھنے اور غور کرنے کا انداز غلط تھا۔

ہفتہ نے کافی وقت ”ترقی“ اور ”تہذیب“ کی ابتدائی بیڑیوں پر چڑھتے ہوئے گزار دیا لیکن آخر کب تک؟ اتنی تاخیر برداشت کرنا وجاہت مرزا کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر ادھر کچھ عرصے سے ان کا نوشاد علی کے ساتھ ایک مینٹ والا معاملہ بھی کھڑا ہو گیا تھا۔ نوشاد علی سے ان کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے بہرہ وادان چڑھتی تھی لیکن جانے یہ کیسی دوستی تھی کہ جہاں نفع نقصان کی بات آئی دونوں نے میٹھی طرح لگا ہوں سے ایک دوسرے کو دیکھنا شروع کر دیا۔ کوشش تو دونوں کی ہی ہوتی تھی کہ لگا ہوں کے اس میٹھے ترے پیچ کا اندازہ دوسرے کو نہ ہونے پائے۔ لیکن دونوں ہی عقاب کی سی نظر رکھتے تھے مرقع حرف اتنا تھا کہ نوشاد علی کچھ زیادہ ہی گھاگھا تھا۔

ہفتہ کو یوں تو وجاہت مرزا کے ہر دوست سے نفرت کرنے کی حد تک چڑھتی۔ لیکن نوشاد علی اسے نہر سے بھی زیادہ برا لگتا تھا۔ شروع شروع میں ہفتہ کو اس بات پر سخت حیرت ہوتی تھی کہ وجاہت مرزا نے اسے اپنے دوستوں کے ساتھ آزادانہ بات چیت کرنے اور گھومنے پھرنے کی آزادی کیوں دے رکھی ہے، لیکن جب وجاہت مرزا اسے مستقل اپنے ساتھ کلب لے جانے لگے تو آہستہ آہستہ ہفتہ کی سمجھ میں بہت ساری باتیں آ گئیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ہفتہ نے بڑی کوششوں سے اپنے آپ کو اس قدر غماز رکھا کہ وجاہت مرزا کے دوستوں کو اس کے ساتھ گھومنے کا موقع نہ مل سکا۔ سچی اس سنہری جڑ یا کو دور دور سے دیکھ کر لپچاتے تھے اور چشم نقور

سے اسے اپنے دام میں گرفتار دیکھتے تھے۔ سب سے زیادہ ہوسنگ لگا ہوں نوشاد علی کی تھیں۔ اس کا بس نہیں جیتا تھا کب بھینٹا مار کر اس تھی متی سی جڑ یا کو بے بس کر دے اب قدرت نے اسے ایک موقع فراہم کیا تھا تو وہ اسے کسی صورت میں بھی گنوا نا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وجاہت مرزا کو نوشاد علی کے ساتھ معاہدے میں ہزاروں روپے کا نذرہ تھا پھر وہ کبھی کیوں اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیتے؟ سرسری طور پر انہوں نے ہفتہ کے سامنے اس نئے معاہدے کی غویں لٹی باگرہ لٹیں اور ساتھ ہی اس جیلے کہ اضافہ بھی ہر دفعہ ور کیا۔ ”بہت چالاک آدمی ہے کسی طرح جیتے ہی نہیں چڑھ رہا۔“ ہفتہ سر جھکا کر ان باتوں کو سنتی اور خاموش رہتی۔ جب ہفتہ نے اس معاملے میں مستقل خاموشی اختیار رکھی تو ہنگ آ کر وجاہت مرزا یہ کہنے سے باز نہ رہ سکے۔

”تم اگر کوشش کرو تو یقیناً کام بن جائے گا۔“

”میں؟ میں کس طرح کوشش کروں؟“ ہفتہ نے پوچھا۔

”مہم۔۔۔ میرا مطلب ہے تم اس سے بات کر کے دیکھو۔“ وجاہت مرزا ایک دم گڑبڑا گئے۔

”میرے بات کرنے سے کیا ہوگا؟ جب وہ آپ کے دوست ہو کر آپ کی بات نہیں مان رہے تو پھر۔۔۔“ ہفتہ نے کہا۔

”نہارے بات کرنے سے بہت کچھ ہوگا۔ تم عورت ہو، ایسے معاملوں میں دوستی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔“ وجاہت مرزا نے لفظ ”عورت“ پر خاص طور سے زور دیا۔

”آپ کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی“ بنفشہ نے انجان بن کر کہا۔
 اسے بھی! دو چار دفعہ اس کے ساتھ گھومنے پھرنے جاؤ پھر دیکھو مایکے
 نہیں مانے گا تمہاری بات؟“ وجاہت مرزا نے کہا۔
 ”در اصل مجھے یہ بات پسند نہیں ہے اور پھر مجھے آپ کے دوستوں سے ڈر
 بھی بہت لگتا ہے“ بنفشہ نے سہمے ہوئے انداز سے کہا۔
 ”اس میں نا پسندیدگی کی کون سی بات ہے؟ مائی ڈیئر! زمانہ بہت ترقی کر گیا
 ہے، وقیانوسی باتوں کو اپنے ذہن میں جگہ مت دو اور تمہیں میرے دوستوں سے ڈر
 کہوں لگتا ہے؟ سب کے سب انتہائی شریفیت اور قندب انسان ہیں“ وجاہت مرزا
 بڑے فخر سے کہا۔

بنفشہ نے دل میں سوچا۔ ”ان کی شرافت کا اندازہ تو مجھے اچھی طرح ہو چکا ہے“
 ”پھر؟ تم نے کیا سوچا؟“ وجاہت مرزا آج فائنل بات کر لینے پر آمادہ نظر آ رہے تھے۔
 ”مجھے ڈر ہے وجاہت صاحب! یہ دو چار دفعہ کا گھومنا پھرنا میرے اوبرآپ
 کے لئے کوئی مسئلہ نہ پیدا کر دے“ بنفشہ نے کہا۔

”کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوگا“ وجاہت مرزا نے بڑے دثوق سے کہا۔
 ”کلب کی کتنی ہی عورتوں کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں، آپ شاید بھولے ہیں“
 بنفشہ نے کہا۔

وجاہت مرزا پہلے تو زبوس سے ہوتے پھر فوراً ہی سنبھل کر بوسے۔
 ”یہ تو اپنے اوپر منحصر ہوتا ہے۔ عورت کو انیا کر دار مضبوط رکھنا چاہیے پھر کوئی
 مسئلہ پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں“

بنفشہ کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی گاڑی کا ہارن بٹائی دیا۔ یہ نوشاد علی کی
 گاڑی کا ہارن تھا جسے بنفشہ خوب اچھی طرح پہنچاتی تھی۔ وہ مرزا پاسکالک اٹھی اور
 وجاہت مرزا سے کوئی بات کئے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔

اور۔۔۔ اگلی شام۔۔۔ کلب میں جب زندگی جوان ہونا شروع ہوئی تھی۔
 تو وجاہت مرزا بقول خود ان کے ہال میں گھٹن عمسوس کرنے لگے اور بنفشہ کو نشست
 پر تنہا چھوڑ کر باہر لان کی کھلی فضا میں نکل گئے بنفشہ کافی دیر ان کا انتظار کرتی رہی جب
 انہوں نے کسی طرح آنے کا نام ہی نہ لیا تو وہ اپنا پیرس اٹھا کر باہر نکل گئی۔ لان کے
 ایک تنہا گوشے میں اس نے وجاہت مرزا اور نوشاد علی کو ایک بیچ پر مصروف گفتگو
 پایا۔ بنفشہ کی طرف ان دونوں کی سہیت تھی۔ بنفشہ کا یہ ارادہ قطعی نہیں تھا کہ وہ چھپ
 کر ان دونوں کی گفتگو سنے وہ تو وجاہت مرزا سے گھر چلنے کے لئے کہنے آئی تھی۔ مگر
 نوشاد علی کی زبان سے اپنا نام سن کر جانے کیوں وہ ٹھٹھک کر رہ گئی اور پھر باوجود
 کوشش کے وہ قریبی ہمدری کی باڑھ کے پیچھے چھپ کر ان کی گفتگو سننے سے باز نہ
 رہ سکی گفتگو کا موضوع وہی نیا بزنس اگیڈمنٹ تھا جس کے لئے نوشاد علی نے
 انتہائی جینٹل انداز سے بے حیائی اور ڈھٹائی کے ساتھ بنفشہ کا مطالبہ کیا تھا اور
 بے حس و بے غیرت وجاہت مرزا کے انکار کرنے کا انداز ایسا تھا جس میں ہمہ طور پر
 اقرار کر لینے کی جھجک نمایاں تھی بنفشہ کے لئے مزید وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا وہ اسٹے
 قدموں واپس اندر چلی گئی۔

بنفشہ نے وہ تمام رات آنکھوں میں کاٹ دی اس نے بڑی شدت سے امان نیگم
 ابامیاں، شہجورانی اور بیٹھیا کو یاد کیا اس کے دوران لوگوں کے درمیان مشروں کا فاصلہ

نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ادھر چند مہینوں سے وہ اپنے آپ کو ان لوگوں سے بہت دور محسوس کرتی تھی۔ پہلے وہ ہر ہفتے بڑی باتا عدگی سے ان لوگوں سے ملنے جاتی تھی۔ وجاہت مرزا خود اسے چھوڑ کر آتے تھے۔ لیکن اب وجاہت مرزا نے اسے جوڑگ ڈھنگ اپنانے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے بعد ہفتہ کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ حتی الامکان ان لوگوں کا سامت کرنے سے پرہیز کرے۔ اپنی فطرت کے باعث وہ مجبور ہو کر وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔ عرف یہ سوچ کر کہ گزشتہ تمام زندگی ان لوگوں پر بوجہ بنی رہی ہوں۔ وہ لوگ ہمیشہ میری طرف سے فخر مند رہے ہیں۔ اب اپنی نئی زندگی کی تیغ داستان نہ کر پیران کی فکر دوں اور پریشانیوں میں اضافہ کر دوں؟ آخر ان لوگوں سے کونسا تصور سرزد ہوا ہے جو میں اپنی طرف سے ان لوگوں کو سکھ کا سامن ہی نہ لینے دوں؟ اس نے عہد کیا تھا کہ اب سر جوڑ لگائی لیکن کسی کے سامنے اپنے دکھ اظہار نہیں کروں گی۔ وہ اب بھی ان سب سے ملنے جاتی تھی اور وہاں سے بھی وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی آواز نہتا تھا۔ مگر ہفتہ نے اپنے چہرے کو جانے کیسی نقاب کے پیچھے چھپا یا تھا کہ کوئی اس کے دل کی دنیا کا حال نہ جان سکا۔ ان سب کے سامنے وہ اپنے آپ کو اس قدر خوش و خرم اور شاداب و شگفتہ بنا کر کر تی جیسے سارا سکھ، چین اور تمام مہتر ہیں اس کے قدموں میں ڈبے ہوں۔ وجاہت مرزا کا ذکر اس انداز سے کرتی جیسے ان دونوں کے درمیان زبردست اندراپینڈ لگ اور بے پناہ پیار ہو۔ سب اس کی طرف سے مطمئن تھے اور خوش تھے کہ تقدیر نے اسے بھی اچھے اور پرستردن دکھائے۔ حد تو یہ ہے کہ بڑ بھینا۔ جو بڑی گری نگاہ رکھتے تھے اور جن کو دعویٰ تھا کہ ہفتہ کا چہرہ ایک صاف و شفاف آئینہ ہے۔

اب اس کے دل کی ہر تصویر واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے وہ بھی کچھ نہ جان سکے کچھ نہ سمجھ سکے شاید وقت اور حالات کی مسلسل ستم ظریفیوں نے اس صاف و شفاف آئینے کو دھندلا کر دیا تھا۔

روز و شب کے ہنگاموں میں چار چھ دن اور گزر گئے تو ہمیشہ کی طرح ایک نام پھر بالکل اچانک وجاہت مرزا نے اپنے چار روزہ بزنس لوڈ کا پر و گمر ہفتہ کو سنا دیا۔ ہفتہ نے اس پر و گمر کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اب وہ ان تمام باتوں کی عادی ہو چکی تھی۔ لیکن اسی رات کلب سے گھر واپس آنے سے قبل اس نے وجاہت مرزا اور نوشا علی کو لان کے تنہا اور مخصوص گوشے میں بلا دینا میں مصروف پایا اور ان غصے سے لمحات میں اس کے کانوں نے جو کچھ سنا وہ اسے سرتاپا کپکپا دینے کے لئے کافی تھا وہ بیشکل تمام دلی لڑکھرائی اندر واپس چلی آئی باوجود کوشش کے وہ اپنے اعصاب کو کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی لیکن وجاہت مرزا کے واپس آنے تک وہ قہر سے منجمل گئی۔

اس شب کی بھی سحر ہو گئی لیکن کچھ اس طرح کہ ہفتہ کی آنکھیں بند کے لئے ترستی رہ گئیں، وجاہت مرزا اپنے بستر پر بے سندھیلے غویل بیٹانک غرائے لیتے رہے اور ہفتہ سوچتی رہی۔ تو اب میرے لئے بھی تہذیب کی آخری منزل کو چھو لینے کا وقت آ گیا ہے، بہت دن صبر کیا وجاہت صاحب نے اور بہت برداشت کیا میری سست رفتار کو اب تک اپنی باتیں منوانے کے لئے میری منتیں کرتے آئے تھے یا مجھے احکام دیتے آئے تھے مگر شاید انہیں یقین تھا کہ اس موقع پر نہ ان کی منتیں ادا آسکیں گی اور نہ ان کے احکام بآواز ثاب ہوں گے اسی لئے انہوں نے سازش کا

سہارا لیا۔ کس قدر بے غیرتی تھی ان کی لگا ہوں میں یہ کہتے ہوئے۔ ”تم بھی یاد کیا کرو گے نوشاد علی! کہ وجاہت منزل نے اپنی سب سے قیمتی شے تمہاری نذر کی تھی بس! پھر کل شام ٹھلے پہنچ جانائیں تو روانہ ہو جاؤں گا۔ جو میرے اختیار میں ہے، میں کر رہا ہوں اگے تمہارا کام ہے۔“

وجاہت مرزا کے جلے بنفشہ کے ذہن پر پھوڑے برسا رہے تھے اور ان ہتھوڑوں کی ضرب سے بنفشہ کا دماغ پاش پاش ہوا جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دماغ کی رگیں کسی بھی لمحے پھٹ جائیں گی۔ اپنے پروگرام کے مطابق وجاہت مرزا اگلے روز جانے والے تھے بنفشہ نے ان کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے ان سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ وجاہت مرزا ایک لمحے کے لئے چونک گئے پھر قدر سے سنبھل کر بولے۔

”اب آج تم کہاں جاؤ گی؟ میرے جانے تک ویسے ہی اندھیرا ہو جائے گا۔ کل صبح جلی جانا۔“

بنفشہ نے مزید اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن دل میں قطعی فیصلہ کر لیا کہ وجاہت مرزا کے جاتے ہی وہ فوراً گھر چلی جائے گی۔ اپنی عزت کو بچانے کے لئے اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہیں تھا، لیکن ہوا یوں کہ وجاہت مرزا کے رخصت ہونے کے بعد اس نے ملازم کو ٹیکسی لانے کے لئے روانہ کیا ہی تھا کہ نوشاد علی۔ جس نے کل رات سے اب تک کا وقت جانے کس طرح کاٹا ہے اس کے گزرا تھا۔ اپنی تمام تر خواہشات کے ساتھ آمو جوڑ ہوا۔ اسے دیکھ کر بنفشہ کے اعصاب بالکل ہی جواب دیے گئے۔ لیکن فوراً ہی یہ خیال بجلی کی سی تیزی سے اس کے ذہن میں گوندا کہ اگر اس وقت میں نے

ایسی بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو یہ شخص اپنے ناپاک مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا اس وقت میں نے اپنے اعصاب کو کنٹرول نہ کیا تو میری زندگی میں وہ لمحات ضرور بائیں گے جب میں خود اپنی ہی نظروں سے گزر جاؤں گی۔ یہی سوچ کر اس نے بڑی پرعتماد گاموں سے نوشاد علی کی طرف دیکھا جو گاڑی سے اتر کر اب بالکل قریب آچکا تھا۔

”آداب عرض بھابھی!“ نوشاد علی کے چہرے پر جانت بختی۔ بنفشہ نے اس کے آداب کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

”وجاہت تو گھر میں نہیں ہیں۔“
”اچھا! کہاں گئے ہیں؟“ نوشاد کی آنکھوں سے مکاری میاں غٹی۔
”آپ کو نہیں معلوم؟ میرا خیال تھا کہ آپ سے ذکر کیا ہو گا۔“
نوشاد کی مکاری پر بنفشہ کا خون کھول گیا۔

”مجھے تو نہیں معلوم شاید ذکر کرنا بھول گیا ہو گا“ نوشاد نے کہا۔
”ہاں! ممکن ہے۔ آپ اندر ٹریف لائیے“ بنفشہ نے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

نوشاد کی آنکھوں میں چپتے کی سی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ بڑا متنب بنا بنفشہ کے پیچھے پیچھے چلی دیا بنفشہ نے ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے کے قریب ایک طرف رک کر اسے اندر جانے کا راستہ دیا جب نوشاد علی اندر داخل ہو کر کونے والے دیوان پر بیٹھ گیا تو بنفشہ نے کہا۔

”معاف کیجئے گا، میں ابھی آتی ہوں۔“
”ضرور، ضرور“ نوشاد نے بڑے متنب انداز سے کہا۔

بنفشہ نے اپنے کمرے میں آکر الماریوں کو متقل کیا اور پیرس اٹھا کر باہر نکل گئی کوئی کے پچھلے لان کی طرف سے ہوتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے کوٹھی کی طرف دیکھا اور پھر مضطرب نظروں سے سڑک کی طرف دیکھنے لگی۔ دور سے آتی ہوئی ٹیکسی پر نگاہ پڑتے ہی اس کے دل کو قدرے اطمینان ہوا ٹیکسی کے قریب آنے کے غصے سے وقفے میں اس کا چہرہ کئی بار خوف سے پیلا پڑ گیا۔ ملازم کے ٹیکسی سے اترتے ہی وہ بے حد گھبرائے ہوئے انداز سے گھس گئی اور باہری آواز پر ہٹا بولپاکہ بولی۔

”شرفو! صاحب کے دوست نوشا دعلی آئے ہوئے ہیں ان کے لئے چائے پانی کا انتظام کر دینا، اگر مجھے پوچھیں تو کہہ دینا اپنے گھر گئی ہیں اور جب تک صاحب واپس نہ آئیں گھر کا خیال رکھنا“

”آپ آج وہیں رہیں گی میگم صاحب؟“ شرفو نے پوچھا۔

”ہاں! میں چار پانچ روز کے لئے جا رہی ہوں“ بنفشہ نے جلدی سے کہا۔ اور ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کے لئے کہہ کر بنفشہ نے بڑی آہنگی سے ٹیکسی کا دروازہ بند کیا۔ اس تمام کارروائی کے دوران بنفشہ کا دل چڑچڑاکے نھتے سے دل کی مانند دھک دھک کرتا رہا یہ نومبر کی آخری شاموں میں سے ایک شام تھی فضا خوشگوار تھی اور رنگ بیکن اس کے باوجود بنفشہ پوری جان سے پسینے میں نہا گئی۔ بار بار پیچھے پلٹ کر وہ سہمی ہوئی نگاہوں سے سڑک کی طرف دیکھتی اسے ایسا محسوس ہوا جیسا کہ نوشا دعلی اس کا تعاقب کرتا ہوا آ رہا ہے لیکن یہ شخص اس کا وہم نہ تھا۔

نوشا دعلی کے آنے پر اس نے بڑی کوششوں سے جن ہنوں کو کبھی کیا تھا وہ اب پھر جواب دیتی جا رہی تھیں۔ ہر غلط اسے اپنے ہاتھ پیروں کی جان بھگتی ہوئی محسوس ہو

تی اور دماغ کی رگوں کے پھٹ جانے کا احساس ہر لمحہ شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا۔ اردل پہ جیسے منوں بوجھ آں گرا تھا گھر پہنچے پہنچتے اس کی حالت بالکل غیر ہو گئی۔ کچھ خبر نہیں تھی کہ کس طرح اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو گھر کا پتہ بتایا اور کیسے اس کا کہیے کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اس نے شجور کو دیکھا اندے کی بیڑیوں سے قدرے فاصلے پر ایڑی جبریم دروازہ جانے کن سوچوں میں گم بنفشہ کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا وہ کہہ کر اکیدم اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز تیز باہر بنفشہ کے قریب پہنچ گئی لیکن اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ چونک کر رہا۔ باوجود کوشش کے اس کے ذہن میں ایسا کوئی لمحہ نہ آ سکا جب اس نے بنفشہ کو قدر پریشان اور اتنا سہا ہوا دیکھا ہو۔

کیا بات ہے بنفشہ! جی؟

شجور نے اپنے دونوں بازو اس کے شانوں پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ بنفشہ کوئی جواب دیئے بغیر ساکت نگاہوں سے اس کی طرف تکتے لگی۔ شجور پریشان لگی لیکن اپنی پریشانی کا اظہار کئے بغیر اس نے بڑی آہنگی اور نرمی سے کہا۔

آئیے! اندر چلیے۔

بنفشہ کھوٹی کھوٹی پریشان سی آہستہ قدموں سے اس کے ساتھ آگے بڑھ گئی شجور بنفشہ کو ساتھ لئے ہوئے اماں بیگم کے کمرے کے سامنے والی راہداری میں داخل ہی ہوئی تھی۔ راہداری اماں سے مدھیر ہو گئی۔ بنفشہ کو دیکھتے ہی ان کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا اور ان کے رخساروں پر پڑی ہوئی تھمریاں کچھ اور گہری ہو گئیں۔

”ارے بیٹا! کتنی دیر ہوئی نہیں آئے ہوئے؟“ انہوں نے پوچھا

نفسہ کے منہ سے کوئی بات ہی نہ نکل سکی اس کا سر بھاری ہو رہا تھا۔
تیلے دبا جا رہا تھا اور ہاتھ پر لمحہ بہ لمحہ بے جان ہوتے جا رہے تھے چہرہ اس قدر سفید ہو رہا تھا۔ جیسے اس کے جسم میں خون کی ایک لونڈ تک نہ ہو وادی اماں نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

”کچھ بولو بیٹا!“ انہوں نے گھرائی ہوئی آواز میں کہا اور نفسہ کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ نفسہ کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی وہ کسی بے جان لاش کی طرح پھول کر گر جانے کے قریب تھی لیکن شجرہ نے دونوں بازو پھیلا کر بڑی مضبوطی سے اسے تھام لیا اور گھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”کسی کو آواز دیجئے وادی اماں!“

ارے زینغا! ارے منجھلی ہو! ذرا آنا تو سہی!

انہوں نے اپنی بھرپور کینکپکاتی ہوئی آواز سے پکارا۔

سامنے ہی اماں بیگم کے کمرے سے تنکیل بھیا اور ابامیاں بدحواسی کے عالم میں نکلے۔

”کیا ہوا اماں؟ خیر تو ہے؟“ ابامیاں نے کمرے کے اندر سے نکلے بچتے پوچھا۔ لیکن باہر آتے ہی انہیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہو گیا۔ انہوں نے مزید کچھ کہے اور کچھ پوچھے بغیر نفسہ کے ہلکے پھلکے وجود کو کسی بچے کی مانند اپنے بازوؤں میں سمجھا لیا اور شجرہ کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ ان کے پیچھے ہی نہ صرف وادی اماں، شجرہ اور تنکیس بھیا بلکہ اماں بیگم بھی داخل ہو گئیں۔ ابامیاں نے سیوش نفسہ کو شجرہ کے بستر پر بڑی آہستگی سے لیٹا دیا تنکیل بھیا نے پانی لاکر اس کے منہ پر پھینڈ دیئے، شجرہ نے اس کے ہاتھ پاؤں مہلے ابامیاں نے اسے ہلایا جلایا کرے میں موجود ہر شخص نے اسے آواز دی اسے پکارا لیکن نفسہ بے مدد

رہی۔ اماں بیگم ویسے ہی اخراج قلب اور بلڈ پریشر کی سریفہ تھیں۔ ان کے ہاتھ پیر اُسے پڑ گئے۔

”کیا ہو گیا میری بچی کو؟“ انہوں نے کپکپاتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”اماں بیگم! یہ سیوش ہو گئی ہیں، آپ آرام سے بیٹھ جائیے یا شجرہ نے انہیں سہارا دے دیا۔“

”یہ تو میں بھی دیکھ رہی ہوں کہ سیوش ہو گئی ہے لیکن آخر کیوں؟“ اماں بیگم نے کہا۔

”پتہ نہیں اماں بیگم! باجی ہوش میں آئیں تو کچھ پتہ چلے“ شجرہ نے کہا۔

اور نفسہ کے گیٹ سے اندر تک آنے کا حال اماں بیگم کو بتا دیا۔ پھوڑی دیر میں اسے گھر کو خبر ہو گئی، ہر شخص نفسہ کے کمرے میں جمع ہو گیا۔ وادی اماں نے تنکیس کے دل پر جانے کو نسا دیا۔ وہ فیضہ بڑھ کر نفسہ کے اوپر دم کرنا شروع کر دیا، تنکیل بھیا کسی سے کہے بغیر ڈاکٹر کو بلانے چل دیئے بڑھ بھیا حسب معمول گھر میں موجود نہیں تھے۔ ڈاکٹر بے میں داخل ہوا تو سوائے ابامیاں تنکیل بھیا اور شجورانی کے سب تتر بتر ہو گئے جب ڈاکٹر معائنہ کرتا رہا ابامیاں اسی کے چہرے کے آثار چڑھاؤ کا جائزہ لیتے رہے۔ ڈاکٹر، اسٹیکسکوپ لکھ کر ایک طویل سانس لی اور قدرے مدہم آواز میں بولا کوئی زبردست بی صدمہ۔“

ابامیاں، تنکیل بھیا اور شجورانی نے ایک دوسرے کی طرف چونک کر دیکھا اور نفسہ کے بے ہوش نظریں جمادیں۔ ڈاکٹر نے انگلیشن لگایا، دواؤں کے نام کھئے اور نسخہ تنکیل بھیا کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

یہ دعا میں آپ اسی وقت سے لیجئے اور اگر ایک گھنٹہ تک انہیں ہوش نہ آئے

تو مجھے فون کر دینے کا۔

تشکیل بھیا ڈاکٹر کے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل گئے ان دونوں کے جلتے ہی سب لوگ پھر کمرے میں آجود ہوئے۔ ہر شخص نے پوچھا شروع کر دیا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا۔ ابامیاں کے بتانے پر سب کے ذہنوں میں یہ سوال گردش کرنے لگا کہ آخر ایسی کونسی بات ہو گئی جس کا بنفشہ نے اتنا گرا اندھا کیا۔

بڑھتی اس روز خلاف معمول جلدی گھر آگئے بڑی اماں کھڑکی کے قریب کمرے میں بیٹھی بیٹھی تھیں مگر انہیں دیکھتے ہی وہ اپنے بھاری بھر کم وجود کو سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور اپنا غرارہ بھلاتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

مقصود صرف اتنا تھا کہ جلد سے جلد بڑھتی کو یہ نئی اور اہم خبر سنادیں۔ بڑھتی ابھی اپنے کمرے کے دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ بڑی اماں نے انہیں جا پکڑا اور ادھر ادھر کی بات کہنے بغیر بنفشہ کے گھر آنے سے اس کے بیوش ہونے تک کی داستان فر فر سادی نہ صرف یہ بلکہ تشکیل بھیا کے ڈاکٹر کو بلا کر لانے سے لے کر خود بڑھتی کی آئینک جو کچھ بھی ہوا تھا وہ بھی سنادیا۔ بڑھتی نے یہ سب کچھ انتہائی تجت اور حیرت کے ساتھ سنا اور ان کے قدم اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بجائے شجر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے دروازے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے بے سدھ پڑی بنفشہ کی طرف دیکھا تو ان کے سینے میں اندھ ہی اندھ کوئی چیز پڑی آہستگی سے ٹوٹ کر کھجور گئی۔

ڈاکٹر کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا لیکن بنفشہ کو پھر بھی بیوش نہ آیا۔ تشکیل بھیا نے دس پندرہ منٹ تک اور انتظار کیا مگر بنفشہ کے سپوٹوں میں معمولی سی جنبش تک نہ ہوئی تو تشکیل بھیا مزید صبر نہ کر سکے۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب اسے فون کرنے کے ارادے سے کمرے سے باہر نکلے ہی تھے کہ ابامیاں نے انہیں آواز دے کر لایا۔ وہ کچھ حیرت زدہ سے کمرے میں داخل ہوئے تو بنفشہ کے چہرے پر رنگا ہاتھ ہی ان کی جان میں جان آئی۔ بنفشہ کی ہلکی بہت آہستہ آہستہ لرز رہی تھیں ابامیاں نے بنفشہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے آہستہ سے آواز دی۔ ایک بار دوبار۔ تین بار۔ بنفشہ کی ہلکی تو ضرور لرز رہی لیکن اس کی آنکھیں کھل سکیں۔ پھر بڑا آگے بڑھے، انہوں نے بنفشہ کا سر پکڑ کر آہستہ آہستہ ہلاتے ہوئے اسے پکارا۔ پچا جان اور بڑھتی نے بھی قسمت آزمائی کی لیکن کوئی نتیجہ

بیزہر صورت برآمد نہ ہو سکی۔ وادی آماں نے شبتو سے جس کا عطر منگو کر بنفشہ اک سنگھایا اور شفقت بھری آداز میں دو تہن آداز میں دیں۔ تب کہیں جا کر نے بڑی آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ بنفشہ کے آنکھیں کھولتے ہی سب کے چہروں پر ذرا سی رونق آئی۔ بنفشہ نے آنکھیں کھول کر کھوئی کھوئی نگاہوں سے اپنے اور گرد دکھڑے ہوتے لوگوں کو دیکھا اور پھر ایک ٹمک سامنے والا دیوار کی طرف تنکے لگی۔ اس کے دماغ پر اب بھی ہتھوڑے برس رہے تھے اور دل میں ایک طوفان سا بپا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے بموجب اس وقت کہ نے بھی بنفشہ سے اس کی بیہوش کا سبب نہیں پوچھا۔ آماں بیگم نے فتوہ کو آداز گرم گرم دودھ منگوایا اور اس کے قریب آ بیٹھیں۔ پیار سے اس کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی۔ وادی آماں سر ہانے بیٹھ کر آہستہ آہستہ اس کا سر سہلانے لگیں۔ فتوہ دودھ لیکر آیا تو بڑی آماں نے اپنی خداتہ پیش کیں۔ بنفشہ کو سہارا دے کر اٹھایا اور دودھ کا کپ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کے منہ سے لگایا۔

بنفشہ کسی کی طرف دیکھے بغیر کسی سے کچھ کہے بغیر نظریں جھکاتے چپ چاپ دودھ پیتی رہی۔ آہستہ آہستہ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ صرت شبتو بڑھتیا اور آماں بیگم کمرے میں رہ گئیں۔ آماں بیگم کو بھی شبتو نے اصرار کر کے آرام کرنے کے لیے بھیج دیا۔ بنفشہ کی اچانک بیہوشی نے ان کے اعصاب کو بہت متاثر کیا تھا آماں بیگم کے جاتے ہی بڑھتیا سامنے آ کر بیٹھ گئے لیکن سوائے بنفشہ کی مزاج پرسی کرنے کے اور کچھ نہ پوچھ سکے۔ حالانکہ شبتو اور بڑھتیا دونوں ہی کا دل چاہ رہا تھا

کہ بنفشہ سے وہ سب کچھ پوچھ ڈالیں جو اس کے دل و دماغ میں تھا لیکن ڈاکٹر جیسی پابندی لگا کر گیا تھا کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مجبور بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ آخر صبح ہو جانے کا انتظار کس طرح کریں؟

کھانے کا وقت ہوا تو سب نے اپنی سی کوشش کر ڈالی۔ مگر بنفشہ دو چار لقموں سے زیادہ حلق سے نیچے نہ اتار سکی۔ وہ لقمے بھی — بس یوں لگتا تھا کہ اب نکلے اور تب نکلے۔ آبا میاں نے اسے دو عدد خواب آور گولیاں کھلاتیں اور اسے سو جانے کی نصیحت کر کے اپنے دل و دماغ پر منوں بوجھ لیے کمرے سے باہر چلے گئے۔

اُس رات کی سحر بڑی مشکل سے ہوئی۔ ہر شخص کا دماغ مختلف قسم کے خیالات کی آماجگاہ بنا رہا۔ سب کے ذہن کو دوسروں اور اندیشوں نے گھیرے رکھا۔ بڑھتیا نے اپنے کمرے میں ٹہل ٹہل کر اور مگر ٹھٹھوٹھ پھونک کر آدمی سے زیادہ رات گزار دی۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب وہ اپنی بے خواب آنکھوں کو بڑستی موند کر بستر پر لیٹے۔ شبتو جب تک جاگتی رہی۔ اس کی نگاہیں۔ ساتھ والے بستر پر لیٹی بنفشہ کی طرف ہی لگی رہیں۔ بڑی مشکل سے اس کی آنکھ لگی لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ چونک کر اٹھ بیٹھتی اور جھک کر بنفشہ کی طرف دیکھتی۔

اور — بنفشہ پر وہ رات سب سے زیادہ بھاری گزری۔ اس نے وہ نام رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ خواب آور گولیوں کا معمولی سا اثر بھی اس کے اوپر نہ ہوا۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ تنک گیا اور دل کمزور ہو گیا۔ اپنی عزت کو بچانے کی خاطر وہ یہاں آ کر گئی تھی۔ اُس وقت سوائے اس راستے کے اسے اور کوئی راستہ

ہی نہ سوچہ لگا کر اب وہ یہ سوچ کر پریشان تھی کہ کسی کے پوچھنے پر وہ کیا جواب دیگی۔ کسی کو کیا بتائے گی۔ میرے یوں بیہوشی ہو جانے کا سبب گھر والے کل نہیں تو پرسوں ضرور پوچھیں گے۔ میں کس طرح اپنی زبان سے کہہ سکوں گی کہ وجاہت صاحب نے اپنی ہی ناموس کی دھیمان اڑانے کے لیے اپنے خود غرض اور مطلبی دوست کے ساتھ ساز باز کی تھی؟ میں مرد کا یہ روپ ان لوگوں کو کس طرح دکھاؤں گی؟ ایک شوہر کے کردار کا یہ بُرخ گھر والوں کے سامنے کس طرح بے نقاب کر دوں گی؟ کیا میری زبان میرا ساتھ دے سکے گی؟ میرے الفاظ مجھے سہارا دے سکیں گے؟ اور اگر یہ سب کچھ ان لوگوں کو نہیں بتاتی تو یہاں پر کتنے دن رہ لوں گی؟ سب کی سوالیہ نگاہیں میری طرف نہیں اٹھیں گی کہ میں کیوں اپنے شوہر کے ساتھ جانا نہیں چاہتی؟ اور اگر واپس اسی جہنم میں جاتی ہوں تو ایک نہ ایک دن مجھے نوشاد علی کی ہوس کا نشانہ بننا ہی پڑے گا۔ میں اس کی خبیث فطرت کے ہاتھوں سے آخر تک تک محفوظ رہوں گی؟ کبھی نہ کبھی زور پرست وجاہت مرزا کی سازش کا شکار بننا ہی پڑیگا اور پھر — جس ڈرامائی انداز میں، میں نوشاد علی کو گھر پر بیٹھا چھوڑ کر یہاں آگئی ہوں وجاہت صاحب کے واپس آنے کے بعد اس بات پر کیا کچھ طوفان نہ اٹھ کھڑا ہوگا؟ اس کے بعد وجاہت صاحب کا سلوک میرے ساتھ کیا ہوگا؟ کون جانے؟ اب وہ کون سا قدم اٹھائیں گے؟ کسے خبر ہے؟

بنفشہ اپنے بستر پر لیٹی، آنکھوں پر ایک بازو رکھے ہی سب باتیں سوچتی رہی۔ جب بھی شجوا اٹھ کر، اس کے قریب جھک کر دیکھتی۔ بنفشہ سوتی بن جاتی۔ تمام رات اسی طرح گزرتی۔ صبح ہوتی تو سب باری باری اس کی مزاج پرسی کو آئے۔

یوں کہنے کو بنفشہ نے ہر شخص سے یہ بات بڑی آسانی سے کہدی کہ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ رات کو بہت آرام سے سوتی، مگر اس کے پوٹوں کا بھاری پن سب کو شک و شبہ میں مبتلا کر رہا تھا۔ باوجود کوشش کے وہ اپنے آپ میں اتنی بہت نہیں پادھی تھی کہ کسی سے نظر ملا کر بات کر سکے۔ یہ مرحلہ تو گزر رہی گیا لیکن جب گھر والوں نے اس سے طبیعت کی خرابی کا سبب پوچھا تو اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ گول مول جواب دیکر بھی جب اس کی جان نہ چھوٹی تو وہ پریشان ہو گئی، پوچھنے والے بھی آخر کہاں تک پوچھتے۔ سب نے یہ سوچ کر کہ زیادہ پوچھ گچھ سے اس کے ذہن پر کوئی بُرا اثر نہ پڑے۔ خاموشی اختیار کر لی۔ دو چار روز اسی خاموشی کی نظر ہو گئے۔ بنفشہ کے اندازے کے مطابق جس روز وجاہت مرزا کو واپس آنا تھا۔ اس روز صبح سے ہی بنفشہ کا چہرہ اتنا زہرا اور پریشان تھا کہ دیکھنے والے یہ سوچے بغیر نہ رہ سکے کہ آخر بنفشہ اتنی پریشان کیوں ہے؟ اس کی پریشانی اور اس کی طبیعت کی خرابی کا پس منظر کیا تھا؟

اس سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ اُس روز صبح بنفشہ نے ناشتہ بھی برائے نام سکیا۔ دوپہر کو وہ ایک قلم بھی نہ کھاسکی۔ اس کے ہاتھ پیر لمبہ بہ لمبہ ٹھنڈے پڑتے جا رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کی دھڑکنیں کسی بھی وقت ہمیشہ کے لیے رک جائیں گی اور اس کا جسم بے جان ہو جائے گا۔ اس ساری کیفیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ شام کے وقت وہ پھر بیہوش ہو گئی۔ بنفشہ کی اس دوبارہ بیہوشی نے سب کے ہاتھ پیر بچھا دیئے۔ گھر میں موجود سبھی لوگ اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگے۔ بنفشہ جس روز سے گھرا آئی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی۔

جلدی آنے لگے تھے۔ اس وقت بھی وہ گھر میں ہی موجود تھے۔ شجوت نے انہیں یہ خبر سنائی تو وہ ایک سیکنڈ کے لیے وہ شجوت کے چہرے کو تکتے ہوئے گم سم سے ہو گئے۔ پھر انگلیوں کے درمیان سلگتے ہوئے سگریٹ کو الٹش ٹرے میں مسل کر اس کے ساتھ کمرے سے باہر آگئے۔

بنفشہ جب ہوش میں آئی تو اس نے سہمی ہوتی نگاہوں سے کمرے میں موجود لوگوں کا جائزہ لیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ کہیں اس دوران میں دجاہت مرزا نہ آگئے ہوں۔ سب اس سے پوچھتے رہے، بات کرتے رہے لیکن وہ اپنے ہونٹوں پر ”چپ“ کی مہر لگا تے سہمی ہوتی اور پریشان نگاہوں سے تکتی رہی۔ آبا میاں کی ہدایت پر سب کمرے سے چلے گئے، صرف شجوت اور بڑ بھیا رہ گئے۔

شجوت نے ہر ممکن کوشش کر ڈالی کہ بنفشہ کے دل میں جو کچھ بھی ہے وہ کہہ ڈالے مگر بنفشہ دل چاہنے کے باوجود اپنی ذہنی پریشانی کا اظہار نہ کر سکی۔ بڑ بھیا تو تین روز سے مسلسل اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس وقت پھر وہ اسی ارادے سے بنفشہ کے قریب کرسی گھسیٹ کر بیٹھے تو ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بنفشہ نے مدھم اور سہمی ہوتی آواز میں کہا۔

”شعیب بھائی! میں گھر واپس نہیں جاؤں گی“

یہ ایک جملہ کہنے کے لیے بنفشہ جانے کب سے اپنے آپ میں ہمت پیدا کر رہی تھی۔ بنفشہ اپنی بات کہہ کر خاموش ہو گئی۔ بڑ بھیا اور شجوت کے چہرے کا رد عمل دیکھنے کی اس نے کوشش ہی نہ کی۔ دونوں بازو اپنے چہرے پر رکھ کر اپنی آنکھوں کو چھپا لیا، لیکن اس کے یہ چند الفاظ بڑ بھیا کے دماغ پر ہتھوڑے

برس گئے۔ وہ حیرت و استعجاب کی تصویر بنے اس کی طرف دیکھتے رہے اور شجوت کی حیرت زدہ نگاہیں بڑ بھیا کے چہرے پر جمی کی جی رہ گئیں۔ چند منٹ اسی حیرت زدہ سی منجمد خاموشی کی نظر ہو گئے۔ بڑ بھیا کو ایسا لگا جیسے ان کے دماغ میں اب سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رہی ہو۔ لمحہ بہ لمحہ جب یہ کیفیت دور ہوتی تو انہوں نے بڑی آہستگی سے بنفشہ کے بازو اس کے چہرے پر سے ہٹائے اور کہا۔

”تم نے کیا سوچ کر یہ فیصلہ کیا ہے؟“

بنفشہ خاموش رہی۔

”جانتی ہو اس جملے کا مطلب کیا ہے؟ بڑ بھیا نے پوچھا۔

بنفشہ نے ایک دہی ہوتی سانس لیکر کہا۔

”جانتی ہوں، لیکن میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں“

شجوت کی پریشانی اس وقت دیکھنے سے قلعن رکھتی تھی اور بڑ بھیا تو تھے ہی

پریشان۔۔۔

”کیا گھر سے لڑ کر آئی ہو؟ بڑ بھیا نے پوچھا۔

بڑ بھیا کی اس بات کے جواب میں بنفشہ نے اتنی اداس نظروں سے ان کی طرف دیکھا کہ بڑ بھیا کا دل ڈکھ کر رہ گیا مگر فوراً ہی انہوں نے سنبھل کر کہا ”میری بات کا جواب تو دو“

بیری عادت اور میری فطرت سے واقف ہونے کے باوجود آپ مجھ سے

یہ سوال کر رہے ہیں؟ بنفشہ نے کہا۔

بڑ بھیا کا سر جھٹک گیا۔

کی کہ اس معاملے میں کسی سے کچھ نہ پوچھا جاتے۔

اس وقت ترسب نے خاموشی اختیار کر لی لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں تھی کہ سب چپ لگا کر بیٹھ جاتے۔ وہ دن اور اس کے بعد مزید دو دن گزر گئے۔ وجاہت مرزا نے خود آتے زمان کا ٹیلی فون آیا۔ جبکہ بنفشہ کو شرف سے اس بات کی اطلاع مل چکی تھی کہ وجاہت واپس آچکے ہیں۔ بنفشہ نے وجاہت مرزا کی عدم موجودگی میں گھر پر ٹیلی فون کر کے شرف سے بات کی تھی۔ بنفشہ کے لیے یہ بھی کوئی قابل اطمینان بات نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کیا کرے؟ کیا نہ کرے۔ پریشانیوں اور دوسروں نے اس کے دل کو بالکل کمزور کر دیا تھا۔ دماغ بھاری بوجھ تلے دب کر بالکل آدھ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف اپنی پریشانی اور دوسری طرف یہ فکر کہ وہ ایک بار پھر گھر والوں کے اوپر بوجھ بن گئی ہے۔ گھر والے اس کی طرف سے الگ پریشان تھے۔ فکر اور پریشانی کے انہی لمحات میں ایک شام وجاہت مرزا اسے لینے آگئے۔ شیخو نے اسے وجاہت مرزا کے آنے کی اطلاع دی تو اس کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ کر گر پڑی۔ اسی وقت اس نے اماں بیگم کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان کے قریب آتے ہی بنفشہ ان سے لپٹ گئی اور بڑی سہمی ہوئی مدھم آواز میں کہا: ”میں نہیں جاؤں گی اماں بیگم! مجھے نہ بھیجئے۔“

”تم گھر آدمت بیٹ! جب تک تمہاری مرضی نہیں ہوگی میں ہرگز تم سے جانے کے لیے نہیں کہوں گی۔“

اماں بیگم نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر اسے آرام سے کرسی پر بٹھا دیا۔ انہیں فوراً ہی احساس ہوا کہ بنفشہ کے ہاتھ برف کی

”اس گھر میں، میں نے زندگی کے کتنے برس گزارے ہیں، میرا کبھی کسی کے ساتھ جھگڑا ہوا؟ بنفشہ نے پوچھا۔

”میاں بیوی کی بات بالکل مختلف ہوتی ہے۔ بڑھتیانے فوراً بات بناتی۔“

”جھگڑا کرنے سے بہتر میں یہ سمجھتی ہوں کہ دوسرے کی بات سن کر سر جھکا

”دل“ بنفشہ نے کہا۔

”تو پھر اب آخر ایسی کون سی بات ہو گئی؟“ بڑھتیانے پوچھا

”یہ بتانے کی ہمت مجھ میں بالکل نہیں“ بنفشہ نے کہا۔

”بتا دیجئے نا بنفشہ باجی! آپ کو اندازہ نہیں ہم لوگ کتنے پریشان ہیں؟“

شیخو رانی نے کہا۔

”مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔ شیخو! لیکن میں بہت مجبور ہوں۔“

بنفشہ نے دکھ سے کہا۔

پھر آہستہ آہستہ ہر فرد کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ بنفشہ اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتی۔ جس جس کے کانوں میں بھی یہ بات پڑی۔ اس کی پریشانی اور حیرانی دو چند ہو گئی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بنفشہ کی اس بات کا سرا کہاں لے جا کر جوڑے۔ وہ لوگ اس معاملے پر جتنا زیادہ سوچتے تھے۔ اتنا ہی ان کا دماغ الجھتا جاتا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ بنفشہ اس سلسلے میں مزید کچھ بتانے پر قطعی آمادہ نہیں تھی، نہ صرف یہ بلکہ وہ اس بات کے لیے بھی راضی نہیں تھی کہ اس سلسلے میں وجاہت مرزا سے کچھ پوچھا جائے۔ جب سب نے اصرار کیا تو اس نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بڑی حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے التجا

طرح ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ وجاہت مرزا نے جب بنفشہ کو گھر لیجانے کا ارادہ ظاہر کیا تو آبامیاں نے اس کی ناسازی طبع کا ذکر کر کے اسے کچھ دن کے لیے اور چھوڑ جانے کے لیے کہہ دیا۔ وجاہت مرزا کے دل میں چور تھا۔ یہاں آتے ہوئے ان کے دل میں یہ ڈر تھا کہ ہمیں بنفشہ نے گھر میں کچھ کہہ نہ دیا ہو۔ لیکن گھر کے کسی فرد کی کسی بھی بات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ ان کے علم میں کوئی بات ہے۔ انہیں اطمینان ہو گیا کہ بنفشہ اگرچہ بات کی تہہ تک پہنچ گئی ہے لیکن اس نے گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا ہے۔

وجاہت مرزا جب بنفشہ سے ملنے کے لیے اندر آئے تو وہ اپنے بستر پر بے سدھ لیٹی تھی۔ شجوا اس کے سر ہانے بیٹھی اس کا سر دوبارہ ہی تھپی اور آتاں بیگم اس کے قریب آرام کر سی پر بیٹھی بڑی گہری سوچوں میں گم تھیں۔ وجاہت مرزا تھوڑی دیر بنفشہ کے پاس بیٹھ کر اس کی مزاج پرسی کر کے چلے گئے۔ ان کے کمرے میں آنے پر آتاں بیگم تو کچھ دیر بعد اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں لیکن شجوا نے بنفشہ کو ایک منٹ کے لیے بھی تنہا نہیں چھوڑا۔ وجاہت مرزا کے جانے تک بنفشہ ذہنی طور پر بالکل بے سکون ہو چکی تھی۔ آتاں بیگم جب دوبارہ اس کے کمرے میں آئیں تو شجوا سے سہارا دیتے گلو کو زپلاہ ہی تھی۔ انہوں نے پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور درپٹے کے قریب والی کرسی پر گم سٹم سی بیٹھ گئیں چند منٹ بعد جب شجوا اٹھ کر کسی کام سے باہر گئی تو آتاں بیگم بنفشہ کے نزدیک آکر بیٹھ گئیں۔ گھما پھر کر وہ پھر اصل موضوع کی طرف آگئیں۔ جب بنفشہ کسی طرح بھی اپنی زبان کھولنے پر راضی نہیں ہوتی تو ان کی آنکھیں بھرتیں۔ انہوں نے گلو کو آواز میں کہا۔

”دیکھو بیٹی! اگر تم مجھے سچ سچ اپنی ماں سمجھتی ہو تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔“
ان کی یہ بات سن کر بنفشہ کا دل کرجی کرجی ہو کر رہ گیا۔
”اگر آج تمہاری ماں ہوتی تو تم اس سے سب کچھ کہہ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں؟“ آتاں بیگم نے کہا۔
”میں نے ہمیشہ آپ ہی کو اپنی ماں سمجھا ہے۔ اس عورت کو نہیں جو بچپن میں مجھے اور میرے باپ کو پریشانی میں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔“
بنفشہ نے غمزہ آواز میں کہا۔

”تو چترم سوچو! تم میرے ساتھ کس قدر نا انصافی کر رہی ہو؟“
آتاں بیگم نے کہا۔

بنفشہ سر جھکا تے خاموش بیٹھی رہی۔

”بیٹیاں اپنی ماؤں سے بھی کوئی بات چھپا کر تی ہیں؟“ آتاں بیگم نے کہا۔
اور جب آتاں بیگم نے بنفشہ کو اپنی جان کی قسم دی تو بنفشہ بالکل بے بس ہو گئی۔
اس نے مشکل تمام مختصر الفاظ میں آتاں بیگم کو اپنی نئی زندگی کی داستان سنا دی اور آخری چند جملے کہتے ہوئے اس کی سچکیاں بندھ گئیں۔ آتاں بیگم کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ بنفشہ وجاہت مرزا کے ساتھ اس قدر عذاب کی زندگی گزار رہی ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے منہ کھولے حیرت زدہ سی بیٹھی اس کی داستان غم سن رہی تھیں۔ بنفشہ کی داستان ختم ہوئی تو انہوں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگایا اور اداس ہو کر کہا۔

”بیٹی! مجھے کیا معلوم تھا کہ میں نے تمہیں جہنم میں جھونک دیا ہے۔“

”اس میں آپ کا تو کوئی تصور نہیں آتا بیگم! بنفشہ نے بچکیوں کے درمیان کہا۔
”میں تو یہ سوچ کر خوش تھی کہ تمہارے دکھ کے دن گزر گئے ہیں، وجاہت
کے ساتھ تم عیش و آرام اور سکھ چین کی زندگی بسر کر رہی ہو“ اماں بیگم نے کہا۔
بنفشہ ان کے سینے سے ہنسی سکتی رہی۔

”تم نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا ہے بنفشہ! تمہیں شروع میں ہی ہم لوگوں کو
بتا دینا چاہیے تھا کہ وجاہت کس قماش کا آدمی ہے“ اماں بیگم نے کہا۔
”میں نے تو یہ فیصلہ کیا تھا۔ اماں بیگم! کہ اب چاہے مرجاؤں لیکن آپ لوگوں
کے سامنے اپنے کسی دکھ کا اظہار نہیں کروں گی“ بنفشہ نے کہا۔
”آخر کیوں؟“ اماں بیگم نے حیران ہو کر پوچھا۔

”آپ لوگ ہمیشہ میری طرف سے فکرمند اور پریشان ہی رہے ہیں۔ میں نہیں
چاہتی غمی کہ میری ذات سے آپ لوگوں کو مزید کوئی تکلیف پہنچے“ بنفشہ نے کہا۔
”اولاد کی فکر تو ماں باپ کو مرتے دم تک لگی رہتی ہے“ اماں بیگم نے کہا۔
”میں تو اب بھی کوئی ایسا قدم نہ اٹھاتی جس سے آپ لوگوں کو میری گھریلو پریشانیوں
کا علم ہوتا اگر حالات مجھے اس طرح مجبور نہ کر دیتے“ بنفشہ نے کہا۔
اماں بیگم غمزہ سی بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہیں۔

”اُس وقت پریشانی میں مجھے سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں سوچا کہ میں
یہاں آجاؤں“ بنفشہ نے کہا بیٹیاں اگر سسرال میں پریشان ہوں تو میکے میں ہی آیا کرتی
ہیں۔ پھر تمہیں کسی اور راستے پر جانے کی بجلا کیا ضرورت تھی؟“ اماں بیگم نے کہا۔
اور بنفشہ کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

بنفشہ کی آنکھوں کے خشک ساحل ایک بار پھر میٹک گئے۔ اتنے دنوں سے
انے جو بند باندھ رکھا تھا وہ آج ٹوٹ گیا اور آنتوں کا ایک سیلاب جاری ہو گیا
ہا پورا وجود بچکیوں سے لرزنے لگا۔ اماں بیگم نے اسے چپ کرانے کی بہت
تش کی لیکن بنفشہ کے آنسو کی طرح نہ تھے۔ اس کی حالت یہاں تک بنفشہ کے
اند پر لگتی۔ اماں بیگم نے اپنی مدد کے لیے ٹیکل بھیا کو پکارا۔ ٹیکل بھیا تو جانے
رہتے ہا البتہ شجورانی فوراً ہی اندر آ گئیں۔ جوڑی دیر سے کمرے کے باہر ہی
رہا رہی تھیں۔ ان کا دل تو کئی باجھا ہوا تھا کہ اندر آ کر ان دنوں کی باتیں سنیں لیکن
نے کیا سوچا کہ انہوں نے باہر ہی کھڑے رہنے میں مصلحت سمجھی۔

شجور نے بنفشہ کو آرام اور آہستگی سے بستر پر لٹا دیا اور اُلٹے قدموں آبا میاں
بلانے چل دیں۔ آبا میاں مغرب کی نماز پڑھ کر فارغ ہی ہوتے تھے۔ جاء نماز دکھ
وہ شجور کے ساتھ کمرے سے باہر آ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بنفشہ کے کمرے میں
سب کا جھگڑا ہو گیا۔ سب کے چہرے پریشان اور فکرمند تھے۔ تھوڑی دیر
بنفشہ کی حالت بہتر ہوئی تو شجور کو اس کے پاس چھوڑ کر باقی سب لوگ چلے گئے۔
پھر اماں بیگم نے تنہائی میں وہ ساری داستان آبا میاں کے گوش گزار کر دی
بنفشہ نے انہیں سنائی تھی۔ آہستہ آہستہ گھر کے سبھی لوگوں کو یہ بات معلوم ہو
ئی کہ بنفشہ کی اچانک طبیعت خراب ہو جانے کی اصل وجہ کیا ہے؟ جس جس
نے بھی سنا وہ سر سر کہہ رہ گیا۔ بنفشہ کے ساتھ سب کی ہمدردی اپنی جگہ پر
نی لیکن اس کے ساتھ فکر اور پریشانی نے اور آگھیرا۔ وجاہت مرزا کو سب نے
نت ملامت کیا۔ مگر صرف ان کی پیٹھ پیچھے لعنت ملامت کرنے سے تو یہ

مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں تو بنفشہ کی آئندہ تمام زندگی کا سوال تھا۔ اس کے لیے کوئی عملی قدم اٹھانا ضروری تھا۔ آبامیاں نے اسی وقت سب کے سامنے اپنا آخری اور قطعی فیصلہ سنا دیا کہ اب چاہے جو کچھ بھی ہو جائے۔ بنفشہ اس گھر میں نہیں جائے گی۔

بنفشہ نے کہنے کو تو اماں بیگم سے سب کچھ کہ دیا۔ کیسے کہا؟ کس طرح کہا؟ یہ اس کا ہی دل جانتا تھا۔ الفاظ کا سہارا لینے کی خاطر اسے خشکوں کے کنکریوں سے گزرا کر نا پڑا۔ اس کا اندازہ سوائے اس کے اور کسی کو نہ ہو سکا۔ لیکن جانے کیا بات تھی کہ سب کچھ کہ دینے کے باوجود بھی اس کا ذہن پرسکون نہ ہو سکا۔ دل کا عذاب بھی کم ہوا، دماغ کا بوجھ بھی کم ہوا مگر بنفشہ اپنے ذہن کو اُلجھ اُلجھ خیالات اور طویل سوچوں سے آزاد نہ کر سکی۔ مستقبل کے اندیشے ہر وقت اسے فکر مند رکھتے تھے۔ وقت اور حالات نے اسے قدم قدم پر جو ٹھوکریں لگائی تھیں۔ انہوں نے اس کا دل شکستہ کر دیا تھا۔ پلے در پلے ناکامیوں نے اس کے ذہن کو تھکا کر رکھ دیا تھا۔ اس آخری ٹھوکرنے کو اسے اس قدر مایوس کیا تھا کہ اس کا دل ہر لمحے مرجانے کو چاہتا تھا۔ پھر بھی نہیں معلوم تھا کہ یہی آخری ٹھوکرہ ہے یا زندگی کی راہوں میں چلتے چلتے ابھی کچھ اور ٹھوکروں کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔

دجاہت مرزا جب دوسری بار بنفشہ کو لینے آئے تو آبامیاں نے صاف انکار کر دیا۔ انہیں شاید اس بات کی توقع نہیں تھی وہ بھونچکے رہ گئے۔ آبامیاں نے کوئی بات ڈھکی چھپی رکھنے کے بجائے صاف صاف بات کر کے دجاہت مرزا کے لیے ایک کھانا بھیج دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔

دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔ دجاہت مرزا نے اس کھانا کو کھانے سے انکار کر دیا۔

کی بات عدالت تک پہنچے، یہ مجھے منظور نہیں، گھر والوں کی عزت پر کوئی حرف آئے یہ مجھے گوارا نہیں۔“

”لیکن ہمارا دل بھی تو یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ کو اسی جہنم میں دوبارہ جھونک دیں۔“ شیجوتے کہا۔

میں تو خود اس جہنم میں نہیں جانا چاہتی۔ شیجو! لیکن کیا میں اسی طرح اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔“ بنفشہ نے کہا۔

”کس طرح؟“ شیجوتے پوچھا۔

”میرا مطلب ہے کہ میں طلاق لیے بغیر اس گھر میں نہیں رہ سکتی۔“ بنفشہ نے انتہائی مصیبت سے پوچھا۔

”اس کا سوال نہیں ہے۔ بنفشہ باجی! شیجوتے کہا۔

”پھر؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

یہاں تو سوال آپ کی آئندہ زندگی کا ہے، آخر آپ ساری زندگی اس طرح کیسے گزار سکتی ہیں؟“ شیجوتے کہا۔

”تم اس کی فکر نہ کرو، میں کسی نہ کسی طرح زندگی گزار ہی لوں گی۔“ بنفشہ نے کہا۔

”لیکن ہمارا دل اس بات کو ہرگز برداشت نہیں کرے گا۔“

شیجوتے کہا۔

جب شیجوتے بنفشہ کی بات ابا میاں تک پہنچانے سے قطعی انکار کر دیا تو بنفشہ کو سوائے اس کے اور کچھ نہ سوجھا کہ وہ ”بڑھیا“ کی خوشامد کر ڈالے۔ لیکن بڑھیا سے اس نوعیت کی بات کرنا اسے بہت دشوار معلوم ہو رہا تھا۔ اگر

خود کوئی ذکر چھپرتے تو شاید اس کی ہمت بندھتی۔ مگر بڑھیا کو جانے کیا ہو گیا نا کہ جب سے انہیں اصل واقعہ معلوم ہوا تھا وہ بالکل کم سم سے ہو کر رہ گئے تھے۔ نشہ کے پاس بہت کم آتے تھے اور جب آتے تھے تو صرف چند منٹ کے لیے منٹ کے اس مختصر عرصے میں وہ اس کی مزاح پر ہنسی کرتے، دو ایک باتیں ہر ادھر کی کرتے اور چل دیتے۔ بنفشہ کے علاوہ شیجو کو بھی بڑھیا کی یہ بات بہت محسوس ہوتی تھی لیکن وہ کوئی مناسب موقع دیکھ کر اس موضوع پر بڑھیا سے بات کرنا چاہتی تھی۔

و جاہت مرزا کی آمد کے دو تین روز بعد بنفشہ نے مشکل تمام اپنے دل بات بڑھیا سے کہی۔ بڑھیا اس کی بات سن کر چند منٹ تک پلکیں پکاتے بغیر اس کی طرف دیکھتے رہے مگر بنفشہ میں اتنی تاب کہاں تھی کہ اپنی ت ان سے کہہ دینے کے بعد ان سے نظریں ملا سکتی۔ وہ سر جھکاتے بیٹھی تھی۔ بڑھیا انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کئی سیکنڈ تک لکھتے دکھ خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر بڑھیا کی مدھم سی آواز کرے کے موت ماحول میں گونجی۔ ”تمہیں مجھ سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے بنفشہ!“ بنفشہ نے کچھ کہے بغیر ان کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

”تم جس انداز سے سوچ رہی ہو وہ بہت غلط ہے۔“ بڑھیا نے کہا۔

”کیوں؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”تم اپنے اوپر مزید ظلم کیوں کرنا چاہتی ہو؟“

”کیا ظلم؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”تم اپنے اُوپر پہلے ہی بہت ظلم توڑ چکی ہو“ بڑھیا نے کہا۔
 ”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی“ بنفشہ نے کہا۔

”تم نے شروع میں ہی ہم لوگوں کو یہ بات کیوں نہیں بتائی کہ وجاہت نے تمہاری زندگی عذاب بنا رکھی ہے؟“ بڑھیا نے کہا۔

بنفشہ نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک دینی ہوتی سانس لیکر رہ گئی چند سیکنڈ کے لیے کمرے میں پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں اپنی اپنی سرچوں میں گم بیٹھے رہے۔ پھر اچانک بنفشہ کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کہیں اس خاموشی میں میری بات ادھوری نہ رہ جاتے۔ یہی سوچ کر اس نے بڑھیا کی طرف دیکھا اور مدھم آواز میں بولی۔

”پھر آپ نے کیا سوچا؟ آپ میری بات ابامیاں تک پہنچا دیں گے نا؟“
 بڑھیا نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”تم حماقت کی بات مت کرو بنفشہ! جو کچھ ہم لوگ بہتر سمجھیں گے وہی کریں گے“

اس سے پہلے کہ بنفشہ کچھ اور کہتی بڑھیا اٹھ کر چل دیے۔

بنفشہ نے انہیں آواز دینی چاہی لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں تک آکر ٹھہر گئے۔ اس نے پلکیں جھپکاتے ہوئے آہستہ آہستہ ہلتے ہوئے پردوں کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں چھپا کر میز کے کنارے پر مڑ ٹیک دیا۔

پھر ایسا ہوا کہ وجاہت مرزا کے ساتھ ابامیاں اور گھر کے دوسرے مردوں کی بخش آئے دن ہونے لگیں۔ ابامیاں نے اپنی دھمکی کو ابھی تک عملی جامہ نہیں پہنایا تھا وہ چاہتے تھے کہ گھر کی بات گھر ہی تک رہے عدالت تک نہ پہنچے۔ مگر وجاہت مرزا نے مستقل ڈھسائی پر کمر باندھ رکھی تھی جب ابامیاں بالکل ہی تنگ آ گئے۔ تو انہوں نے وجاہت مرزا کو آخری بار وارننگ دے دی۔ ادھر بنفشہ ٹکڑ پریشانی کے مارے دن بدن گھلتی جا رہی تھی اس موقع پر جب شیخو اور بڑھیا بھی اس کے کسی کام نہ آئے تو اس نے ہمت کر کے اماں بیگم سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

”تم توبے و توفی کی باتیں کرتی ہو بیٹی! اماں بیگم نے کہا۔

بنفشہ نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ اماں بیگم بولیں۔
 ”اس معاملے میں نہیں کچھ کہنے کی بالکل اجازت نہیں، آخر آئندہ تمام زندگی کس طرح گزارو گی؟“

”کسی طرح گزارا ہی لوں گی لیکن آپ لوگوں کی رسوائی میں بالکل برداشت نہیں کر سکتی“ بنفشہ نے مشکل تمام کہا اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

اماں بیگم نے اپنے انچل سے اس کی آنسو پونچھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی تو اس کا زخمی دل ترپ اٹھا اس نے اپنے دل کو سمجھانے کی کوشش تو بہت کی لیکن پھر بھی دل کا درد آنسوؤں کی راہ بہہ گیا۔

وجاہت مرزا کہاں تو مند پر قائم تھے کہ کسی طرح ابامیاں کی بات پر کرا

دھرنے کو ہی تیار نہ تھے اور کہاں ایک کدم ہی جانے کیا سوچھی کہ بھٹ پٹ کا غلات تیار کئے اور طلاق نامہ لاکر بھٹا دیا۔ سب نے اطمینان کا سانس لیا کہاں نازک معاملے نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ نبشتہ نے دوسری کئی باتوں کی طرح وہ رات بھی جاگ کر گزار دی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ بہہ کرتے تھے میں جذب ہوتے رہے۔ ان گنت آنسو۔۔۔ بے شمار آنسو۔۔۔ مگر آنسوؤں کا یہ سیلاب اس کی تقدیر کی سیاہی کو نہ دھو سکا۔

وجاہت مرزا نے طلاق نامہ لاکر بھٹا یا تو سب نے سکون کا سانس لیا کہ اب نبشتہ کی آئندہ زندگی کے متعلق بھی کچھ سوچا جاسکتا ہے لیکن نبشتہ کی زندگی میں اب سکھ، چین، سکون اور اطمینان نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ کتنی عرصے تھی اس کی زندگی؟ اور کس قدر اندہ گین! دقت ہمیشہ کی طرح کچھ اور آگے بڑھ گیا۔ بڑی خاموشی سے اور بڑی آہستگی سے! اس کے دامن میں یادوں کی اداس کھیاں بکیر کر اوج وقت آگے بڑھ کر گزر گیا وہ گزر گیا، پھر اس نے مر مر نہ دیکھا، پلٹ کر نہ دیکھا۔ لمحات پھر رگ رگ کر گزرنے لگے۔ نبشتہ کی زندگی میں ایک اور طوفان آکر گزر گیا۔ طوفان سدا رہنے کے لئے نہیں آتے۔ وہ آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے ایسی چیزیں اور ایسی نشانیاں چھوڑ جاتے ہیں جو عمر بھر سوائے تکلیف پہنچانے کے اور کچھ نہیں کرتیں۔

یہ آخری زخم، یہ آخری ٹھوکر اور یہ آخری طوفان ایسا نہیں تھا جسے نبشتہ آسانی سے برداشت کر لیتی۔ زندگی کی ان پیہم ناکامیوں نے اسے کچھ اس درجہ شکستہ دل کیا کہ وہ جینے کا حوصلہ ہار بیٹھی۔ دل سے ہر لمحہ ہی صدا آتی تھی۔ تم جو

یوں بے سوچے جا رہی ہو تو اس کا مقصد کیا ہے؟ تمہاری ذات سے کسی کو سکھ چین اور آرام نہیں ملا۔ خود نہیں اس دنیا میں رہ کر کیا ملا؟ دکھ، درد، رنج و غم، زخم اور سسکیاں۔ پھر ایسی زندگی کا فائدہ؟ کاش! خود کتنی حرام۔۔۔ تو۔۔۔ اور اس کے آگے اس کی سوچیں منجمد ہو جائیں، اس کا دماغ اس کے خیالات کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتا۔

روز و شب کی ان الجھی ہوئی سوچوں اور پریشان خیالات نے نبشتہ کو بیمار ڈال دیا گھر کا ہر فرد اسے خوش و خرم رکھنے اور اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ آبائیاں بڑی پابندی سے اس کا علاج کروا رہے تھے۔ کبھی آپا جان اسے اپنے گھر لے جا کر رکھنے کی پیشکش کرتیں، کبھی چھٹ باجی اصرار کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتیں لیکن اسے خوش و خرم رکھنے کی ان تمام کوششوں کا نتیجہ صرف یہ نکل رہا تھا کہ وہ دن بدن زرد اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ جاتے اور دل بھاری بوجھ تلے دتبا ہوا غموس ہوتا ایک دن اس کی میہوشی نے اتنی طوالت اختیار کی کہ گھر والوں کے علاوہ خود ڈاکٹر بھی پریشان ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے نبشتہ مستقل طور پر بستر سے لگ گئی۔

نبشتہ کی اس بیماری نے سب کا دل کا چین اور راتوں کی میند حرام کر دی۔ گھر کا ماحول بہت عجیب سا ہو کر رہ گیا۔ ہر طرف ویرانی اور سوگوار سی چھا گئی۔ شجور صبح اٹھ کر بڑی بدولی سے یونورسٹی چلی جاتی، سارا دن وہاں نبشتہ کے لئے پریشان اور فکر مند رہتی، گھر آکر حتی الامکان اسے ہنسنانے اور اس کی دلجوئی کرنے کی کوشش کرتی اور نمازیں پڑھ کر نبشتہ کی صحت یابی کے لئے بڑے شعور و خنوع سے

و عائیں مانگتی۔ بڑھتی کے معمولات بھی اب وہ پہلے سے نہیں رہے تھے۔ وہ بہت جلدی تو گھر نہیں آتے تھے لیکن پہلے کی طرح گھر تک باہر بھی نہیں رہتے تھے ان کی پیار بھری نصیحتیں بھی نبشتہ کے دل و دماغ پر کوئی اثر نہیں کر رہی تھیں۔ ممانی جان اکثر شمع اور روحی کے ساتھ نبشتہ کی عبادت کو آتی تھیں علی تقریباً روزانہ ہی چکر لگاتا تھا اور اپنی شگفتہ باتوں سے نبشتہ کا دل بہلا کر اکثر کرتا۔ عباس بھائی گزشتہ چند مہینے سے جرمنی میں تھے ممانی جان کا کنسیہ تھا کہ اعلیٰ تعلیم کا شوق عباس کو ہم سے دوسرے گیا جب کہ علی ہمیشہ معنی خیز انداز میں مسکراتے رہتا تھا۔

”نہیں جی! مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے“

صوفیہ دو تین بار اپنے شوہر کے ساتھ نبشتہ کی عبادت کو آئی تھی۔ لیکن بھائی ان دنوں اپنے طویل کا دوبارہ دور سے پر ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر میر و سیامت کے شوق نے اس مدت میں کچھ اور اضافہ کر دیا۔ چھوٹے چچا اور چچی جان بھی کسی بار آئے مگر کچھ نادم اور کچھ شرسار سے! ان کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے نبشتہ کی بیماری کا سبب وہ لوگ خود اپنے آپ کو سمجھتے ہوں، جیسے وہ لوگ خود مجرم ہوں۔ حالانکہ نبشتہ تو زبان سے ان لوگوں سے کوئی گلہ کرتی تھی۔ اور نہ اس کی نگاہیں شکوے کا انداز لے ہوئے ہوتی تھیں۔ اسے کسی سے بھی گلہ شکوہ نہیں تھا وہ اپنی قسمت کو ان تمام حالات کا ذمہ دار ٹھہراتی تھی۔

سلسلہ روز و شب دماز سے دلاز تر ہوتا گیا۔ خوشی اور مسرت نے اس گھر سے ایک دفعہ نہ موڑا تو پھر لپٹ کر نہ دیکھا۔ اب یہاں نہ قہقہے بلند تھے

مسکراہٹیں بکھرتی تھیں۔ خاموشی مٹی اور ویرانی، ستاٹا تھا اور سوگاری بچھرا سوشی اور ویرانی میں اضافہ ہی ہوتا گیا، یہ ستاٹا اور سوگاری بڑھتی ہی چلی گئی۔ رونے کئی دفعہ سوچا کہ وہ بتا دجھانی کو خط لکھے کہ پھر ان بیگم کی اس قسم کا خیال بتا جا انہوں نے نہ صرف خود کی فطرت بھی بلکہ دوسرے کو بھی دہنی سمجھا، بھائی نے بعد میں بھی کئی خط لکھے لیکن سچو سے اپنی قسم نہیں توڑی، ان کے کسی خط بھی جواب نہیں دیا بلکہ دوسرے لوگوں سے بھی کہہ دیا کہ اگر کسی نے سچو کو لکھا یا اس کے خط کا جواب دیا تو اس پر سزا مراد ہوگا نہ دیکھنا حرام۔

اس روز تو اتار تھا اور موسم صبح سے ہی بہت خوشگوار تھا۔ ناشتے کے بعد شبنم نبشتہ سہارا لے کر باہر پلاٹ سے میس لے آئی اور ٹیپ ریکارڈ لاکر میز پر رکھ دیا۔ شبنم معلوم تھا کہ نبشتہ کو گلے سننے کا بہت شوق ہے اس نے پرانے پرانے شمارنے ٹیپ کر رکھے تھے۔ شبنم نے غصے سے کہا کہ باوجود اس کے گلے سبھی المیہ تھے۔ نبشتہ کے چہرے پر مسرت اور شادابی کی ایک ہلکی سی لہریاں تھیں۔ بڑھتی کہیں بانے کے لئے اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلے لیکن نبشتہ اور شبنم کو باہر بیٹھا دیکھ کر انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، کرسی گھسیٹ کر وہ بھی وہیں بیٹھ گئے۔ بڑھتی اور شبنم کافی دیر تک بیٹھے بالکل فضول قسم کی باتیں کر کے نبشتہ کو منہساتے رہے اس دن کے بعد سے بھی نے یہ بات شبنم کی کہ نبشتہ کی حالت قدرے سنبھل گئی ہے اس خوشگوار سی تبدیلی کے بعد کئی دن گزر گئے۔ سب کے دلوں کو ایک ذرا سا اطمینان ہوا کہ نبشتہ کے ہونٹوں نے بھی پھر سے مسکرایا سیکھا۔ وادی اماں کا خیال تھا کہ ان کے لمبے لمبے دلیقوں اور دعاؤں نے یہ اثر دکھایا ہے، شبنم کو یقین تھا کہ

نبشتہ کی طبیعت میں یہ تبدیلی عارضی اور مختصر نہیں ثابت ہوگی، آتی ہوئی بہار کی رت نبشتہ کی صحت کو بہتر سے بہتر ہی کرے گی۔ بہار ابھی آئی نہیں تھی، لیکن خاموش چپ چاپ گشت پر نگاہ ڈالتے ہی احساس ہوتا تھا کہ بہار کی آمد آمد ہے لکیاں چمکنے کے لئے بے چین ہیں، پھول مسکرا اٹھنے کے لئے بے تاب ہیں اور درخت پھر سے سرسبز ہونے کے منتظر ہیں۔

اس روز بہار کی پہلی صبح تھی اور نبشتہ اپنے نمر سے کے در پیچھے کے سامنے یزنی چہرہ پر نیم دراز باہر لان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بہار کی اس پہلی صبح نے سچ پچ نبشتہ کے چہرے پر ایک مہکاسا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ شجہ دوپہر کو یونیورسٹی سے واپس آئی تو نبشتہ کی طرف دیکھ کر مڑے پیار سے مسکرائی اور اس کے شانے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔

”نبشتہ باجی! مجھے یقین ہے کہ آپ چند ہی روز میں انشاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

نبشتہ نے شجہ کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا، پلکیں جھپکائے فرش کی طرف نکلتی رہی۔

روز و شب بڑی خاموشی سے گزرنے لگے۔ شجہ بہار کی ان حسین شاموں کو ڈوبتے ہوئے دیکھتی تو جانے کیوں اس کے دل سے آواز آتی — شجہ! بھر کے اس خاموش ماحول میں کوئی ہنگامہ جاگنے والا ہے — شاید کوئی تبدیلی آنے والی ہے — کوئی انقلاب آنے والا ہے کیسا ہنگامہ؟ کیسی تبدیلی اور کیسا انقلاب؟ اس کے اسے کوئی جواب نہ ملتا۔ اور — اس روز — بہار کی

آخری صبح تھی اور اتوار تھا۔ دھوپ آہستہ آہستہ سرک کر دیوار سے نیچے فرش تک آ پہنچی لیکن نبشتہ کی نیند نہیں ٹوٹی۔ دو دفعہ شجہ نے اسے اٹھانے کی کوشش کی، ایک دفعہ اماں بیگم اگر جگا گئیں، دادی اماں نے بھی دو مین بار اسے پکار کر اٹھانے کی کوشش کی، اسے بیٹا اٹھ جاؤ، دیکھو کتنی دن چر دھا آیا، کب تک سووگی بیٹا! اٹھ کر ناشتہ تو کرو۔

نبشتہ نے دو ایک بار آنکھیں کھول کر دیکھا تو مزہ نہیں پھر کر وٹ بدل کر سو گئی پھر آبا میاں نے یہ لکھ کر نبشتہ کو اٹھانے سے منع کر دیا کہ ممکن ہے رات کو دیر تک جاگتی رہی ہو، اس کی نیند نہ پوری ہوئی ہو۔ اور — یہ حقیقت تھی کہ نبشتہ نے گزشتہ رات کا بیشتر حصہ جاگ کر گزارا تھا۔ یادوں کی لکیاں چلتے چلتے وہ مڑھال ہو گئی، ماضی کی اداس خاموش اور سونی رہ گزرد پر چلتے چلتے وہ تھک گئی، گزرمی ہوئی شاموں اور سحر کے کارواں کو نہ کستے، کستے اس کی پپس بوجھل ہو گئیں۔ ادویوں — سکوت صبح سے کچھ دیر پہلے اس کی پلکیں نیند کے بوجھ تلے جھک گئیں۔ پھر — تقریباً دس بجے بڑی اماں کے اٹھانے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔

بڑھیا بھی ان کے ساتھ تھی۔ نبشتہ کے پوٹے بوجھل تھے اور آنکھیں بے مدد سرخ تھیں۔ بڑھیا نے حیرت زدہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا مگر خاموش رہے نبشتہ نے آنکھیں کھول کر چند لمحوں تک بڑی کھوئی کھوئی نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی، اماں بیگم اور دادی اماں کے بہت اصرار کے باوجود اس نے برائے نام سنا ناشتہ کیا۔ ناشتہ کر کے وہ پھر اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ شجہ رانی اس دن کوئی خاص چیز پکانے کے موڈ میں تھیں۔ باورچی خانے میں کافی معرفت نظر آ رہی

رکھ دیا اور بولے۔

”آخر تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

بنفشہ نے استغما میرہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے اب تم ٹھیک ہو جاؤ، بڑھتیانے کہا۔

بنفشہ کی آنکھیں ایک دم جھلک گئیں لیکن اس نے اپنے آنسوؤں کو پی لیا۔

”کیوں؟ کیا خیال ہے؟“ بڑھتیانے آہستہ سے اس کا سر ہلایا۔

”میرا دل نہیں چاہتا ٹھیک ہونے کو،“ بنفشہ نے کہا۔

”کیوں؟“ بڑھتیانے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ بنفشہ نے کہا۔

”پھر تمہارا دل کیا چاہتا ہے؟“ بڑھتیانے مسکرائے۔

”میرا دل — میرا دل مر جانے کو چاہتا ہے،“ بنفشہ نے کہا۔

”اجتنا زہاقتیں مت کرو۔“ بڑھتیانے مصنوعی ناراضگی سے کہا۔

بنفشہ خاموش رہی پھر بڑھتیانے جتنی دیر بھی اس سے باتیں کرتے رہے وہ

”ہوں“ ”ہاں“ میں جواب دیتی رہی۔ پھر بڑھتیانے ایک دم ہی غصہ کیا کہ وہ بیڑی

نڈھال اور تھکی تھکی سی لگ رہی ہے لیکن انہوں نے اپنے اس احساس کا اظہار کرنا

مناسب نہ سمجھا۔ چند منٹ بعد بنفشہ نے کہا۔

”شعیب بھائی! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں سیٹ جاؤں۔“

”اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں مگر کیوں بیٹیا چاہتی ہو تم؟“ بڑھتیانے

نے پوچھا۔

بیتیں۔ خاصی دیر تک انہیں باورچی خانے سے باہر نکلنے کی فرصت نہیں ملی پھر حجب

بنفشہ اخبار اپنے سامنے پھیل کر بیٹھی ہی تھی کہ شجورانی آگئیں بنفشہ کے سامنے بیٹھے

ہوئے وہ بولیں۔

”کل رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔“

”اچھا! کونسا خواب؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

”میں نے دیکھا کہ سجاد بھائی واپس آگئے ہیں اور آپ دلہن بنی ہوئی ہیں۔“

شجور نے کہا۔

بنفشہ نے ایک لمحے کے لئے اخبار پر سے نگاہیں ہٹا کر شجور کی طرف دیکھا اور

اور سر جھکا لیا۔

”اور شاید میں نے ایک خوشخبری آپ کو نہیں مانی،“ شجور نے کہا۔

”کونسی خوشخبری؟“ بنفشہ نے پوچھا۔

میرے عنقریب ہی بی۔ایچ ڈی کرنے کے لئے باہر جانے والی ہوں شجور نے کہا

”اچھا مبارک ہو“ بنفشہ نے کہا۔

”آپ میرے بغیر اداس نہیں ہوں گی؟“ شجور نے پوچھا۔

”یقیناً میں اداس ہو جاؤں گی“ بنفشہ نے کہا۔

اسی وقت بڑھتیانے کمرے میں آگئے۔ شجور کچھ دیر بیٹھی ان سے باتیں کرتی رہی پھر

اٹھ کر اماں بیگم کے پاس چلی گئی۔ چند منٹ کے لئے کمرے میں بالکل خاموشی چھا گئی۔

بنفشہ گھٹنے پہ ٹھوڑی لٹکائے چپ چاپ بیٹھی تھی اور بڑھتیانے بیٹھے اسی کی

طرف دیکھ رہے تھے پھر بڑھتیانے اخبار اس کے سامنے سے اٹھا کر ایک طرف

”معلوم نہیں مجھے کیا ہو رہا ہے؟“ بنفشہ نے کہا۔

”کیا محسوس کر رہی ہو تم؟“ بڑ بھتیجا ایک دم اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”معلوم نہیں کیوں میرا دل ڈوب جا رہا ہے“ بنفشہ نے بہت مدہم آواز میں کہا۔

”شبخو کو بلاؤ؟“ بڑ بھتیجا پریشان ہو کر بولے۔

”شبخو کیا کرے گی؟“ بنفشہ نے ایک دینی ہوئی سانس لی۔

”اچھا تم آرام سے لیٹو میں ابھی آتا ہوں“ بڑ بھتیجا نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

مختلطی دیر بعد جب آبا میاں، دادی اماں اور شبخو کمرے میں داخل ہوئے تو بنفشہ بالکل بے سدھ پڑی تھی اسے اپنے ارد گرد کا بالکل ہوش نہیں تھا۔ آبا میاں نے ڈاکٹر اشفاق کو فون کیا جو بنفشہ کا علاج کر رہے تھے مکہ وہ گھر پہ نہیں تھے۔ ٹیکسیل بھتیجا دوسرے ڈاکٹر کو لانے کے لئے چلے گئے۔ ڈاکٹر کے آنے تک دادی اماں بڑی اماں اور اماں بیگم بنفشہ کو ہوش میں لانے کے لئے اپنی سی کوششیں کرتی رہیں لیکن بنفشہ کو ڈاکٹر کے آنے پر ہی ہوش آیا۔

دوپہر کا کھانا سب نے انفرادی میں کھایا بنفشہ باوجود کوشش کے ایک لقمہ بھی نہ کھا سکی۔ دادی اماں نے ایک لقمہ بنا کر بڑی شفقت و محبت سے اپنے ہاتھوں سے اس کے منہ میں ڈالا تو فوراً اسے ابکا فی اگئی پھر جیسے جیسے دوپہر ڈھلتی گئی بنفشہ کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے گہڑتی گئی اور جب شام آئی تو بنفشہ ایک بار پھر بیہوش ہو چکی تھی بنفشہ بیہوش ہو گئی اور گھر کے دو دیوار ایک بے نام سی اداسی اور سوگوار کی کا لبادہ اوڑھ کر آنے والے لمحات کے منظر ہو گئے یہ بہار کی شام تھی۔

رضعت ہوتی ہوئی بہار کی شام — بہار کی آخری شام رضعت ہو جانے والے لمحات کا سوگ ماحول پر جاری تھا۔ بڑے المناک سے لمحات تھے اور بڑی غمناک سی ساقبت تھیں۔

شبخو کو بالکل یاد نہ آ سکا کہ اپنی زندگی کے پچھلے تمام برسوں میں اتنی انصرہ سی شام بھی اس کی نگاہوں سے گزری ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہر طرف سے دبی دبی سسکیوں کی آواز آرہی ہو۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ہر دروازے پر کوئی پر پر اسرار وجود کھڑا دنگ دے رہا ہو — جانے کون دنگ دے رہا تھا؟ جانے کیسی تھیں یہ صدائیں؟ کوئی نظر بھی نہیں آتا تھا لیکن پھر بھی ہر لمحہ کسی کے اندر آنے اور باہر جانے کی مدہم سی چاب سنائی دیتی تھی۔ دبی دبی سسکیوں کی آوازیں ہر لمحہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ شام ڈوبتی جا رہی تھی۔ ڈھلتی ہوئی مدہم مدہم دھوپ میں۔ درختوں کے سائے طویل ہو گئے تھے۔ زیریں پر کھڑے ہوئے چپا کے زرد پھول ایک حریت ویاس کے عالم میں آسمان کی دستوں کو تنک رہے تھے ہوا لگنے درختوں کے درمیان سسکیاں بھرتی ہوئی گزر رہی تھی مغرب کی سمت سورج نے چپکے سے دم توڑا آسمان لالہ لالہ ہو کر جانے کس کی بھیجی ہوئی حسرتوں پر ماتم کنناں ہو گیا۔ سوگوار فضاؤں کا سکوت کچھ اور بڑھ گیا۔ دبی دبی سسکیوں کی آوازیں کچھ اور بلند کچھ اور غمناک ہو گئیں۔ دروازوں پر دنگ کی آوازیں اندر بلند ہو گئیں — اور پر اسرار سرسراہٹوں کی آواز کچھ اور شدید ہو گئی۔

ڈاکٹر کے ساتھ گھر کے تقریباً سبھی افراد اسی ایک کمرے میں جمع تھے — بنفشہ کے ارد گرد — کچھ بیٹھے تھے کچھ کھڑے تھے — سب کے چہرے

انصرودہ تھے اور پریشان — سب کی نگاہیں سہمی ہوئی تھیں — آنے والے لمحات کے خوف سے — اور سب منتظر تھے — اس ایک ساعت کے جب بنفشہ آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھے گی — اماں بیگم کی حالت سب سے زیادہ غیر متوقعی تشکیل بخیا انہیں بار بار تسلی دے رہے تھے اور ان سے اصرار کر رہے تھے — کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کریں مگر وہ کسی طرح اس کمرے سے جانے کے لئے رضامند نہیں ہو رہی تھیں — کمرے کے باہر برآمدے میں دادی اماں مصیبت بچھلے تسبیح کے دانوں پر جانے کو ن سادھ بیٹھ رہی تھی — بڑھیا بنفشہ کے سر ہانے کھڑے چپ چاپ اس کی صورت تکے جا رہے تھے — ضبط کی کوشش کے باوجود وہ اپنے دلی جذبات کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہے تھے — انہوں نے کئی بار بنفشہ کے چہرے اور بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے اٹھایا —

”بنفشہ!“

”آنکھیں کھولو بنفشہ!“

”میری طرف دیکھو بنفشہ!“

پھر — وہ لمحہ بھی آیا جب — بنفشہ کی بند آنکھوں میں ہلکی سی جنبش ہوئی اس کی پکیں دھیرے سے کانپ کر رہ گئیں مگر آنکھیں پھر بھی نہ کھل سکیں — کئی اور لمحے سوگوار سی خاموشی کا دامن قحام کر آگے بڑھ گئے تو بنفشہ نے بڑی آہستگی سے آنکھیں کھولیں مگر کھل کر اپنے ارد گرد دیکھا اور دھیرے سے بولی —

”یہ کیسا اندھیرا چھا تا جا رہا ہے؟“

بڑھیا اس کے سامنے آگئی —

”بنفشہ!“ انہوں نے انتہائی والمانہ انداز سے اسے پکارا —

بنفشہ ان کی بات کا جواب دیتے بغیر بولی —

”سب کے چہرے اتنے دھندلے کیوں نظر آ رہے ہیں؟“

آبامیاں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو بنفشہ نے کہا —

”میرا دل ڈوب رہا ہے آبامیاں! میرا دل ڈوب رہا ہے“

”نہیں بیٹی! تم بالکل ٹھیک ہو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی!“

آبامیاں نے کہا —

بڑھیا نے بھی آہستہ سے اس کا ہاتھ قحام کر تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بنفشہ،

”شعیب بھائی آپ.....“ کہہ کر خاموش ہو گئی، اس کی ادھوری

بات پوری نہ ہو سکی — اس کی پکیں دھیرے سے خڑخڑائیں اور آنکھیں ایک

بار پھر بند ہو گئیں — ہمیشہ کے لئے — وہ سو گئی — ابدی نیند — اس کا سفر قحام

ہو گیا — زندگی کا سفر — ایک کہانی تھی — جو ختم ہو گئی — عمر کے

پہلے لمحے سے آخری لمحے تک کی کہانی — ایک افسانہ اپنی تکمیل کو پہنچ گیا —

درد بھرا افسانہ — المیہ افسانہ — ایک داستان تھی — جو ختم

ہو گئی — زندگی کی ناکامیوں کی داستان — شکست پیہم کی داستان —

ایک شمع تھی — دھیرے دھیرے جلتی ہوئی شمع — چپ چاپ سلگتی

ہوئی شمع — جو آخری بار بھڑک کر گل ہو گئی — بجھ گئی —

ہمیشہ کے لئے — یہ تھا انجام — اس معصوم ہستی کا — جس کی تقدیر

نے اسے سوائے حسرت و یاس کے اور کچھ نہ دیا۔۔۔۔۔ جو راستے کا پتھر بنی ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے مرد کے قدموں کی ٹھوکہ کھاتی رہی وہ تو اس قابل تھی کہ اسے ٹوٹ کر چاہا جانا مگر قسمت اس پر مہربان نہیں تھی وہ تو ایسی لڑکی تھی کہ اسے پوچھنے کی حد تک اس سے محبت کی جاتی مگر حالات نے کبھی اس کا ساتھ نہیں دیا۔ زندگی کے لمحات تو وقت، حالات اور قسمت کے محتاج ہوتے ہیں۔ وقت ساتھ دے۔۔۔۔۔ حالات سازگار ہوں اور قسمت مہربان ہو تو زندگی سراپا بہار بن کر رقص کرتی ہے ورنہ وہی زندگی سرتاپا حزان بن جاتی ہے

شمع جل بھی۔۔۔۔۔ ایک گیت تھا۔۔۔۔۔ دردِ دھیرا گیت۔۔۔۔۔ جو ختم ہو گیا۔۔۔۔۔ آوازیں تم گئیں۔۔۔۔۔ صدا میں رک گئیں۔۔۔۔۔ سسکیوں کی صدا میں

۔۔۔۔۔ پراسرار سرسراہٹوں کی آوازیں اور پھر۔۔۔۔۔ گھر کے در و دیوار آہ و فغاں سے لرز اٹھے۔۔۔۔۔ نالہ و فریاد سے آسمان ٹھرا اٹھا۔ زمین کا نپ گئی۔ مگر وہ آہ و فغاں وہ نالہ و فریاد جانے والی ہستی کو دنیا میں واپس نہ لاسکے جو اس دنیا سے گزر گیا وہ پھر لوٹ کر نہ آسکا یہ دیکھنے کے لئے کہ وہ اپنے پیچھے رنج و غم اور دکھ درد کے کیسے انبار چھوڑ کر گیا ہے۔ ہفتہ بھی سب کو روتا سسکتا بھوڑ کر چلی گئی۔۔۔۔۔ رخصت ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی بہار کی وہ آخری شام بھی رخصت ہو گئی یہ کیسی بہار آئی تھی کہ چمن ویرانہ بن کر رہ گیا تھا۔۔۔۔۔ سب کچھ اجڑ کر رہ گیا تھا۔ شام کا افسردہ غبارِ لمحہ بہ لمحہ پھیلتی ہوئی رات کی تیرگی میں تجلیل ہو گیا اور ہوا میں درختوں کے تار پڑتے ہوئے بتوں پہ سر رکھ کر سسک پڑی، چیخ اٹھیں اور فضا غمناک ہو گئی۔

فصل گل آئی اور چلی گئی نگاہیں اسکے تغائب میں جھٹکے لگیں زندگی کی ہر خوشی اور ہر سرت
بانے کمال کھو گئی دلوں کے گلشن اجڑا کر رہ گئے۔ اب نہ پھول تھے۔
نہ شگوفے، نہ وہ کوپلیں تھیں نہ سبزہ دور۔ جو نظر ہم ایک بحر آتیش نظر
آتا تھا۔ اس بحر آتیش میں سب کچھ کھو گیا تھا، سب کچھ گم ہو گیا تھا، فقے مکڑا ایش
ہنسی، مسرت اور خوشی۔ آنسو باقی رہ گئے تھے اور سسکیاں، اب ہمار نہیں
رہی تھیں۔

ہاں بہاروں کے خزاں دیدہ نقوش رہ گئے تھے۔ گم گشتہ بہاروں کا خیال آتے ہی ذہن میں جانے کتنی یادوں کی شمعیں جل اٹھتی تھیں۔ جوئے گمہ کر کے دھندلوں میں سرک گئے وہ ماضی کا نقش بن گئے۔ ایک خواب بن گئے۔

بنفشہ کی جوان موت ایک کرب بن کر دلوں میں سما گئی۔ اس کی یاد اور
کا جلتا صحرا بن کر دل کے دیرانوں سے ہم آغوش ہو گئی۔ سب اس کے بارے میں
سوچتے تھے اور بڑی شدت سے سوچتے تھے۔ لیکن شجر کے دل کا درد سب سے
سوا تھا۔ آنسوؤں کا ایک سمندر تھا جو اس کی آنکھوں میں سمٹ آیا تھا۔ دکھ
کی ایک لہر تھی جو اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی تھی۔ نہ آنسو تھکتے تھے
نہ آہیں رکتی تھیں۔ بہار کی ایک آخری شام وہ تھی جب — بنفشہ نے آیامیلاد
کے ساتھ اس گھر میں قدم رکھا تھا اور — بہار کی ایک آخری شام وہ تھی یہ
— بنفشہ نے چپ چاپ آنکھیں بند کر لی تھیں اور دوسروں کے گاندھوں کا
سہارا لے کر لجنک کا سفر طے کیا تھا۔ یہ دو شا میں تصویر کے نقوش کی مانند ذہن
کے گوشوں سے چٹ گئی تھی۔ تصویر کے یہ نقوش بند آنکھوں سے بھی دیکھے جاسکتے
تھے۔ ان دو یادگار شاموں کا خیال آتے ہی شجر کی گرم گرم بکیوں سے بینہ برسنے
لگتا تھا۔

بنفشہ کی اس بے وقت موت پر ماں بیگم کو دل کا پہلا دورہ پڑا۔ اتنی پریشانی
اور اتنا غم — کہ دماغ ماؤفٹ ہو گئے۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑی ہوئی دای ماں
نے اپنی زندگی اور موت کے درمیانی فاصلے کو اچانک یہ ت کم ہوتے ہوئے
محسوس کیا اور بڑھتی کولیوں محسوس ہوا جیسے پک بچکتے ہیں انہوں نے وقت کے
ایک طویل فاصلے کو طے کر لیا ہو۔ کہاں تو بہار کھڑی مسرتی تھی اور کہاں خزاں کی
گھڑیاں گئے دنوں کے جال کے افسانے کو دھرائی تھیں۔ خزاں کی زرد، پیار شام
کی مدہم دھوپ میں نہائے ہوئے برگ خشک ہوا کی سسکیوں کے ساتھ ہم آہنگ

ہو کر بیٹی ہوئی بہار کا دکھ بھرا راگ الاپتے تھے۔ بھگتی ہوئی شام کی بے جان بیسکی
مسکراہٹیں ماحول کو ایک بے نام دکھ سے آتش نہ کرتی تھیں۔ درختوں کی سوکھی ہوئی
شاخیں اپنی بائیں پھیلائے ایک تصویر بنے کسی بنی آسمان کی دھنوں کو ٹکنتی تھیں۔
دکھ کے وہ لمحے — جب بنفشہ اس گھر سے رخصت ہوئی تھی، گزر گئے تھے
مگر — ان لمحوں کی یاد ایک ٹھٹھاپ، ایک کنگ بن کر آج بھی دلوں میں موجود
تھی۔ شجر کے کانوں میں آج بھی ان جیخوں کی بازگشت سنائی دیتی تھی جو بنفشہ کی
آنکھیں بند ہوتے ہی گھر کے در و دیوار سے کمرائی تھیں — ”بنفشہ بیٹی! اس
بڑھاپے میں اپنی دای کے دل کو اتنا بڑا صدمہ نہ پہنچاؤ۔“

”یہ وقت تو میرے قبر میں اتارنے کا تھا تم کیوں چل دیں؟“

دای ماں نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے اس کا چہرہ غما کر کر کہا تھا۔

”بنفشہ بیٹی! اس طرح رووٹھ کر نہ جاؤ۔ میرا کمر درد یہ دکھ برداشت نہیں
کر سکے گا۔“ ماں بیگم یہ جملہ کہتے کہتے چکر کر تشکیل بھیا کے بازوؤں میں جھول کر رہ
گئیں۔ بڑی ماں کی بچکیاں، چھوٹی چچی کی سسکیاں، بین بیباں اور نشوونما کی چیخ
پکار، ”بڑیا“ ابامیاں اور چچا جان کی خاموش افسردہ نگاہیں، جنبط کی کوشش
میں چہروں کے بدستے رنگ اور — بڑھتی آنکھوں میں کانپتے رزرتے
ہوئے دکھ کے ساتے — یہ سب کچھ ایسا نہیں تھا۔ جسے ذہن فراموش کر
دیتا۔ گزرتے ہوئے وقت کے دھندلے بھی ان یادوں کو مدہم نہ کر سکے۔

اور پھر — رنج و غم کی اس تصویر پر لمحات کی گہرا بھی اپنی ایک تنہ
بھی نہ جمانے پائی تھی کہ — خزاں کی ایک سوگوار ڈوبتی ہوئی شام کو سجا دھائی

اچانک، بالکل اچانک آگئے۔ نہ کوئی اطلاع نہ خبر دیکھنے والوں نے انہیں دیکھا لیکن انہیں اپنی نگاہوں پر اعتبار نہ آیا، سجاد بھائی کو دیکھتے ہی اماں بیگم کو پھلکی تمام باتیں یاد آگئیں۔ سجاد بھائی نے ان کے گلے میں ہاتھیں ڈالیں تو اماں بیگم نے کہا۔

”سجاد! میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی“ یہ کہتے ہوئے ان کی آواز کانپ گئی۔ ان کے دل کا عجب عالم تھا۔ ایک طرف غیض و غضب کے جذبات تھے۔ جو انہیں مجبور کر رہے تھے کہ بیٹے کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں اور دوسری طرف ممتا کے جذبات تھے جو بیکار پرکار کر رہے تھے۔ سب کچھ بھول جاؤ سب کچھ بھلا دو۔ اپنے بیٹے کو۔ اس بیٹے کو جو تمہیں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ جس کے دید کو تمہاری آنکھیں ایک دم سے ترس رہی تھیں۔ سینے سے لگا لو، دل میں چھپا لو آنکھوں میں جگہ دے دو، بنفسطہ کی صورت لگا ہوں میں پھرتی تھی تو دل میں ایک ٹہنی سی اٹھتی تھی۔ دل سے آواز آتی تھی۔ ممتا پر ہی بیٹا اس کی برباد زندگی کا باعث ہے۔ مگر دماغ کتا تھا۔ نہیں۔ یہ بھوٹ ہے بنفسطہ تو تقدیر کے ہاتھوں کا کھلونا تھی، حالات کی ستم فریبیوں کا شکار تھی قصور سجاد کا نہیں، قصور کسی کا بھی نہیں اس کی قسمت ہی اس پر مہربان نہیں تھی اور جب تقدیر امتحان لینے پر اتر آئے حالات ساتھ نہ دیں، قسمت نامہربان ہو تو زندگی اسی طرح المیہ بن کر سامنے آتی ہے لے گزر رہے تھے۔ سجاد بھائی، اماں بیگم کے تئیلوں پر دونوں ہاتھ رکھے، ان کی طرف دیکھ رہے تھے کتنی حسرت تھی ان کی نگاہوں میں؟ اور دکھوں کے کتنے گہرے سمنہ جھانک رہے تھے ان کی افسردہ نگاہوں سے؟

اماں بیگم کی نگاہیں نیچی تھیں پلکیں تھرا رہی تھیں، ہونٹوں کے گوشے کانپ رہے تھے، آنکھوں کے کنارے آنسوؤں کی نئی سے بھگتے جا رہے تھے اور ضبط کی کوشش میں ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ سب اماں بیگم کو سمجھا رہے تھے، کبھی دادی اماں کی آواز کرے کے پر سکوت ماحول میں گونجتی تھی، کبھی ابا میاں کی، کبھی بڑا کی آواز دیواروں سے ٹکراتی تھی کبھی بڑی اماں کی۔ سب یہی کہہ رہے تھے۔ اسے معاف کر دو زینیا! بیٹے کو سینے سے لگا لو، اس کا جرم ناقابل معافی تو نہیں۔

پھر ممتا کے جذبات دل کے ہر جذبے پر غالب آگئے۔ اماں بیگم نے ایک نگاہ۔ بس صرف، ایک نگاہ سجاد بھائی پر ڈالی، اپنی دونوں ہاتھیں پھیلا کر انہیں سینے سے لگا با اور پھوٹ، پھوٹ کر رو دیں۔ سجاد بھائی کا دل بھی چیخ چیخ کر رونے کو چاہا لیکن وہ مرد تھے اور ان میں بے پناہ قوت برداشت تھی، وہ چیخ چیخ کر تو نہیں روئے لیکن اپنی آنکھوں میں چراغوں کو جھلکانے سے باز رکھ سکے۔

”سجاد! تم میری اتنی سعادت مند اولاد! تم نے میری توقع کے خلاف ایسا کام کیل کیا سوچ کر تم نے میرے دل کو یہ دکھ پہنچایا؟ اپنی پسند، اپنی خواہش پر تم نے اس سے منگنی کی اور پھر.....“

اماں بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

”میں مجبور تھا اماں بیگم! بہت مجبور!“ سجاد بھائی نے کہا۔

”کیا مجبور ہی تھی؟“ اماں بیگم نے پوچھا۔

”میں نے اسے زندگی کی ستر میں اور خوشیاں دینے کے لئے اپنا چاہا تھا۔

اس پر بوجھ پینے کے لئے نہیں“ سجاد بھائی نے کہا۔

سب کی سوا لبہ لگا ہیں سجاد بھائی پڑھی ہوئی تھیں۔

سجاد بھائی نے اپنی تپوں کا پانچا اوپر سر کر اپنی ٹانگ اماں بیگم کے سامنے کمر دی۔

”یہ دیکھئے امیری مصنوعی ٹانگ! اب اتنے سالوں میں اس قابل ہو سکا ہوں کہ.....“

سجاد بھائی کی بات پوری نہ ہو سکی۔ اماں بیگم انہیں پھر گلے سے لگا کر سک پٹیں سب کی حیرت زدہ آوازیں ایک ہلکی سی چیخ بن کر کمرے کے در و دیوار سے ٹکر گئی۔

”سجاد! میرے بیٹے! تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟ مجھ سے کیوں چھپایا؟“ اماں بیگم کا گلا فرط غم سے زرد ہو گیا۔

ابامیاں سجاد بھائی کے کاڈے پر اپنا شفقت بھرا ہاتھ رکھے رنج و غم اور صبر و ضبط کی تصویر بنے کھڑے تھے۔

”میں اگر اس وقت سب کچھ صاف صاف بتا دیتا تو بنفشہ کسی قیمت پر بھی میرا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوتی، ہر دکھ، ہر تکلیف اپنی جان پر جھیل جانا اس کی فطرت ہے۔“ سجاد بھائی نے کہا۔

سب خاموش، چپ چاپ، سجاد بھائی کی طرف دیکھتے رہے۔

”میں بنفشہ کو اپنے گھر میں خوش اور آباد دیکھنا چاہتا تھا۔ یہی سوچ کہ میں نے یہ قدم اٹھایا۔“ سجاد بھائی نے کہا۔

”اگر بنفشہ اسے میرا حرم سمجھے تو جو چاہے مجھے سزا دے، میں بخوشی سزا قبول کرنے کو تیار ہوں۔ وہ کہاں ہے؟ میں اس سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔“ سجاد

بھائی نے کہا۔

اور جب سجاد بھائی کو حقیقت حال کا علم ہوا تو ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا اچھا گیا۔ اماں بیگم کے شانوں پر ان کے ہاتھ کانپ کر رہ گئے۔ ان کا چہرہ سفید ہو گیا۔ کئی منٹ تک سجاد بھائی کی یہی کیفیت رہی۔ بڑی اماں نے آگے بڑھ کر انہیں پانی پلایا تو ان کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ لیکن وہ اپنے چہرے کی سوگوارمی کو پھر بھی نہ چھپا سکے۔

سجاد بھائی کے آنے کے کئی روز بعد — جب ایک خزاں زدہ دوپٹی ہوئی شام کے اداس ماحول میں وہ اور شجر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ گزری ہوئی باتیں — اور کچھ گزرے ہوئے لمحوں کو یاد کر رہے تھے تو شجر نے کہا۔

”سجاد بھائی! آپ نے اگر اس وقت ہمیں صحیح صورت حال سے باخبر کر دیا ہوتا تو آج صورت حال کس قدر مختلف ہوتی؟“

”شجر رانی! میں یہ کیسے برداشت کر سکتا تھا کہ وہ معصوم لڑکی — جس نے پورے خلوص اور اعتماد کے ساتھ میری محبت پر یقین کیا تھا اسے زندگی بھر کی تکلیف میں مبتلا کر دیتا۔“ سجاد بھائی نے کہا۔

”آپ جس بات کو اس کے لئے بوجھ اور تکلیف سمجھتے تھے، کیا خبر وہ ان کے لئے مسرت اور خوشی کی بات ہوتی،“ شجر نے کہا۔

”ہوں،“ سجاد بھائی نے ایک طویل سانس لی اور بڑی گہری سوجھ میں ڈوب کر کہا۔

”بہر حال! شجر رانی! اب تو سب کچھ ختم ہو گیا — وقت گزر گیا۔ وقت

کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

”ہاں سجاد بھائی! وقت بے شک گزر گیا لیکن یادیں تو باقی ہیں، کچھ بھی تو نہیں بھلا یا جاتا کہ کس بات کا ذکر کروں؟“
شجوعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

سجاد بھائی کا چہرہ دکھ اور کرب کے احساس سے سرخ ہو گیا۔

”ہیں تو شاید اپنی زندگی کے آخری لمحوں تک ان دو شاموں کو نہیں بھول سکتی“
شجوعہ نے کہا۔

سجاد بھائی اس کے جملے کا مطلب سمجھ کر بھی اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

”نہ بہار کی اس شام کو — جب بنفشہ باجی یہاں آئی تھیں اور نہ بہار کی وہ آخری شام — جب بنفشہ باجی.....“ شجوعہ نے اپنا جملہ پورا کئے بغیر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور رو پڑی۔

سجاد بھائی کی زبان سے تسلی کا کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ وہ شجوعہ کو کیا سمجھاتے؟ کیا تسلی دیتے؟ ان کے دل کا درد تو شجوعہ کے درد سے بھی سوا تھا۔ بنفشہ سے محبت شجوعہ نے بھی کی تھی اور سجاد بھائی نے بھی۔ لیکن محبت کے انداز جدا تھے اور دونوں کے احساسات بھی جدا جدا۔ سجاد بھائی اپنے شکستِ دل کا ماتم کر رہے تھے اور سرج رہے تھے۔

”ان بہاروں کا ذکر کیوں کرتی ہو شجوعہ! ان بھری بہاروں میں تو سب کچھ لٹ گیا۔ یہ کیسی فصل گل آئی تھی میرے دل کا گلشن اجڑ کر رہ گیا۔“

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے خاموش — چپ چاپ! خزاں
رسیدہ شام کے سائے گرے ہوتے رہے۔

اور — — — بہت دنوں بعد — — — جب ایک دوپہر کو شجوعہ رانی اپنے دور کا
سفر پر روانہ ہونے کے لئے اپنی بکھری ہوئی چیزوں کو سیٹ رہی تھیں تو درتپے کے
قریب — — — رائٹنگ ٹیبل پر سے اپنی چند کتابیں اٹھاتے ہوئے ان کی نگاہیں باہر
کی طرف بھٹک گئیں۔ ”بڑھپیا“ اپنے کمرے کی اس کھڑکی میں — — — جولان کی طرف
کھلتی تھی۔ چپ چاپ کھڑے تھے — — — اداس — — — سوگوار — — —! ان کا تھکا
تھکا سا سنو لایا ہوا چہرہ اندر بھی بھی سنی نگاہیں دیکھ کر شجوعہ رانی کے دل میں درد کی
ایک لہری اٹھی وہ کتابوں پر دونوں ہاتھ رکھے بڑی گہری سوچوں میں ڈوب گئیں۔
دوپہر ڈھل کر شام آئی اور پھر ڈوبتی ہوئی شام بھی رات کی تیرہ فٹو راتوں
میں سما گئی۔ آسمان کی دستخون پروا اُنکی تاریخوں کا چاند نمودار ہوا اور ہوا اور خٹوں کے
درمیان سے گزرتے ہوئے — — — سسکیاں بھرنے لگی۔ شجوعہ رات کا کھانا کھا کر
اپنے کمرے میں آئی۔ تو درتپے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا —
بڑھپیا پھر اسی درتپے میں جھکے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ میں سگٹے ہوئے سگریٹ کا
نٹھاسا شعلہ لاں کی تاریکی میں چمک رہا تھا۔ شجوعہ آہستہ قدموں سے باہر برآمد
میں نکل آئی اور اس کے قدم بڑھپیا کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سجاد بھائی اپنے
کمرے کی خاموش تنہائیوں میں بیٹھے تہم سروں میں ریکارڈ سن رہے تھے۔ شجوعہ
قدم ٹھٹھک کر رہ گئے مگر پھر وہ آگے بڑھ گئی۔

بڑھپیا کے کمرے میں داخل ہو کر شجوعہ نے انہیں پکارا تو وہ چونک گئے۔

ان کی انگلیوں میں دبا ہوا سگریٹ کانپ کر رہ گیا۔ انہوں نے پلٹ کر دیکھا اور بولے۔

”آؤ شجوا!“

شجوا صوفے پر بیٹھ گئی تو بڑ بھتیجا بھی اس کے سامنے بیٹھ گئے۔

چند سیکنڈ تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ پھر بڑ بھتیجا نے کہا۔

”ہاں! تو تم جارہی ہو شجوا!“

”جی! بڑ بھتیجا!“ شجوا نے کہا۔

”چار پانچ سال سے پہلے تو راپس نہیں آؤ گی!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”ہاں! لیکن پینچ تو یہ ہے کہ میرا دل راپس آنے کو نہیں چاہتا!“ شجوا نے کہا۔

”ایسی بات مت سوچو شجوا! اس گھر میں اب دیکھو ہی سوائے ویرانی کے

اور کچھ نہیں رہا!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”ایک بات کون بڑ بھتیجا!“ شجوا نے کہا۔

”ہاں! کور!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”آپ شادی کر لیجئے!“ شجوا نے کہا۔

”شادی!“ بڑ بھتیجا نے کہا اور چپ ہو گئے۔

”جی ہاں! بڑی اماں بے چاری....“ شجوا نے کہا۔

”شجوا! شادی تو میں کر چکا۔“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”شادی کر چکے!!؟“ شجوا نے حیرت و استعجاب سے ان کی طرف

دیکھا۔

”ہاں؟“ بڑ بھتیجا کا سر جھک گیا۔

”کب؟ کہاں؟“ شجوا نے پوچھا۔

”کئی سال ہوئے!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”تو کس سے؟“ شجوا کی حیرت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

”ایک ایسی لڑکی سے۔۔۔ جسے کوئی اپنانے کے لئے تیار نہیں تھا!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”بڑ بھتیجا! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کی بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی!“

شجوا حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی تھی۔

”شجوا! یہ ایک لمبی کہانی ہے جسے تفصیل سے دھرانے کو میرا بالکل دل نہیں

چاہتا!“ بڑ بھتیجا نے کہا۔

”مگر بڑ بھتیجا! پھر بھی۔۔۔ کچھ تو بتائیے!“ شجوا نے کہا۔

”بس! بدلیں سمجھ لو کہ میرے ہی ہم جنسوں کے ہاتھوں برباد کی ہوئی ایک لڑکی

۔۔۔ جسے اگر میں سہارا نہ دیتا تو وہ کوٹھے کی زینت بن جاتی!“ بڑ بھتیجا کا سر کچھ اُرد

جھک گیا۔

شجوا قدر حیرت بنی انہیں نکلتی رہ گئی۔ کئی لمحے اس حیرت زدہ سی خاموشی

کی نذر ہو گئے۔ پھر شجوا نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”آپ نے بڑی اماں کو بھی نہیں بتایا۔ کسی کو نہیں بتایا۔۔۔ اسے گھر

بھی نہیں لائے۔“

”میں اپنی ماں کی فطرت سے بڑی اچھی طرح واقف ہوں شجوا! اس گھر میں اسے

کبھی صبح اور جائز مقام نہ ملتا وہ — جس نے کبھی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ اُسے اس گھر میں لاکر مزید غموں سے ہنگامہ کرنے کی ہمت بچھڑ میں بالکل نہیں تھی، بڑھتی

بٹھو سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگی پھر چند سیکنڈ بعد بولی۔

”آپ کو اس سے محبت بھی تھی؟“

”محبت؟“ بڑھتی نے سراخا کر شجوک کی طرف دیکھا اور بڑے جروح انداز میں مسکرائے اور بولے۔

”مجھے اس سے محبت نہیں تھی۔ شجوکا وہ تو وقت اور حالات کا تقاضا تھا، میرے ضمیر کی پکار تھی اور دماغ کا مشورہ تھا۔“

دو تین لمحوں تک شجوک بچہ سوچتی رہی پھر کچھ کہنے کے لئے اس کے لب ہلے۔

مگر جانے کیا سوچ کر رہ گئی۔

بڑھتی — جو اس کی طرف دیکھ رہے تھے سگریٹ کو اینٹ رٹے میں بجھاتے ہوئے بولے۔

”تم کچھ کہنے والی نہیں۔ رک کیوں گئیں؟“

”بڑھتی جانے کیوں؟ اکثر مجھے یہ خیال آتا ہے کہ آپ کو بنفسفہ باجی سے محبت تھی۔“ شجوک نے کہا۔

صوفے کی پشت پر رکھا ہوا بڑھتی کا ماتھ کانپ کر رہ گیا۔ دل بڑی زور سے

دھڑک اٹھا اور لگا ہیں شجوک کے چہرے پر جو کمرہ گئیں۔

”میرا خیال غلط تو نہیں؟“ شجوک نے پوچھا۔

بڑھتی اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے بستر سے سگریٹ کا پیکیٹ اٹھا کر بڑی آہستگی سے سگریٹ نکالا اور لائٹر جلاتے ہوئے ایک لمبے کے لئے شجوک کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ اپنی بات کا جواب سننے کی منتظر تھی اور بڑھتی اپنے بستر کے پاس سے ہٹ کر درپے میں خاموش کھڑے تھے۔

شجوک نے جب دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو بڑھتی نے بڑی آہستگی سے شجوک سے نگاہیں ملائے بغیر کہا۔

”ہاں شجوک محبت — میں نے صرف بنفسفہ سے کی ہے۔“

شجوک نے ایک طویل سانس لے کر بے حد تھکے تھکے سے انداز میں صوفے کی پشت سے سرٹکا دیا۔

”مگر چھوڑو، اب ان باتوں کو نہ دہراؤ، وقت گزر گیا — کمانی ختم ہو گئی۔“

بڑھتی نے کہا۔

ان کے لیے کی انفرادی پر شجوکا دل دکھ سے بھر رہا ہو گیا۔

اس نے پلکوں کو جھپکاتے ہوئے بڑھتی کی طرف دیکھا ان کے چہرے پر ڈوبتی

ہوئی خراں رسیدہ شام کی سی انفرادی تھی۔

”بنفسفہ باجی چاہے جانے کے قابل تھیں بڑھتی! ایجاد بھائی نے انہیں چاہا —

آپ نے ان سے محبت کی اور — اور عباس بھائی ان کی محبت اور انہیں

پالینے کی قضا کو دل میں پیسائے جرمی میں جا بیٹھے“ شجوک نے کہا۔

”عباس!!“ بڑھتی نے حیرت سے کہا۔

”ہاں اڑ بھیا! بعض لوگ بہت گھر سے ہوتے ہیں جیسے آپ۔ جیسے عباس بھائی!“
 شجور کی آواز مدغم تھی۔

”جاس نے کبھی تم سے کچھ کہا؟“ بڑ بھیا نے پوچھا۔

”نہیں! اپنے جذبات کو دل کی گہرائیوں میں چھپانے والے اپنی زبان سے کبھی کچھ نہیں کہتے اور اپنے انداز سے بھی کچھ ظاہر نہیں کرتے“ شجور نے کہا۔

”تو پھر؟“ بڑ بھیا نے پوچھا۔

”بس! یونہی ایک دفعہ ان کی کتابیں اٹھٹے پٹھتے ہوئے میری نظر سے ان کی تخریر گزر گئی، شجور نے کہا۔

”جاس کی کوئی ڈائری؟“ بڑ بھیا نے پوچھا۔

”نہیں! ڈائری تو نہیں کہہ سکتے، خیر جھٹھیے! اب ان باتوں کا ذکر لاحقہ ہے“
 شجور نے کہا۔

”بڑی عجیب بات ہے“ بڑ بھیا نے زیر لب کہا۔

شجور نے کچھ نہیں کہا۔ سر جھکا کر جانے کیا سوچنے لگی۔ کئی لمحے کمرے کی نمودری خاموشی سے ٹکرا کر آگے بڑھ گئے پھر بڑ بھیا نے ایک طویل اور گہری سانس لے کر شجور کی طرف دیکھا اور بولے۔

”تم کیا سوچتے لگیں شجور؟“

شجور نے اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا اور قدرے مدغم آواز میں کہا۔

”میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ بھیا! کہ نقشہ باجی کو خوش قسمت سمجھوں یا بد قسمت؟“

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا“ بڑ بھیا نے کہا۔

”اب دیکھئے نا! نقشہ باجی اس دنیا سے نہ رخصت ہو گئیں۔ یہ جانے بغیر کہ سجاد بھائی کے دل میں سوائے ان کے اور کوئی نہیں تھا اور وہ یہ جاننے کے لئے اس دنیا میں کبھی واپس نہیں آئیں گی کہ دل کے دو درد مندوں میں بھی صرف انہی کے لئے جگہ ہے“
 شجور نے کہا۔

بڑ بھیا چپ چاپ کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”مگر میں سوچتی ہوں کہ اس دنیا میں جانے کتنے لوگ ایسے ہوں گے جو کسی کو چاہنے کے باوجود اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتے ہوں گے“ شجور کی آواز میں ہلکی سی نرزش تھی۔

”ہاں! یہ تو سچ ہے“ بڑ بھیا نے کہا۔

”یہ جذبہ محبت بڑی عجیب شے ہے۔ بہت عجیب۔“ شجور نے بڑی مدغم آواز سے کہا۔ اس کی آنکھوں کے کنارے ہیک گئے۔

اپنی شبیہی آنکھوں کو بڑ بھیا کی نگاہوں سے بچانے کی خاطر وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کی طرف دیکھے بغیر کمرے سے نکل گئی بڑ بھیا در تپتے میں کھڑے اسے کمرے سے جاتے ہوئے دیکھتے رہے انہوں نے اسے آواز نہیں دی۔ اسے نہیں روکا وہ تو اپنے دل کی دھڑکنوں کے ساز پر گزر رہے ہوئے وقت کا المیہ راگ سن رہے تھے۔

شجور باہر رآمد سے میں آئی تو سجاد بھائی کے کمرے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے دل میں ایک ٹپیس سی اٹھی وہ دو قدم آگے بڑھ کر پھر پیچھے موٹ آئی اس

نے بڑی آہستگی سے کمرے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ سجاد بھائی صوفے کی پشت سے مڑکائے آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے ہی میز پر پیپ ریکارڈ بچ رہا تھا۔ بہت مدہم مڑوں میں دکھ کے دن اب بیت نہیں۔

کمرے کا پر سکوت المٹا ماحول، دھوکے گمراہوں میں ڈوبا ہوا اس نغمہ۔ ایسا نغمہ۔ جو دل کے نازک تاروں کو توڑ کر دکھ دے اور۔۔۔ سجاد بھائی کے چہرے پہ کانپتے، لرزتے ہوئے دکھ کے سائے۔ یہ سب کچھ کس قدر تکلیف دہ تھا۔ کتنا تکلیف دہ؟ شجر سے بہر داشت نہ ہو سکا۔ وہ پردہ چھوڑ کر مٹ گئی۔ اس کے تھکے ہارے بوجھل قدم اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ اس کے کمرے میں اس کا سامان بندھا رکھا تھا مابھی کتنی ہی چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔ جنہیں سمیٹنے کو اس کا دل بالکل نہیں چاہا۔ اپنے کمرے کی دیرانی دیکھ کر اس کی آنکھیں ایک بار پھر پھلکا گئیں۔ اس نے بڑی بے دردی سے اپنی آنکھوں کو اپنی سے رگڑ ڈالا، درجے کی چوڑھٹ پر دونوں کنڈیاں ٹکاکر باہر کی طرف جھک گئی اور اس رات کے بوجھل قدموں کی چاپ مٹتے ہوئے اسے اپنے دل کے خاموش ایوان کے ستاروں اور دیرانی کا احساس بڑی شدت سے ہوا۔ یہ کیسے دکھ بھرے لمحات تھے اور کتنا سوگوار ماحول تھا کوئی ترمیم نہیں تھا۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔

غراں رسیدہ پودوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی ہوا سسکیاں بھر رہی تھی اور پیرا کاش اور نیچے دھرتی بیتے ہوئے رت پر ماتم کناں تھے۔ اوائل تاجیخوں کا زور بیمار اور قدیم سا پائندہ آہستہ آہستہ مرک کر بلند ہو گیا تھا۔ اور جان کے

درخت سے پرے سما ہوا سانچے تک رہا تھا۔ ٹھٹھاتے ہوئے تاروں کا خاموش کارواں آگے بڑھ رہا تھا۔۔۔ آہستگی سے۔۔۔ بے حد آہستگی سے۔ چمپا کی سوکھی ہوئی برسہہ شاخیں ہاتھ پھیلائے جانے لگیں۔ کیا سوچ رہی تھیں۔ آسمان سے زمین تک ایک افسردہ سا غبار اڑ رہا تھا۔ برگ خشک سوکھی ہوئی گھاس پر بکھرے پڑے تھے۔ انجانی سمت سے آتی ہوئی خزاں کی آواز براہیں ادھر سے گزریں تو پتے دھڑ سے کراہ اٹھے شجر کو یہ درد، یہ موزا اپنے دل کی گمراہیوں میں اترا ہوا غسوس ہوا۔ اس نے سوچا۔

”میں اب اس گھر کو چھوڑ کر سات سمندر پار چلی جاؤں گی۔“

کچھ نہیں معلوم کب واپس آؤں گی اور یہ بھی نہیں جانتی کہ جب واپس آؤں گی تو یہاں کا ماحول۔۔۔ یہاں کے حالات کس قدر مختلف ہوں گے؟ کتنی بہاریں بیت جائیں گی اور کتنی خزاںیں۔۔۔ آتی جاتی رُتوں کے کتنے کارواں گزر جائیں گے مگر میں جانتی ہوں میرے دل کا درد کبھی کم نہیں ہوگا۔ میرا زخم سدا ہر اسے کا کیونکہ۔۔۔ کیونکہ ایسا کوئی نہیں جیسے میں اپنا عمرزد و غمگسار بنا سکوں۔۔۔ کس سے کون کس میرے دل نے بھی کسی کو چاہا۔ جسے چاہا اسے اپنا نہیں سکی اور کبھی اپنا بھی نہیں سکتی۔

عباس بھائی! اگر آپ نے بغفشتہ حاجی کو یوں ٹوٹ کر چاہا تھا تو کسی سے نہ ہسی بھ سے تو کہتے یا پھر۔۔۔ کاش! آپ کی وہ تحریر۔۔۔ دل کے جذلوں کا وہ اظہار وقت بیت جانے کے بعد میری نظر سے نہ گزرتا تو میں ساری دنیا سے ملکہ جاتی لیکن بغفشتہ حاجی کو آپ کا بنا کہ ہی دم لیتی۔ وجاہت مزار کے جنم میں انہیں نہ جانے دیتی۔

آپ نے مجھ سے بھی نہیں کہا۔۔۔ کیا آپ کو یہ اندیشہ تھا کہ میں بنفسہ باجی کی رقیب بن جاؤں گی۔ نہیں۔۔۔ مگر آپ کو یہ اندیشہ کیسے ہو سکتا ہے؟ آپ کو تو میرے جذبہ دل کی خبر ہی نہیں۔ میرا ہمارا تو سوائے میرے دل کی دھڑکنوں کے اور کوئی بھی نہیں۔ یہ دل کے جذبے ہیں۔۔۔ دل کی باتیں ہیں اور دل کا درد ہے۔۔۔ کسی اور کو اس کی خبر کیوں ہو؟ کوئی کیا جانے؟ اس درد پر کتنی لذت ہے۔ ان اشکوں میں کتنا حسن ہے جو کسی کی یاد میں یوں۔۔۔ چہ چاپ بے جاتے ہیں اور ان یادوں میں کتنی رعنائی ہے؟ عباس بھائی! بنفسہ باجی! میں کسے یاد رکھوں؟ کسے بھول جاؤں؟

بٹخو کی آنکھوں کے کنارے ایک بار پھر بھیگی، آنسو کناروں تک آئے اور چپ چاپ بہنے لگے۔ بڑھتی کے کمرے میں لائٹ کا شعلہ بلند ہوا۔۔۔ ایک اور سنگرٹ سگکا اور سجاد بھائی کے کمرے میں ٹیپ ریکارڈ کی آواز بلند ہوئی۔
دکھ کے دن اب بیت نا ہیں
دکھ کے دن اب
.....